آزادی کے بعد دہلی میں

اُردو انشائیہ

آزادی کے بعد دہلی میں

اُردو انشائیہ

مرتبہ

پروفیسر نصیر احمد خاں

اُردو اکادمی دہلی

سلسلہ مطبوعات اردو اکادمی دہلی نمبر ۵۳

AZADI KE BAD DILLI MEIN
URDU INSHAIYA

Edited by
Prof. Naseer Ahmed Khan
Pub.by
URDU ACADEMY, DELHI
Prints
1991, 1993, 2003
Rs.60.00

ضابطہ

سنین اشاعت
۱۹۹۱، ۱۹۹۳، ۲۰۰۳ء

ساٹھ روپے

اے۔آر۔انٹرپرائزز، کوچہ چیلان، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
اردو اکادمی، دہلی۔ ۵۔شام ناتھ مارگ، دہلی ۱۱۰۰۵۴

ISBN: 81-7121-066-X

فہرست

تیسرا منظر: آزادی کے بعد دہلی میں اُردو انشائیہ (دہلی والے)

چوتھا منظر: آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد دہلی میں اُردو انشائیہ

پانچواں منظر: آزادی کے بعد دہلی میں اُردو انشائیہ

حرفِ آغاز

دلّی ہمیشہ ہندوستان کے دل کی دھڑکنوں کا محور و مرکز رہی ہے۔ اسی لیے عالم میں انتخاب اس شہرِ بے نظیر کی تاریخ و تہذیب، علم و فن اور زبان و ادب کو پورے ملک کی نمائندگی کا شرف حاصل ہے۔ آزاد ہندوستان کی یہ تاریخی راجدھانی بجا طور پر اردو زبان و ادب کی راجدھانی بھی کہی جا سکتی ہے۔ اسی کے گرد و نواح میں کھڑی بولی کے بطن سے زبانِ دہلوی یا اردو نے جنم لیا جو اپنی دھرتی کی سیاسی، سماجی، تہذیبی اور معاشرتی ضرورتوں کے زیرِ سایہ نشو و نما پا کر اس عظیم تہذیب کی ترجمان بن گئی جسے ہم گنگا جمنی تہذیب کا نام دیتے ہیں اور جو ہماری زندہ و تابندہ تاریخی وراثت ہے۔

دلّی کے ساتھ اردو زبان اور اردو ثقافت کے اسی قدیم اور اٹوٹ رشتے کے پیشِ نظر ۱۹۸۱ء میں دہلی اردو اکادمی کا قیام عمل میں آیا اور ایک چھوٹے سے دفتر سے اکادمی نے اپنی سرگرمیوں کا آغاز کیا۔ آج دہلی اردو اکادمی کا شمار اردو کے فعال ترین اداروں میں ہوتا ہے۔ اردو زبان و ادب اور اردو ثقافت کو فروغ دینے کے لیے اکادمی مسلسل جو کوششیں کر رہی ہے، انھیں نہ صرف دہلی بلکہ پورے ملک نیز بیرونی ممالک کے اردو حلقوں میں بھی کافی سراہا گیا ہے۔

اکادمی کے دستور العمل کی رو سے دہلی کے لیفٹیننٹ گورنر پہلے اکادمی کے چیئرمین ہوتے تھے، دہلی میں منتخب حکومت کے قیام کے بعد اکادمی کے چیئرمین دہلی کے وزیرِ اعلیٰ ہو گئے ہیں جو دو سال کے لیے اکادمی کے اراکین کو نامزد کرتے ہیں۔ اراکین کا انتخاب دہلی کے ممتاز ادیبوں، شاعروں، صحافیوں اور اساتذہ میں سے کیا جاتا ہے جن کے مشوروں کی روشنی میں چیئرمین کی منظوری سے اکادمی مختلف کاموں کے منصوبے بناتی اور انھیں رو بہ عمل لاتی ہے۔ اکادمی اپنی سرگرمیوں میں دہلی اور بیرونِ دہلی کے دیگر اردو

اداروں سے بھی باہمی مشورت اور تعاون قائم رکھتی ہے۔

اردو اکادمی، دہلی اپنی جن گوناگوں سرگرمیوں کی وجہ سے پورے ملک میں اپنی واضح پہچان قائم کر چکی ہے، ان میں ایک اہم سرگرمی اکادمی کی طرف سے ایک معیاری ادبی رسالے ماہنامہ ''ایوانِ اردو'' اور ''بچوں کا ماہنامہ امنگ'' کی اشاعت کے ساتھ ساتھ اعلیٰ معیار کی علمی اور ادبی کتابوں کی اشاعت بھی ہے۔

اکادمی نے نہایت اہم موضوعات پر اچھی کتابوں کی اشاعت کا منصوبہ بنایا ہے۔ آزادی کے بعد دہلی میں مختلف اصناف سخن کے موضوع پر کتابیں مرتب کرائی گئی ہیں، ان میں ''آزادی کے بعد دہلی میں اردو انشائیہ'' کے لیے پروفیسر نصیر احمد خاں صاحب کو زحمت دی گئی۔ آپ نے مطبوعہ کتب سے انشائیوں کو اکٹھا کیا اور ایک جامع مقدمہ میں اس صنف پر بھرپور روشنی ڈالی۔ اس کے لیے ہم موصوف کے شکر گزار ہیں اور اس تعاون کے بھی جو اشاعتی کمیٹی کے ارکان کی طرف سے ہمیں میسر آتا ہے اور ہمارے لیے روشنی و رہنمائی کا باعث بنتا ہے۔ اس کے علاوہ دہلی کی تاریخ و ادبیات سے متعلق کچھ ایسی کتابیں شائع کی گئیں ہیں، جو کمیاب بلکہ نایاب ہو چکی تھیں۔ ایسی مزید کچھ کتابیں ترتیب و اشاعت کے مراحل سے گزر رہی ہیں۔ اس کتاب کی اہمیت اور افادیت اس بات سے ظاہر ہے کہ اس کا تیسرا ایڈیشن شائع کیا جا رہا ہے۔

ہم اردو اکادمی دہلی کی چیئرپرسن محترمہ شیلا دکشت کے ممنون ہیں جن کی سرپرستی اکادمی کی کارکردگی میں معاون ہوتی ہے۔ اکادمی کے دیگر ممبران کے سرگرم تعاون اور مفید مشورے ہمارے لیے رہنمائی کا کام کرتے ہیں جس کا اعتراف ضروری ہے۔

ہمیں یقین ہے کہ زیرِ نظر کتاب وقت کی ایک اہم ضرورت پوری کرنے کے ساتھ ساتھ ادبی حلقوں میں پسند کی جاتی رہے گی۔

مرغوب حیدر عابدی
سکریٹری

اُردو انشائیے کا منظر نامہ

بیکن انشائیہ کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ نثری اصناف میں انشائیہ ایک ایسی مختصر تحریر کا نام ہے جس میں بغیر کسی تجسس اور کھوج کے حقیقت کا اظہار ہو۔ مونتین شخصیت کے اظہار کو انشائیہ کا اہم جزو قرار دیتا ہے۔ جانسن کے خیال میں انشائیہ ذہن کی ایک ترنگ ہے۔ انشائیہ کے بارے میں ایک رائے یہ بھی ہے کہ انشائیہ ہماری سماجی زندگی کے کسی موضوع پر ہلکا پھلکا کی ایک گپ ہے جس میں آپ بیتی اور جگ بیتی کی دھوپ چھاؤں ہوتی ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انشائیہ میں ایک مرکزی بات سے کچھ ضمنی باتیں پھوٹ کر اپنا تانا بانا تیار کرتی ہیں۔ اس میں رمزیت ہوتی ہے۔ اختصار اور تہہ داری ہوتی ہے۔ اور زبان و بیان میں کاٹ و بانکپن ہوتا ہے۔ وزیر آغا انشائیہ کے بارے میں ذرا تفصیل سے لکھتے ہیں۔ ان کے خیال میں انشائیہ میں غیر رسمی طریق کار اور شخصی ردِ عمل لازمی ہے۔ مسرت بہم پہنچانا انشائیے کا بنیادی کام ہے۔ عدم تکمیل اس کی ایک اہم خصوصیت ہے۔ موضوع کی مرکزیت کے علاوہ اس میں ضمنی باتیں بھی ہوتی ہیں۔ مضمون یا مقالہ کے مقابلے میں اس کا ڈھانچہ کہیں زیادہ لچکیلا ہوتا ہے۔ اس میں مرکزی خیال کے بادصف دلائل کا کوئی منضبط سلسلہ قائم نہیں کیا جاتا۔ وہ دعوتِ فکر دیتا ہے۔ اختصار اس کا ایک بنیادی

وصف ہے۔ انشائیہ کا موضوع اور نقطۂ نظر انوکھا ہوتا ہے جو قاری کی زندگی کی یکسانیت اور ٹھیراؤ سے اوپر اٹھا کر ماحول کا ازسرِنو جائزہ لینے پر مائل کرتا ہے۔ انشائیہ نگار کوئی نتیجہ اخذ نہیں کرتا اور نہ ہی کوئی مشورہ دیتا ہے بلکہ وہ مخصوص انداز سے کسی موضوع پر سوچنے کی ترغیب دیتا ہے اور بس۔

ان تعریفوں سے ہم جس نتیجہ پر پہنچتے ہیں وہ یہ ہے کہ انشائیہ نثری اظہار کی ایک ایسی صنف ہے جس میں حقیقت کا اظہار، شخصی ردِعمل، عدمِ تکمیل، رمزیت واشاریت، غیر منطقی ربط، اختصار، دعوتِ فکر، مسرت بہم پہنچانے کی صلاحیت، زبان وبیان میں بانکپن اور مرکزی بات سے کچھ ضمنی باتوں کا ذکر جیسی خصوصیات پائی جاتی ہوں۔

اردو میں لفظ انشائیہ انگریزی لفظ ایسے ESSAY کے معنی میں جو فرانسیسی لفظ ESSAI کا مترادف ہے، استعمال ہوتا ہے جس کا آغاز فرانس میں ہوا۔ سولہویں صدی میں فرانسیسی ادب کے ایک عظیم فنکار آدم دی مون تین نے غالباً سب سے پہلے اس نثری صنف کا استعمال کیا۔ وہاں سے یہ صنف انگریزی میں منتقل ہوئی اور کافی مقبول ہوئی۔ انگریزی میں بیکن، ایڈیسن، اسٹیل، چارلس لیمب اور ہیزلیٹ وغیرہ نمائندہ انشائیہ نگار کہلاتے ہیں جن کی تحریروں کے ذریعے نہ صرف یہ پروان چڑھا بلکہ ان کی وجہ سے انشائیہ کو انگریزی ادب میں قبولِ عام کی سند ملی۔ اردو میں ناول اور افسانے کی طرح یہ صنف بھی انگریزی سے مستعار ہے۔ ایک خیال یہ ہے کہ اردو انشائیہ کے اولین نقوش ملا وجہی کی سب رس میں دیکھنے کو ملتے ہیں جو مون تین کا ہم عصر تھا۔ یہ محض قیاس آرائی ہے کیونکہ جو ادیب کسی صنف کو شعوری طور پر نہ برتے وہ اس کا موجد نہیں ہوسکتا اور یہ ہم سب جانتے ہیں کہ سب رس انشائیوں کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک تمثیلی قصہ ہے۔ اردو تحقیق یہ بھی کہتی ہے کہ سرسید اور ان کے ہم عصروں کے یہاں اردو انشائیے کے اولین نقوش ملنا شروع ہو جاتے ہیں۔ سرسید کے عہد میں مغربی علوم اور ادبیات کو لے کر ہماری علمی اور ادبی زندگی میں جو اتھل پتھل ہوئی تھی اس کے زیرِ اثر اس عہد کے لوگوں نے انگریزی "ایسے" کا اثر ضرور قبول کیا ہے۔ "نتیجتاً" میلان نچوں کا طرف نقل کرنے کے "(ماسٹر رام چندر)، "بحث وتکرار" (سرسید احمد خاں)، "نیرنگِ خیال" (محمد حسین آزاد) اور "یادش بخیر" (میر ناصر علی)، جیسی تحریریں

سامنے آئی ہیں۔

اردو کی اصنافِ نثر میں انشائیہ مضمون کے زیادہ قریب ہے۔ یہ قربت ان کی الگ الگ شناخت کو مشکل بنا دیتی ہے، لیکن ان دونوں کی تعریفوں کو مدِنظر رکھ کر اگر ہم غور کریں تو یہ الجھن دور ہو سکتی ہے۔ مضمون کی فضا سنجیدہ ہوتی ہے جہاں ہر بات، ہر جملہ اور ہر پیراگراف مرکزی خیال کی منطقی وضاحت کرتا ہے۔ جبکہ انشائیہ غیر سنجیدہ ماحول میں لکھا جاتا ہے۔ اس میں محض تاثرات ہوتے ہیں جو ذہنی ترنگ کے تابع ہوئے ہیں۔ مضمون میں موضوع پر سنجیدگی سے بحث ہوتی ہے اس میں صراحت اور وضاحت کی بنیاد دلائل پر ہوتی ہے جب کہ انشائیہ میں داخلیت کی کارفرمائی ملتی ہے۔ ایجاز واختصار اور رمز واشاریت انشائیہ کا حسن اور حقائق کا اظہار، موضوع کی طرف شخصی ردِعمل اور عدمِ تکمیل انشائیہ کے فنی اجزا ہیں۔ مضمون یا مقالے میں بات کو عالمانہ انداز سے کہنے اور معلومات فراہم کرنے پر خاص زور ہوتا ہے۔ اس میں زیادہ تر علم وحکمت کی باتیں ہوتی ہیں۔ انشائیہ میں خاص زور اندازِ بیان پر ہوتا ہے۔ اس میں واقعات سے زیادہ واقعات کے ردِعمل سے سروکار ہوتا ہے۔ مضمون کے موضوعات محدود ہوتے ہیں جب کہ انشائیہ میں کسی بھی موضوع پر قلم اٹھایا جا سکتا ہے۔ انشائیہ نگار اپنی تحریر میں ذات کا انکشاف کرتا ہے۔ اس کی تحریر میں داخلی کیفیات کا بیان ہوتا ہے۔ اس کے برعکس مضمون میں خارجی باتوں کا ذکر ہوتا ہے۔ انشائیہ میں مصنف اپنے تجربات اور مشاہدات پیش کرتا ہے جن کا مقصد اصلاح یا اپنے مشن کی تبلیغ کرنا نہیں ہوتا۔ رابرٹ کے قول کے مطابق "انشائیہ نگار سے ہم صرف اتنا چاہتے ہیں کہ وہ اپنی طرزِ تحریر سے ہمیں خوش کرے اور جس موضوع پر وہ لکھ رہا ہے اس پر اختصار کے ساتھ کسی قدر نئی روشنی ڈال دے اور بس۔"

انشائیہ کی ہیئت، موضوع اور فنی محاسن کو لے کر اردو میں کافی بحثیں ہوئی ہیں جنھیں مستقل کتابوں، انشائیہ کے مختلف مجموعوں کے دیباچوں اور مضامین کی شکل میں متعدد ادبی رسالوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ ان بحثوں کو ہم تین حصوں میں سمیٹ سکتے ہیں۔ پہلی بحث اردو میں انشائیے کے آغاز سے متعلق ہے۔ اس سلسلے میں اکثریت کی رائے ماسٹر رام چندر، سرسید احمد خاں، محمد حسین آزاد، اور میر ناصر علی کے حق میں جاتی ہے جو تقریباً ایک دوسرے کے ہم عصر ہیں اور جنھوں نے

ٹیٹلر، بیکن، اسٹیل، جانسن اور ایڈیسن وغیرہ کے زیر اثر مختلف اخباروں اور جریدوں میں مضمون
نگاری کی شروعات کی۔ بعض محققین ادبِ لطیف یا ٹیگوریت کے دور کو انشائیہ کی ابتدا
کا زمانہ بتاتے ہیں جس کی نمائندگی عبدالحلیم شرر، سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتح پوری، مہدی افادی اور
حسن نظامی وغیرہ کرتے ہیں وزیر آغا کے خیال میں اُردو انشائیہ پانچویں دہائی کی پیداوار ہے۔
دوسری بحث انشائیہ کے فنی محاسن اور اس کے ارتقائی عمل سے تعلق رکھتی ہے۔ اس میں انشائیہ
کی اصطلاح، انشائیہ کا فن، انشائیہ کا اسلوب، مغرب میں انشائیہ کی روایت اور اُردو انشائیہ کی
سمت و رفتار جیسے موضوعات کو لے کر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ تیسری بحث تجزیاتی نوعیت
کی ہے جس میں ہندوپاک کے اُردو کے متعدد انشائیہ نگاروں کے فن، موضوعات اور زبان و
اسلوب کا ذکر ملتا ہے۔ اِن تمام مباحث پر بحیثیت مجموعی جن کتابوں اور مضامین کی سفارش کی
جاسکتی ہے ان میں "اُردو انشائیے" (سیدہ جعفر)، "اُردو ایسیز" (ظہیر الدین مدنی)، "اردو انشائیے" (سید
صفی مرتضیٰ)، "اُردو کا بہترین انشائی ادب" (وحید قریشی)، "صنف انشائیہ اور اُردو انشائیے" (سید محمد
حسنین)، "انشائیہ کیا ہے" (وزیر آغا)، "انشائیہ" (آدم شیخ)، "اُردو انشائیے کی ابتدا سے متعلق چند
نئے حقائق" (جاوید وششٹ)، "انشائیہ اُردو ادب میں" (انور سدید) اور "انشائیہ کی بنیاد" (سلیم اختر)
وغیرہ اہم ہیں۔ اس کے علاوہ "ادبِ لطیف"، "ادیب"، "نیا دور"، "کتاب نما"، "شاعر"، "اوراق"،
"نقوش"، "ادبی دنیا" اور "اردو زبان" وغیرہ ہندوپاک کے مختلف رسائل و جریدوں میں نیاز فتح پوری،
عبادت بریلوی، سجاد باقر، احمد جمال پاشا، اختر اورینوی، جمیل آذر اور نظر صدیقی وغیرہ کے چھپے
مختلف مضامین قابلِ ذکر ہیں۔

یوں تو اردو میں انشائیے کی عمر سوا سو سال سے بھی زیادہ ہے لیکن بحیثیت ایک منفرد
نثری صنف اُردو انشائیہ اپنے تمام فنی محاسن کے ساتھ بیسویں صدی کی شروع کی دہائیوں میں
ابھر کر سامنے آتا ہے۔ اس دور میں شعوری اور غیر شعوری طور پر ان گنت انشائیے لکھے گئے جو کبھی مضمون،
"پرسنل ایسے" یا "لائٹ ایسے" کی حیثیت سے گردانے گئے تو کبھی انشائے لطیف کے اہم ادبی
شہ پاروں کے طور پر انہیں پہچانا گیا۔ وزیر آغا نے انشائیے کے فن اور تکنیک سے بحث کرتے
ہوئے اردو انشائیے کو بیسویں صدی کی پانچویں دہائی کی پیداوار کہا ہے۔ اس معاملے میں وہ

بہت آدرش پرست ہو گئے ہیں۔ پتہ نہیں ان کے پاس انشائیہ کے فنی محاسن کہاں سے آئے
ہیں۔ اگر یہ خود ان کی ایجاد ہیں تو ان کے تینوں مجموعوں "خیال پارے"، "چوری سے یاری تک"
اور "دوسرا کنارہ" کا ایک بھی انشائیہ اپنی تمام نزاکتوں اور لطافتوں کے ساتھ ان فنی تقاضوں پر
پورا کیوں نہیں اترتا جنھیں انھوں نے انشائیہ کے لیے لازم قرار دیا ہے۔ اگر یہ فنی محاسن مغرب سے
ماخوذ ہیں تو وہاں بھی یہی صورت ہے۔ بیکن سے لے کر جو انگریزی انشائیے کا بانی ہے، اسٹیل،
ہیزلٹ، کاؤلے، لیمب، بیلاک اور رابرٹ وغیرہ تک انگریزی کے بیشتر انشائیے وزیر آغا
کے وضع کردہ فنی محاسن پر پورے نہیں اترتے۔ دراصل کوئی بھی مستعار لی ہوئی صنف
کسی ادب میں بتدریج ہی رواج پاتی ہے اور یہ ضروری نہیں ہے کہ دوسری زبان کے ماحول
میں لگی ہوئی قلم وہی برگ و بار لائے۔ ہر ادب کے اپنے طریق، مزاج اور رویوں پر منحصر ہوتا ہے
کہ وہ مستعار صنف کو کس شکل میں قبول کرتا ہے۔ مثال کے طور پر اُردو غزل کو لیجیے جو فارسی
سے مستعار ہے۔ اُردو غزل کو فارسی کے فنی محاسن پر پرکھنا سراسر ناانصافی ہوگی اور وزیر آغا جیسے
دانشور یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ مستعار صنف ادب کے اپنے مزاج کے مطابق فروغ پاتی ہے۔
یہ درست ہے کہ ہمارے یہاں انشائیہ کا تصور (شخصی ردِ عمل، غیر منطقی ربط، رمزیت و اشاریت،
مسرت بہم پہنچانے کی صلاحیت اور زبان و بیان کے بانکپن کے اعتبار سے) موجود تھا۔ ایک
مخصوص اصطلاح کے طور پر نثری صنف کی حیثیت سے اسے بعد میں پہچانا اور لکھا گیا
لیکن ایسی تحریریں جن میں انشائیہ کے عناصر موجود ہوں، اُردو میں بہت پہلے سے لکھی جاتی
رہی ہیں؛ جیسے ملا وجہی کی "سب رس"، تحسین کی "نوطرز مرصع"، رجب علی بیگ سرور کی "فسانۂ عجائب"
اور غالب کے خطوط وغیرہ۔ ان تحریروں کے ذریعے اُردو میں انشائیے کے لیے فضا ہموار ہو چکی تھی۔ یہ
محض حسن اتفاق ہے کہ وقت کی ضرورت یا انشائیہ کی اپنی افادیت نے ماسٹر رام چندر، سید احمد خاں،
محمد حسین آزاد اور میر ناصر علی وغیرہ سے چند مغربی انشائیہ نگاروں کے "ایسیوں" سے متاثر
ہو کر ایسے مضامین لکھوائے جو اُردو انشائیہ کی تاریخ میں خشتِ اوّل کے نام سے پکارے گئے۔

۱۹ویں صدی کے اوائل میں ماسٹر رام چندر نے بیکن، ایڈیسن اور اسٹیل وغیرہ انگریزی
ادیبوں کی تحریروں سے متاثر ہو کر اُردو میں "ایسے" لکھنے کی بنیاد ڈالی۔ انھوں نے زیادہ تر علمی نوعیت

کے مضامین لکھے جن میں قلبی تاثرات اور احساسات کی جھلک نظر آتی ہے لیکن انشائیہ نگاری کا فقدان ہے یہ سادہ اور بامقصد نثر لکھنے کی طرف اُردو میں پہلی باقاعدہ کوشش تھی۔ بعد میں تخلیقی نوعیت کے مضامین لکھے گئے جن میں انشا پردازی کے جوہروں کے علاوہ ہمیں بہت کچھ دیکھنے کو ملتا ہے۔ یہاں سرسید احمد خاں کا نام سرفہرست آتا ہے جو اپنے مضامین میں انشائیے کے مزاج شناس نظر آتے ہیں (اُمید، خوشامد، بحث و تکرار وغیرہ) دوسرا بڑا نام محمد حسین آزاد کا ہے جن کے یہاں انشائیہ کا زبردست شعور ملتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ان کے تمثیلی انشائیے انگریزی سے ترجمہ ہیں (نیرنگِ خیال)، مولوی ذکاء اللہ نے اخلاقیات کو موضوع بنا کر انشائیہ نما مضامین لکھے جو اُردو انشائیہ کے ارتقا کی اہم کڑی ہیں۔ میر ناصر علی نے انشائیہ کی صنف کو اپنی تحریروں میں باقاعدہ برتا ہے غالباً اسی لیے نیاز فتح پوری نے انھیں اُردو انشائیے کا موجد قرار دیا ہے۔ ان کے "خیالاتِ پریشان" (مقاماتِ ناصری) میں خیال کا تنوع ہے۔ جہاں مفہوم فقروں کے سانچوں میں ڈھل کر بلیغ مصرعوں جیسی جامعیت بیدار کر دیتا ہے۔

فنی اعتبار سے اُردو انشائیے کے ابھی خدوخال ہی واضح ہوئے تھے کہ اُردو میں ٹیگوریت کا دور شروع ہو جاتا ہے جسے ہم ادبِ لطیف یا انشائے لطیف کے نام سے بھی پکارتے ہیں اس دور کی نثری کاوشوں میں اسلوب کی تازگی، تدبیر کاری کی نزاکت اور قلبی تاثرات کی جلوہ گری نظر آتی ہے جو تحریروں کو انشائیے کے قریب لے آتی ہے۔ عبدالحلیم شرر، رتن ناتھ سرشار، سجاد حیدر یلدرم، عبدالقادر، حسن نظامی، فرحت اللہ بیگ، ملا واحدی، خلیقی دہلوی، نیاز فتح پوری، ہندی افادی اور سجاد انصاری وغیرہ ایسے نام ہیں جنھوں نے تقریباً انشائیے لکھے ہیں لیکن اپنی تحریروں کو کبھی انشائیے کا نام نہیں دیا۔ شرر نے اپنے رسالے، دلگداز میں نہیں "نسیم سحر" "عمر رفتہ" "ہم، تم اور وہ" اور مغرور جوتا" وغیرہ انشائیے لکھے جن میں اسلوب کی رنگینی کی شعوری کوشش تو نہیں ہے البتہ فکر ہے جو قاری کو سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ سرشار نے "عشق" اور "بنی نوع انسان" انشائیہ نما مضمون لکھے جن میں فسانۂ آزاد کا اسلوب غالب ہے۔

فرحت اللہ بیگ نے اُردو کے نثری اسلوب میں خوش طبعی کو فروغ دیا۔ "دلّی کا یادگار مشاعرہ" "نذیر احمد کی کہانی، کچھ ان کی کچھ میری زبانی" اور "پھول والوں کی سیر" جیسی اہم تصانیف کے علاوہ

انھوں نے انشائیے بھی لکھے ہیں۔ جن میں معیاری انشائیے کے عناصر غالب ہیں۔ سجاد حیدر یلدرم کی "خیالستان" میں جو انشائیے، انشائے لطیف اور مختصر افسانوں کا مجموعہ ہے "مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ"، "حضرتِ دل کی سوانح عمری" وغیرہ اپنے عہد کے معیار کے مطابق اُردو کے بہترین انشائیے ہیں۔ جذباتی نثر کے علاوہ ان کی نثر کے بنیادی اوصاف میں حسن کاری، بے تکلف انداز، غیر رسمی طریقِ کار اور تہہ داری اہم ہیں۔ نیاز فتح پوری خوب صورت نثر لکھنے پر قادر ہیں۔ ہمارے ناقدین نے "برسات" "عورت" "ایک معتوب فرشتہ" اور "ایک رقاصہ سے" کو ان کے بہترین انشائیہ قرار دیا ہے جن میں حقیقت کا اظہار، شخصی ردِعمل اور اسلوب کی لطافت ملتی ہے۔ وہ جذباتی نثر کے دلدادہ اور فطرت نگاری کے بادشاہ ہیں۔ نیاز نے اپنی تحریروں کے ذریعہ اُردو انشائیے کو رنگین اسلوب اور استعارے کی زبان دی ہے خواجہ حسن نظامی اُردو نثر میں اپنے مخصوص لہجہ، تازگی، برجستگی اور انوکھے پن سے پہچانے جاتے ہیں۔ ان کے انشائیوں میں باریک بینی، مشاہدات کی گہرائی اور تجربات کی وسعت ملتی ہے۔ مثلاً "جھینگر کا جنازہ" "آنسو کی سرگزشت" "دیا سلائی" "الف خالی" اور "تمباکو نامہ" وغیرہ۔ خلیقی دہلوی نے انشائیہ کے فن کو ملحوظ رکھتے ہوئے مضامین لکھے ہیں، جیسے "ہاہا ہو" اور "میرا سفر" وغیرہ ان کے یہاں اظہارِ ذات کی لے بہت تیز ہے۔ یہاں ایک قابلِ ذکر نام مہدی افادی کا بھی آتا ہے جنھوں نے جذباتی نثر لکھی ہے۔ خواہ موضوع کیسا بھی ہو وہ جذباتی ہو کر اس کی تدبیر کاری کرتے ہیں۔ افاداتِ مہدی ادبِ لطیف کا بہترین نمونہ ہے۔ جس میں لہجہ کا بانکپن، تراکیب کی ندرت اور استعاروں کی جلوہ گری ملتی ہے۔ ان کے انشائیے ایک طرف دعوتِ فکر دیتے ہیں تو دوسری طرف ان میں حقیقت کا اظہار اور شخصی ردِعمل ملتا ہے۔ سجاد انصاری کی "محشرِ خیال" انشائے لطیف کی بھول بھلیوں میں اٹک کر رہ گئی ہے البتہ "تکوین" ان کا بہترین انشائیہ ہے جو اختصار، آزاد روی، غیر رسمی انداز اور تازگیِ فکر جیسی خصوصیات کا حامل ہے۔

اُردو انشائیے کے اس جائزے میں باقی جو نام شامل ہیں انھیں بعض خصوصیات کے تحت چار حصوں میں بانٹا جا سکتا ہے پہلے گروہ میں خالص دہلی والے آتے ہیں جن میں اشرف صبوحی، یوسف بخاری، خواجہ محمد شفیع، آصف علی، مرزا محمود بیگ، بشیشور دیال، جاوید وششٹ، ضمیر حسن دہلوی

ورحسن ثانی نظامی وغیرہ خصوصاً قابلِ ذکر ہیں۔ دوسرے گروہ میں خصوصاً وہ انشائیہ نگار آتے ہیں جن کا کسی نہ کسی طرح دہلی سے تعلق رہا ہے۔ ان میں مولانا ابوالکلام آزاد، پطرس بخاری، سید عابد حسین، کرشن چندر، فرقت کاکوروی، سید آوارہ، اندرجیت لال، محمد حسن، جوگندر پال، مجتبیٰ حسین اور معین اعجاز وغیرہ اہم ہیں۔ تیسرے گروہ کے انشائیہ نگاروں میں غیر دہلی والوں کے نام لیے جا سکتے ہیں؛ جیسے رشید احمد صدیقی، سلطان حیدر جوش، اختر اورینوی، سید محمد حسنین، سجاد انصاری اور احمد جمال پاشا وغیرہ۔ چوتھا اور آخری گروہ پاکستانی انشائیہ نگاروں کا ہے جنھوں نے تقسیم ہند کے بعد خصوصاً بیسویں صدی کی پانچویں دہائی یا اس کے بعد انشائیے لکھنا شروع کیے۔ یہاں نئے اور پرانے متعدد نام قابلِ ذکر ہیں؛ مثلاً مشتاق یوسفی، داؤد رہبر، جاوید صدیقی، وزیر آغا، جمیل آذر، نظر صدیقی، مشکور حسین یاد، محمود اختر، اقبال انجم اور شمیم ترمذی وغیرہ۔

بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں ترقی پسند تحریک کے شروع ہونے سے انشائیہ کی صنف کو ایک زبردست جھٹکا لگا۔ یہ تحریک ادب میں ایک انقلابی حیثیت رکھتی تھی۔ ترقی پسند تحریک سے وابستہ دانشوروں، ادیبوں اور شاعروں نے موجودہ اقتصادی نظام، معاشرتی اقدار، تہذیبی رویے اور سیاسی جبر و ستم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہوئے ایک بامقصد اور روشن زندگی کا خواب دیکھا۔ انھوں نے اپنے تخلیقی افکار و اعمال کا رخ سماجی زندگی کو بہتر بنانے، سامراجی طاقتوں کو کچلنے اور جدوجہد آزادی جیسے اغراض کی طرف کر لیا۔ نتیجتاً رومانیت، ٹیگوریت یا انشائے لطیف کی لویں مدھم پڑنے لگیں جس سے انشائیہ بھی متاثر ہوا۔ دراصل ہمارے ادبی مقاصد انشائیہ کے فنی مقاصد کے برعکس تھے۔ ہم اپنی محبوس زندگی پر ردِ عمل ظاہر کرنے لگے تھے۔ مختلف سیاسی، سماجی اور ادبی تحریکوں کے زیرِ اثر ذہنی ترنگ کے بجائے حقائق کو حقیقت ہی کی کسوٹی پر پرکھنے پر زور دیا جانے لگا اس لیے اس دور میں انشائیہ کی صنف کی اہمیت اور مقبولیت کم ہو گئی اور اس کے اسلوب پر طنز و مزاح کا غلبہ بڑھ گیا۔ اس سلسلے میں رشید احمد صدیقی پطرس بخاری اور کرشن چندر وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں جن کے انشائیوں میں طنز و مزاح کا اسلوب غالب ہے۔

رشید احمد صدیقی کی انفرادیت ان کی آشفتہ بیانی میں ہے۔ ان کا اسلوب طنز و مزاح

کی شائستگی و شگفتگی سے عبارت ہے۔ معاشرے کی سچی اور بے لاگ تنقید کے عناصر ان کی تحریروں میں اتنے حاوی ہیں کہ ان کے یہاں انشائیہ کا فن مجروح ہو گیا ہے۔ انھیں بڑی سے بڑی بات کو انتہائی جامعیت اور اختصار کے ساتھ کہنے پر قدرت حاصل ہے۔ ان کی رمز شناسی اور بالغ النظری سے بھی انکار ممکن نہیں۔ ان کے مشہور انشائیوں میں "چارپائی اور کلچر"، "الیکشن" اور "سفر" وغیرہ اہم ہیں۔ پطرس بخاری کی خوش طبعی ان کو مزاح نگار بنا دیتی ہے۔ ان کی ظرافت کا فن لفظی الٹ پھیر کے بجائے واقعات میں ہے۔ وہ موضوع کو شخصی زاویے سے ضرور دیکھتے ہیں لیکن ان کے یہاں انشائیت کی کمی ہے۔ "سویرے جو کل آنکھ میری کھلی"، "کتے" اور "بچے" وغیرہ ایسی تحریریں ہیں جن میں پطرس بظاہر ایک مزاح نگار نظر آتے ہیں تاہم ان میں ایک انشائیہ نگار بھی چھپا ہوا ہے جو ذات کو منکشف کر کے تحریر میں ایک خاص تاثر قائم کرتا ہے۔ کرشن چندر بنیادی طور پر فکشن کے آدمی ہیں اس لیے ان کی تحریریں پلاٹ و کردار اور ماحول کے گرد گھومتی ہیں۔ "ہوائی قلعے" کے اکثر مضامین میں ان خصوصیات کے فطری امتزاج کو فنی کمال سے برتا گیا ہے انھیں معمولی سے معمولی موضوع پر بڑی چابک دستی سے اظہارِ خیال کرنے کا فن آتا ہے۔ طنز و مزاح میں ڈوبی ہوئی یہ تحریریں ان کے اسلوب کو ایک نیا لہجہ اور نیا آہنگ بخشتی ہیں۔ "ہوائی قلعے"، "غلیلات"، "باون ہاتھی" اور "مانگے کی کتاب" وغیرہ مضامین میں انشائیے کے رنگ بکھرے ہوئے ہیں۔ اس سلسلے کی ایک کڑی احمد جمال پاشا بھی ہیں جن کی تحریروں میں طنز و مزاح کی وجہ سے شگفتگی، لطافت اور شوخی آ گئی ہے۔ انھوں نے اپنے انشائیوں کے موضوعات کو مختلف زاویوں سے دیکھا ہے اور اپنی ذات کا لمس عطا کیا ہے۔ وہ موضوع کے مرکزی نقطے کو پکڑ کر نہیں بیٹھ جاتے بلکہ وہاں سے اپنے اطراف میں آزادروی سے دیکھتے ہیں اور منفی حقائق کا پتا لگاتے ہیں۔ "ہجرت"، "ناپسندیدہ لوگ" اور "نلکیوں کے سلسلے میں" ان کے اہم انشائیے ہیں۔

اس دور میں ایسے لوگ بھی مل جاتے ہیں جنھوں نے اردو انشائیے کی روایت کو قائم رکھا۔ مثلاً سید محمد حسنین جن کے انشائیوں میں گہرے مشاہدے اور لطیف اندازِ بیان کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ وہ موضوع ہی کو نہیں بلکہ اپنے کردار کے مختلف پہلوؤں کو انوکھے زاویوں سے قاری کے سامنے لاتے ہیں۔ انھیں انشائیے کے مزاج کو سمجھنے اور اسے تخلیقی پیکر میں ڈھالنے

کا سلیقہ آتا ہے۔ اس اعتبار سے نشاطِ خاطر کے انشائیے بہت خوب ہیں۔ اس کے علاوہ وحید الدین سلیم (دوستوں کی ایذا رسائی) محمد اسمٰعیل (وقت سرمایہ ہے)، سجاد حسین رضوی، عبد القادر (گھر سے نکل کے دیکھو) اور سلطان حیدر جوش (لیڈر) وغیرہ کے انشائیے ہمارے اس جائزے میں قابلِ قبول بھی ہیں اور قابلِ ستائش بھی۔

آزادی کے بعد پانچویں دہائی میں اردو انشائیہ ترقی کی راہ پر پھر گامزن ہوتا ہے اور اسے قبولِ عام کی سند ملتی ہے۔ یہ صنف ہندوستان کے مقابلے میں پاکستان میں زیادہ ترقی کرتی ہے۔ اس کی کئی وجہیں ہیں۔ اول پاکستان کا سماجی ڈھانچہ، دوم وہاں اردو کے بیشتر ادیبوں کی ہجرت سوم ادبی رسالوں و جریدوں کی افراط چہارم ترقی پسند تحریک پر پابندی اور پنجم خود انشائیے کی اپنی افادیت جب کہ ہندوستان میں صورتِ حال مختلف تھی۔ آزادی کے فوراً بعد تقریباً ڈیڑھ دہائی تک یہاں اردو نے اپنا وقت بڑی کس مپرسی میں گزارا۔ دوسرے ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر ادب کے تعلق سے یہاں کے بیشتر ادیبوں کے کاندھوں پر سماجی ذمہ داریوں کا کافی بوجھ تھا تیسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ انشائیہ اپنے مزاج اور فنی محاسن کے اعتبار سے ہندوستان کے اس وقت کے اردو سماج کے مطابق نہیں تھا اس لیے یہ صنف آنے والی نسلوں میں منتقل نہ ہو سکی۔

اردو نثر داستانوں، تمثیلی قصوں، سوانحوں اور مکاتیب سے گزر کر جب مضمون نگاری میں داخل ہوئی تو اس میں ایک نیا شعور پیدا ہوا نئی جہت آئی اور اس کے اندازِ بیان کا دامن وسیع تر ہوتا گیا مضمون نگاری کی ابتدا کے بعد سرسیدؔ، حالیؔ اور شبلی وغیرہ نے مضامین کے ذریعے اردو نثر ایجاز و اختصار منطقی ربط، قطعیت، روانی، سادگی اور تجزیاتی اندازِ فکر سے واقف ہوئی۔ بیسویں صدی کے آغاز میں جب رومانیت کا غلبہ ہوا اور اردو کے بیشتر ادیب ٹیگوریت یا انشائے لطیف کے تحت لکھنے لگے تو اس میں شگفتگی، لطافت اور خوش طبعی کے عناصر شامل ہو گئے۔ ابو الکلام آزاد اور رشید احمد صدیقی نے اپنی رمز شناسی، بلاغ النظری اور جزئیات نگاری سے اردو نثر کو پر اسرار بنایا۔ حقیقت یہ ہے کہ ماسٹر رام چندر سے لے کر اب تک اردو میں جو انشائیہ نما مضمون اور انشائیے لکھے گئے انھوں نے اردو نثر کے طرقِ اظہار و زبان و اسلوب کو ایک نیا آہنگ ایک نئی طرز اور اظہار و ابلاغ کے متعدد نئے زاویے عطا کیے ہیں۔ سنجیدہ ادب میں پہلے ہی

انشائیے کی گنجائش کم ہو لیکن زبان و بیان، طرقِ اظہار اور اپنے لہجے کے اعتبار سے اس صنف نے اردو کو بہت کچھ دیا ہے انشائیے نے اردو نثر کے پرتکلف اندازِ بیان کو غیر رسمی اور بے تکلف بنایا۔ نثر میں انشائیہ واحد صنف ہے جس میں مصنف اپنا دل و دماغ کھول کر رکھ دیتا ہے۔ اس میں انشائیہ نگار موضوع کو مزاج کی داخلیت سے محسوس کرتا ہے اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ انشائیہ نے اردو نثر کو داخلیت کے اظہار کا سلیقہ سمجھایا۔ ایجاز و اختصار بھی اردو نثر میں انشائیہ کی دین ہے۔ رمزیت جو شاعری کا وصف ہے، نثر میں انشائیہ کے توسل سے آئی ہے۔ انشائیہ کا غیر رسمی اندازِ فکر جو تحریر کو بوجھل ہونے سے بچاتا ہے، اردو نثر میں انشائیہ کے ذریعہ ہی پہنچا ہے۔ الفاظ کو روایتی معنوں سے ہٹ کر استعمال کرنے کا رواج جو مخصوص سیاق و سباق سے ممکن ہے اردو نثر میں انشائیہ کی دین ہے۔ انواع و اقسام کے خیالات، افکار اور موضوعات کو لے کر نئے نئے الفاظ اختراع کرنا الفاظ کی فقروں اور فقروں کی جملوں میں نحوی ترتیب میں الٹ پھیر کرنا۔ شعروں کی مقبول تراکیب کے علاوہ نت نئی تراکیب تراشنا انشائیہ نگاروں کا شغل رہا ہے جس سے اردو نثر اور اس کی زبان و بیان میں تنوع آیا ہے۔ اس کے علاوہ انشائیوں نے اردو نثر کو جو نیا اسلوب دیا ہے، اس کی ایک خوبی اساتذۂ کرام کے مصرعوں یا شعروں کا بے دریغ استعمال ہے۔ ہو سکتا ہے یہ انشائیہ نگاروں کی ضرورت رہی ہو لیکن اس طرح اظہار میں ایک شعری لہر سی دوڑ جاتی ہے جو عبارت کے حسن کو نہ صرف دوبالا کرتی ہے بلکہ نثر کو شاعری کے قریب لے آتی ہے۔ انشائیوں نے اردو کو استعاراتی نثر لکھنے کی ترغیب بھی دی ہے۔ یہ بات اس لیے اہم ہے کہ یہ ادبی نثر کی معراج ہے انشائیہ میں نثر کی تخلیقی قوت کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ کیونکہ انشائیہ میں خاص زور طرزِ بیان پر ہوتا ہے اس لیے اس صنف میں قدم قدم پر زبان و بیان کے نت نئے شگوفے پھوٹتے ہیں جس سے زبان کا دامن وسیع تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے بھی اردو نثر انشائیہ کی احسان مند ہے۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ خالص دلی والوں یا کسی نہ کسی طرح اس شہر سے متعلق انشائیہ نگاروں نے اردو انشائیہ کی ترویج و اشاعت میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ انھوں نے اپنی تحریروں میں اس صنف کو بڑی فراغ دلی کے ساتھ نہ صرف برتا بلکہ اس کے معیار بھی متعین کیے اور ایک

ادبی صنف کی حیثیت سے اُردو میں انشائیہ کی پہچان کرائی۔ غالباً اس کا سبب دہلی کی مرکزی حیثیت ہے جو اسے ہندوستان کی دارالحکومت ہونے کی وجہ سے حاصل ہے۔ دوسرے یہ شہر شروع ہی سے اُردو ادب کی سرگرمیوں کا گہوارہ رہا ہے۔ تیسرے اُردو انشائیہ کا شہر دہلی سے ایک تعلق خاص ہے کیونکہ اس ادبی روایت کی سرزمین پر ہی اُردو انشائیے نے جنم لیا ہے۔ چوتھے پریس کی سہولتیں ہیں جن کی وجہ سے اُردو رسالوں اور مختلف جریدوں کی اشاعت کا یہاں کوئی مسئلہ نہیں رہا ہے۔

دہلی میں انشائیہ لکھے جانے کا زمانہ وہی ہے جب اُردو میں انشائیہ نگاری کا آغاز ہوتا ہے۔ جیسا کہ پچھلی سطور میں مذکور ہے اُردو میں انشائیہ کی ابتدا مضمون نگاری سے ہوئی جنھیں بیکن، ٹیٹلر، اسٹیل اور ایڈیسن وغیرہ کی طرز پر لکھنے کی کوشش کی گئی۔ اس کا سہرا ماسٹر رام چندر، سرسید احمد خاں، محمد حسین آزاد اور میر ناصر علی وغیرہ کے سر جاتا ہے۔ ان لوگوں کے مضامین میں انشائیہ کے عناصر ملتے ہیں جو ان ادیبوں نے اپنے مختلف اخباروں اور رسالوں میں شائع کیے؛ جیسے فوائد الناظرین، تہذیب الاخلاق اور صلائے عام وغیرہ ماسٹر رام چندر (اخلاق، نصیحت، میلان بچوں کا طرف نقل کرنے کے) اور سرسید (اُمید، بحث و تکرار) کی تحریروں میں انداز بیان رسمی اور انکشافِ ذات کا فقدان ہے۔ انیسویں صدی کی شروع کی دہائیوں میں جب انشائیہ کا خمیر تیار ہو رہا تھا، خالص انشائیہ کی توقع کرنا فضول بھی ہے البتہ "زمانہ" اور "صلائے عام" میں میر ناصر علی کی تحریروں کو جو مولوی عبدالحق کے الفاظ میں نازک اور لطیف پھلجھڑیاں ہیں، دہلی کے ابتدائی انشائیاتی ادب میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ "بساطِ خیال"، "زندگی کی شام"، "ذکرِ خوباں"، "یادش بخیر" وغیرہ میر ناصر علی کے ایسے انشائیے ہیں جہاں سوچ میں تنوع، اسلوب میں لطافت اور تجزیاتی ذہن کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ وہ دہلی کی سادہ بامحاورہ نثر لکھتے ہیں اور باتیں خوب بناتے ہیں۔ ان کے "خیالات پریشاں" کا مجموعہ "مقالاتِ ناصری" کے نام سے چھپا ہے۔ اس سے قبل یہاں ایک بڑا نام محمد حسین آزاد کا آتا ہے جو ایک مرصع ساز ہیں۔ آزاد کے مضامین مثلاً "گلشن اُمید کی بہار"، "خوش طبعی" اور "نکتہ چینی" وغیرہ (نیرنگ خیال) خوش بیانی کے "مُرقّعے" اور لفظی مصوّری کے جیتے جاگتے نمونے ہیں۔ ان کے یہاں انشائیہ کا مزاج موجود ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں میں اختصار، جامعیت، اسلوب کی سحر انگیزی اور موضوع میں لچک ملتی

ہے۔ ان کے تمثیلی انشائیے ذہنی ترنگ کے بجائے انگریزی ادیبوں کے مضامین کا آزاد ترجمہ ہیں۔ علی گڑھ تحریک سے وابستہ مولوی ذکاء اللہ دہلوی نے اخلاقیات کو موضوع بنا کر بہت کچھ لکھا ہے۔ موضوعات میں تنوع کی وجہ ان کا مشرقی و مغربی علوم سے استفادہ ہے۔ ان کے انشائیہ نما مضامین میں اسلوب کی تازہ کاری، بات میں بات پیدا کرنے کی صلاحیت اور موضوع کو نئے مدار میں لے جانے کی قوت جیسی خصوصیات ملتی ہیں۔ دہلی میں انشائیوں کے ارتقائے شروع کے ایام میں خلیقی دہلوی کا نام بھی قابل ذکر ہے۔ انھوں نے بیشتر مضامین (ادبستان) میں انشائیہ کے فن اور اس سے وابستہ تقاضوں کو ملحوظ رکھا ہے۔ "دزدِ موت"، "باسی ہار"، "میرا سفر" جیسے انشائیے اظہار ذات کی غمازی کرتے ہیں۔ فرحت اللہ بیگ بنیادی طور پر خاکہ نگار (نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی)، ڈرامہ نویس (دلی کا یادگار مشاعرہ) اور رپورتاژ نگار (پھول والوں کی سیر) ہیں۔ ان کے اسلوب میں شگفتگی اور ادبی ظرافت کے نکھرے ہوئے روپ ملتے ہیں۔ انھوں نے انشائیہ کی طرف کوئی خصوصی توجہ نہیں دی تاہم "پنا"، "مردہ بدست زندہ" اور "اوکھ" میں انشائیہ کے بیشتر خواص موجود ہیں۔ اس سلسلہ کی ایک کڑی سید احمد دہلوی بھی ہیں جن کے مضامین میں انشائیہ کے نقوش تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ ان کی اکثر تحریریں (مفلسی وغیرہ) کرداروں کے گرد گھومتی ہیں اور انوکھے گوشوں کو اجاگر کرتی ہیں۔

دہلی میں اُردو انشائیہ کے جائزے کے وقت ایک بڑا نام حسن نظامی کا لیا جا سکتا ہے۔ جنھوں نے مختلف موضوعات پر دل کھول کر لکھا ہے۔ "مجموعہ مضامین حسن نظامی اور سیپارہ دل" کے انشائیے اپنے غیر رسمی انداز، اختصار، جامعیت، تازگی اور تنوع کے اعتبار سے بے مثال ہیں وہ انتہائی درجے کے باریک بیں ہیں۔ مشاہدات میں گہرائی اور تجربات میں بے کراں وسعت ہے انھیں جذبے کو ابھارنے اور احساس کی لطیف پرتوں کو بڑی تازگی سے اجاگر کرنے کا فن آتا ہے۔ "جھینگر کا جنازہ"، "اُلو"، "دیا سلائی" اور "آنسو کی سرگزشت" میں اچھے اور معیاری انشائیہ کے بیشتر محاسن موجود ہیں۔ انھیں مکالموں سے خصوصی شغف ہے جسے ان کے انشائیوں کی ایک خوبی قرار دیا جا سکتا ہے۔ حسن نظامی صوفی تھے اس لیے ان کی شخصیت میں جو تصوف شامل تھا اسی کے رنگ ان کے انشائیوں میں جگہ جگہ بکھرے نظر آتے ہیں (دیا سلائی وغیرہ) انھیں

انوکھے زاویے سے غیر اہم چیزوں کو اہم بنا کر پیش کرنے کا سلیقہ آتا ہے اور تازگیٔ فکر سے وہ معنویت پیدا کر دیتے ہیں جس کی طرف کبھی قاری کا ذہن نہ گیا ہو۔

ابوالکلام آزاد اُردو کے ایک زبردست انشا پرداز ہیں۔ "غبارِ خاطر" جو بظاہر مکاتیب کا مجموعہ ہے، زبان و بیان اور وسعتِ نظر کے اعتبار سے اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ ان کی تحریروں میں خطیبانہ جوش و ہیجان نمایاں طور پر نظر آتا ہے "غبارِ خاطر" کے بیشتر حصے انشائیہ نگاری کے اعلیٰ نمونے قرار دیے جا سکتے ہیں۔ اپنے خطوط میں وہ انتہائی بے تکلف نظر آتے ہیں۔ زندگی کی پُر اسرار سنجیدگی کو بڑے دل کش انداز میں سمجھاتے ہیں اور اپنی طرز سے انکشافِ ذات کا کام لیتے ہیں۔ آزاد کا ردِ عمل شخصی ہے گو کہ انھوں نے باقاعدہ انشائیے نہیں لکھے لیکن غیر شعوری طور پر اس صنف کی طرف انھوں نے قدم بڑھائے ہیں۔ غبارِ خاطر کے "چڑیا چڑے کی کہانی" اور "زندگی اور وجود" اُردو انشائیے کے ذکر میں دو اہم نام ہیں۔

آصف علی کی تحریریں انشائے لطیف کی بہترین مثالوں میں سے ہیں۔ "پرچھائیں" اور "ارمغانِ آصف" کے مضامین پر ٹیگوریت کا غلبہ نظر آتا ہے۔ وہ بڑی پُر تکلف نثر لکھتے ہیں جس میں جمال و کمال دونوں ہیں۔ الفاظ کے استعمال میں سلیقہ مندی اور تشبیہ و استعاروں میں ندرت ملتی ہے۔ وہ چھوٹے چھوٹے سنورے اور ترشے ہوئے بلیغ جملوں سے اپنی نثر کو شاعری کے قریب لے آتے ہیں۔ انھیں تخلیقی نثر لکھنے پر قدرت حاصل ہے۔ رمزیت و اشاریت، غیر رسمی اندازِ فکر، جزئیات نگاری اور موضوع کی طرف شخصی ردِ عمل ان کے انشائیوں کے اوصاف ہیں۔ کبھی کبھی وہ تمثیلی اندازِ بیان بھی اختیار کر لیتے ہیں۔ خلیقی دہلوی کے یہاں انشائیے کا معیاری روپ ملتا ہے۔ وہ تخلیقی نثر لکھتے ہیں جن میں انکشافِ ذات اور موضوع کی طرف شخصی ردِ عمل ہوتا ہے۔ ان کے یہاں "میں" کی لے بہت تیز ہے جو اظہارِ ذات کا پتہ دیتی ہے۔ "اوبستان" کے بیشتر مضامین جیسے "درۂ موت"، "باسی ہار" اور "مراسفر" وغیرہ اُردو انشائیہ نگاری میں اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔

سید یوسف بخاری کی بیشتر تحریریں دہلی کے گرد گھومتی ہیں جن میں وہاں کے رسم و رواج، طور طریقے اور زندگی کے شب و روز کو بڑی خوب صورتی سے پیش کیا گیا ہے (یہ دلی ہے)۔ انھوں نے انشائیے بھی لکھے ہیں (بازگشت) جہاں موضوعات کو اپنی افتادِ طبع سے دیکھا گیا ہے۔ تجسس

رمزیت، برجستگی اور بات میں بات پیدا کرنا ان کے انشائیوں کی خصوصیات ہیں (ادبی چور، دلی کی سادہ کاری وغیرہ) اشرف صبوحی کے یہاں خالص دہلی کا لہجہ ملتا ہے۔ انھوں نے اپنی تحریروں میں زیادہ تر دہلی کے مُرقعے پیش کیے ہیں (دلّی کی چند عجیب ہستیاں) تاہم ان کے اندر چھپا ہوا انشائیہ نگار خاموش نہیں بیٹھتا اور ان کے قلم سے "مرزا چپاتی" جیسی تحریر لکھواتا ہے۔ یہ بظاہر ایک خاکہ ہے لیکن اس میں انشائیہ کے محاسن موجود ہیں۔ اشرف صبوحی چھوٹے چھوٹے جملے لکھتے ہیں جن میں برجستگی کے علاوہ فقرے کسنے کا فن چھپا ہوا ہے۔ مزاج کی شوخی و ظرافت کا مظاہرہ وہ کرداروں کے بیان میں کرتے ہیں ان کی انشائیت ان کی تحریروں میں حقیقت کے اظہار، شخصی ردِ عمل، مسرت بہم پہنچانے کی صلاحیت اور زبان و بیان کے بانکپن میں چھپی ہوئی ہے۔

خواجہ محمد شفیع بھی خالص دہلی والے ہیں اور شہرِ دہلی ہی کو انھوں نے اپنا موضوع بنایا ہے (دِلّی کی بولی)، وہ اپنی تحریروں میں دہلی کی بامحاورہ زبان استعمال کرتے ہیں۔ انھیں بات سے بات پیدا کرنے کا فن آتا ہے۔ الفاظ کی چستی، فقروں کی برجستگی اور اشعار کے استعمال کے علاوہ، محمد شفیع مکالموں کو زیادہ استعمال کرتے ہیں جس سے تحریر میں ڈرامائی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ ان کے یہاں انشائیت کم اور مرقع نگاری زیادہ ہے۔ بیشور دیال کے مضامین دہلی کی سماجی زندگی اور اس کے تمدن پر روشنی ڈالتے ہیں (عالم میں انتخاب دلی) انھوں نے انشائیہ نہیں بلکہ مضامین لکھے ہیں اس لیے ان کے یہاں انشائیت کی کمی ہے وہ سلوٹی نثر لکھتے ہیں جو سادہ اور بامحاورہ ہے اور سماجی اصطلاحوں کے بوجھ سے دبی ہوئی ہے۔

مرزا محمود بیگ کی تحریروں میں انکشافِ ذات، اختصار، مسرت بہم پہنچانے کی صلاحیت، اندازِ بیان میں بانکپن اور مرکزی باتوں سے کچھ ضمنی باتوں کا ذکر ملتا ہے (بڑی حویلی)۔ ان خصوصیات کے علاوہ وہ معمولی باتوں کو اپنے انشائیوں کا موضوع بناتے ہیں۔ انھیں چھوٹے چھوٹے بامعنی جملے لکھنے کا فن آتا ہے۔ دہلی کی بامحاورہ زبان کے استعمال میں ان کے یہاں برجستگی ہے، شوخی و ظرافت کو ساتھ لے کر وہ واقعات (یا آپ بیتی) بیان کرتے ہیں۔ سید عابد حسین نے روایتی انداز سے ہٹ کر انشائیے لکھے ہیں (بزمِ بے تکلف) انھوں نے بلیغ اشاروں کے ساتھ انکشافِ ذات کیا ہے۔ تحریروں میں طنز و مزاح کا بہترین امتزاج بھی ملتا ہے۔ موضوع کی طرف شخصی

ردِ عمل، حقیقت کا اظہار اور دعوتِ فکر جیسے انشائیوں کے فنی محاسن ان کے یہاں دیکھے جا سکتے ہیں
مکالموں کے استعمال سے ان کی تحریروں میں ڈرامائی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ محمد حسن نے بہت کم اور
بہت پہلے چند انشائیے لکھے تھے جن کی چمک دمک آج بھی محفوظ ہے لیکن ان کے اندر کا چھپا
ہوا انشائیہ نگار "عصری ادب" کے آڑے ترچھے آئینے' میں گاہے بگاہے دیکھنے کو مل جاتا
ہے۔ ان کی تحریروں میں جذباتی اندازِ بیان، موضوع کی طرف شخصی ردِ عمل اور چھوٹے چھوٹے
ترشے ہوئے جملے اپنی تمام معنویت کے ساتھ آتے ہیں۔ وہ موضوع کو داخلیت کے آئینہ
میں دیکھتے ہیں اور غیر رسمی انداز میں بعض اوقات اس پر خطرناک حد تک سنجیدہ ہو جاتے ہیں۔
ان کا اندازِ فکر فلسفیانہ ہے۔ بے ساختگی، جزیات نگاری اور بات سے بات پیدا کرنا بھی ان
کی تخلیقی کاوشوں کی خصوصیات ہیں۔ نرقت کاکوروی کا میدان مزاح ہے جہاں وہ طنز کے
نشتر بھی چلاتے ہیں۔ انھیں اپنا مذاق اڑانے اور سماج کی کمزوریوں پر ہنسنے کا فن آتا ہے۔
زندگی کے تلخ حقائق کو پیش کرنے کے لیے وہ مزاح کی بیساکھیاں استعمال کرتے ہیں۔ اظہارِ ذات
شخصی ردِ عمل اور زورِ بیان کی شکل میں ان کی تحریروں میں انشائیے کے ٹکڑے جگہ جگہ بکھرے
نظر آتے ہیں۔ وہ واقعات، لفظوں کے الٹ پھیر اور تضاد کی مدد سے مزاح پیدا کرتے اور اشعار
میں مرضی کے مطابق ردّ و بدل کر کے ان کی معنویت کو اپنی تحریر کا جزو بنا لیتے ہیں۔

اندر جیت لال نے مختلف موضوعات پر مختلف طریقوں سے لکھا ہے۔ ان کی کتاب "جانور
سے انسان تک" حال ہی میں شائع ہوئی ہے جو مزاحیہ مضامین، خاکوں اور انشائیوں کا مجموعہ ہے۔
انھیں موضوع کو شخصی تناظر میں دیکھنے کا سلیقہ آتا ہے لیکن توضیحی اور تجزیاتی اندازِ بیان اور
سپاٹ لہجہ ان کے انشائیوں کی انشائیت کو مجروح کر دیتا ہے۔ وہ اپنی تحریروں میں دل کے مقابلہ
میں دماغ سے زیادہ کام لیے ہیں اس لیے خارجی اثرات کا غلبہ بنا رہتا ہے ایک طرح سے ان
کے انشائیوں میں انشائیہ اور مضمون دونوں دست و گریباں نظر آتے ہیں۔ جاوید وششٹ
انشائیے کے مزاج سے بخوبی واقف ہیں۔ انھیں موضوع کو فنی معنویت کے ساتھ پیش کرنے کا نہ
صرف فن آتا ہے بلکہ اپنے مخصوص انداز میں وہ تلخ حقائق کا پردہ چاک کرتے ہیں۔ اُردو نثر میں
ان کا اپنا لہجہ ہے جس میں شوخی بھی ہے اور گرمی بھی۔ انھیں زبان و بیان پر قدرت حاصل ہے۔

معمولی سی معمولی بات قلم کی زد میں آ کر بڑی اہم بن جاتی ہے۔ حقیقت کا اظہار، شخصی ردِ عمل، غیر منطقی ربط،
اشاریت و رمزیت اور ایجاز و اختصار ان کی انشائیہ بچلیسی کی مجموعی خصوصیات ہیں۔ جوگندر پال
بنیادی طور پر فکشن کے آدمی ہیں۔ انھوں نے بہت کم انشائیے لکھے ہیں جن میں داخلیت کا اظہار اور
شخصی ردِ عمل ملتا ہے۔ وہ زندگی کے حقائق اور اس کے اندر چھپی ہوئی طبیعتوں کو اپنے مخصوص لہجہ
میں بیان کرتے ہیں جو بے حد گرم اور نرم ہے اور پر اسرار بھی۔ جوگندر پال کی پر اسرار معصومیت
اور بلیغ رمزیت ان کے فن کو منفرد بناتی ہے۔ عصرِ حاضر کی حسیت اور اس کی دکھتی رگوں پر انھیں
انگلیاں رکھنے کا فن آتا ہے۔ ذہنی ترنگ میں آ کر کبھی کبھی بڑے پتے کی بات کہہ جانا اِن کے
انشائیوں کی ایک اہم خوبی ہے۔

ضمیر حسن دہلوی نے بڑی گداز طبیعت پائی ہے۔ ان کے مزاج میں رچاؤ اور لہجہ میں شوخی ہے۔
وہ موضوع کو اپنی افتادِ طبع سے دیکھتے اور مزاح کی داخلیت سے محسوس کرتے ہیں، دہلی کی زندگی
کو دہلوی انداز میں پیش کرنا اور چھوٹے چھوٹے برجستہ، بلیغ جملوں سے ان میں جان ڈال دینا
ضمیر حسن کا کمال ہے۔ حقیقت کا اظہار، شخصی ردِ عمل، غیر منطقی ربط، زبان و بیان میں بانکپن اور
مسرت بہم پہنچانے کی صلاحیت ان کے انشائیوں کی خصوصیات ہیں۔ مجتبیٰ حسین نے نثر
میں خاکے، رپورتاژ، مضمون اور انشائیے وغیرہ سب ہی کچھ لکھے ہیں جن میں طنز اور خصوصاً مزاح
کی لے بہت تیز ہے۔ اس لیے وہ بنیادی طور پر طنز و مزاح نگار ہیں۔ ان کی انشائیہ کی طرف پیش
قدمی خوش آئند ہے۔ زندگی کے حقائق کو اپنی خوش طبعی سے اس طرح پیش کرتے ہیں کہ ہم چونکے
بغیر نہیں رہ سکتے۔ انھیں موضوع کے مخفی مفاہیم کو اجاگر کرنے اور بات سے بات پیدا کرنے
کا فن آتا ہے۔ برجستگی، رمزیت اور تضاد ان کی تحریروں کی چند اہم خصوصیات ہیں۔ حسن ثانی
نظامی کو انشائیہ کا فن ورثے میں ملا ہے۔ وہ موضوعات کو مزاح کی داخلیت سے محسوس کر کے
تخلیقی پیکر میں سلیقے سے ڈھالتے اور حقیقت کے اظہار میں مشاہدوں اور تجربوں سے کام
لیتے ہیں۔ ان کے انشائیے دعوتِ فکر دیتے اور مسرت بہم پہنچاتے ہیں۔ معین اعجاز انسانی زندگی
کے اندر چھپی ہوئی زندگیوں کو اپنی تحریروں کا موضوع بناتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے مضامین پر
مشتمل "ادب گزیدہ" میں انشائیت ہے لیکن اس کے رنگ دھندلے ہیں۔ وہ تحریروں میں

اپنی خوش طبعی سے مزاح کے پہلو نکالتے ہیں۔ ان کے یہاں طنز کی کاٹ بھی ہے۔ انشائیہ کے فنی محاسن کے اعتبار سے ابھی انہیں آگے آنا ہے۔

دہلی میں انشائیہ کی روایت اُردو میں انشائیہ نگاری کے آغاز سے ملتی ہے بلکہ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ دہلی ہی وہ سرزمین ہے جہاں اس مخصوص نثری صنف نے جنم لیا، پلی بڑھی اور پروان چڑھی۔ جیسا کہ پچھلے صفحات میں مذکور ہے۔ یہ صنف ماسٹر رام چندر، سر سید احمد خاں، محمد حسین آزاد اور میر ناصر علی وغیرہ کی ادبی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ اسے ہم اُردو انشائیے کے ارتقا کے ابتدائی مراحل کہہ سکتے ہیں۔ بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں حسن نظامی، فرحت اللہ بیگ، سید یوسف بخاری، خلیقی دہلوی اور آصف علی وغیرہ جیسے دہلی کے مشہور و معروف نثر نگاروں کے نام آتے ہیں جنھوں نے انشائیے کی ترویج و اشاعت میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ یہ سلسلہ کسی نہ کسی صورت میں ملک کی آزادی تک قائم رہتا ہے۔ تقسیم ہند کے بعد دہلی کے کئی ممتاز نثر نگار ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے، جیسے سید یوسف بخاری، اشرف صبوحی، خواجہ محمد شفیع وغیرہ جہاں وہ اپنے اس ادبی شغل کو جاری رکھتے ہیں باقی جو یہیں رہ گئے یا بعد میں سامنے آئے، انھوں نے انشائیہ کی صنف کو اپنی جودتِ طبع کا موضوع بنایا۔ ان میں مرزا محمود بیگ، مہیشور دیال، جاوید وششٹ، حسن ثانی نظامی اور سید ضمیر حسن دہلوی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ غیر دہلی والے جنھوں نے آزادی سے پہلے یا بعد میں اپنی علمی، ادبی، سیاسی یا معاشی ضرورتوں کے تحت دہلی کی سکونت اختیار کر لی تھی، ان میں مولانا ابوالکلام آزاد، سید عابد حسین، پطرس بخاری، فرقت کاکوروی، اندر جیت لال اور جوگندر پال وغیرہ اہم ہیں۔ ان ادیبوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے دہلی میں اُردو انشائیے کے ارتقا میں کئی گرانقدر اضافے کیے ہیں، یہاں محمد حسن، کمال احمد صدیقی، مجتبیٰ حسین اور معین اعجاز کے نام بھی ہماری خصوصی توجہ کے مستحق ہیں۔

موجودہ انتخاب میں شامل انشائیوں کو بحیثیت مجموعی پانچ حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا حصہ ماسٹر رام چندر، سر سید احمد خاں، محمد حسین آزاد، اور مولوی ذکاء اللہ کے انشائیوں کے اقتباسات اور میر ناصر علی دہلوی کے انشائیے پر مشتمل ہے۔ ان کی حیثیت خشتِ اول کی ہے اس لیے انھیں تبرکاً شاملِ کتاب کیا گیا ہے۔ دوسرے حصے میں انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی

کی شروع کی دہائیوں سے لکھنا شروع کرنے والے انشائیہ نگار آتے ہیں جو آزادی کے آس پاس یا اس کے بعد تک لکھتے رہے، مثلاً خواجہ حسن نظامی، فرحت اللہ بیگ، سید یوسف بخاری، خلیقی دہلوی اور آصف علی وغیرہ یہاں اشرف صبوحی اور خواجہ محمد شفیع کے نام بھی شامل ہیں جنھوں نے باقاعدہ انشائیے تو نہیں لکھے لیکن ان کی تحریروں میں زبردست انشائیت ہے۔ تیسرے حصے کا تعلق دہلی کے ان انشائیہ نگاروں سے ہے جنھوں نے انشائیے آزادی سے پہلے یا بعد میں لکھنا شروع کیے اور بعض کا یہ ادبی شغل آج بھی جاری ہے۔ ان میں مرزا محمود بیگ، مہیشور دیال، جاوید وششٹ، حسن ثانی نظامی اور سید ضمیر حسن دہلوی وغیرہ کے نام خصوصاً قابل ذکر ہیں۔ چوتھے حصے میں مولانا ابوالکلام آزاد، کرشن چندر، پطرس بخاری، فرقت کاکوروی، سید آوارہ اور سید عابد حسین وغیرہ آتے ہیں۔ یہ غیر دلّی والے ہیں جنھوں نے آزادی سے پہلے یا اس کے بعد انشائیے لکھنا شروع کیے اور ان کا سرزمین دہلی سے ایک تعلق خاص رہا ہے۔ پانچویں حصے میں ایسے انشائیہ نگار شامل ہیں جنھوں نے آزادی کے بعد انشائیے لکھنا شروع کیے اور آج کل دہلی میں مقیم ہیں: جیسے محمد حسن، اندر جیت لال، جوگندر پال، مجتبیٰ حسین اور معین اعجاز وغیرہ اس طرح دہلی میں اُردو انشائیے کی مکمل تصویر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔

ان انشائیوں کے موضوعات اخلاقی، سماجی، سیاسی اور خصوصاً دہلی کی تہذیبی زندگی کے گرد گھومتے ہیں جنھیں کہیں صوفیانہ اندازِ فکر سے دیکھا گیا ہے تو کہیں فلسفیانہ نقطۂ نظر سے۔ بعض میں جمالیاتی حس کی کارکردگی نظر آتی ہے تو چند ایسے بھی ہیں جن میں ایک مصلح کی آنکھ ہے جو حالاتِ حاضرہ کا جائزہ لیتی اور ان پر تنقید و تبصرہ کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ اکثر انشائیوں میں اندازِ بیان خوش طبعی کا تابع ہے جس سے عبارت میں شگفتگی اور لطافت بڑھ گئی ہے۔ انشائیوں میں طنز کی کاٹ بھی ہے۔ چند انشائیوں میں طرزِ بیان استعاراتی ہو گیا ہے جس سے معنی و مطالب کے نت نئے انداز ابھر کر سامنے آئے ہیں۔ بحیثیت مجموعی کتاب میں شامل انشائیوں کے اسلوب کو اطلاعی، صراحتی اور تخلیقی کہا جا سکتا ہے۔

دہلی میں اُردو انشائیوں کے اس مجموعے کی تیاری کے وقت مختلف باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ کوشش کی گئی ہے کہ اس انتخاب میں وہی انشائیے شامل کیے جائیں جن سے دہلی میں

اُردو انشائیوں کی سمت و رفتار کا اندازہ ہو سکے. جو دہلی کے مختلف انشائیہ نگاروں کے فن و اسلوب کی نمائندگی کر سکیں. یہاں فنی اعتبار سے کوئی نیا تجربہ ہوا ہو اور جن کی حیثیت معیاری ہو. اس لحاظ سے اگر دہلی کا کوئی انشائیہ یا انشائیہ نگار یہاں چھوٹ گیا ہو تو اُسے محض اتفاق سمجھنا چاہیے. انشائیوں کے انتخاب میں میں نے دہلی میں مقیم مختلف انشائیہ نگاروں سے رجوع کیا اور ان کا حکم بجا لایا. صاحب نظر حضرات کے مشوروں کو قدر و احترام کی نگاہ سے دیکھا اور ان پر عمل کیا اور مختلف لائبریریوں اور ذاتی کتب خانوں کے چکر لگائے کیونکہ یہاں پرانی تحریروں کو حاصل کرنا کار دارد ہے، تب کہیں جا کر تکمیل کی صورت نظر آئی. اس مجموعے میں آزادی سے پہلے کے چند انشائیہ نگاروں کو بھی شامل کر لیا گیا ہے. اس طرح اُردو انشائیے کے آغاز سے کر اب تک کی تمام کڑیاں مل جاتی ہیں جس کی مدد سے شہر دہلی میں انشائیے کی ابتدا، ارتقا، انتہا اور اس کے زوال کو ایک نظر میں دیکھا جا سکتا ہے. انتخاب کے آخر میں ایک ضمیمہ ہے. یہ دراصل انشائیے پر ایک سمپوزیم ہے جو ادیب' علی گڑھ کے انشائیہ نمبر' مرتبہ قمر رئیس ۱۹۵۹ء میں چھپا تھا. یہاں اس کی شمولیت اس لیے ضروری سمجھی گئی کہ عبد الماجد دریا آبادی، نیاز فتح پوری، اختر تلہری، سلامت اللہ خاں، محمد حسن، قمر رئیس اور احمد جمال پاشا جیسے دانشور اور صاحب نظر شرکا نے انشائیہ بحیثیت ایک انگریزی صنف اور اس کے فنی محاسن، انشائیہ، مضمون اور افسانے میں فرق اُردو میں انشائیے کی ابتدا اور نشو و نما اور اُردو کے چند اہم انشائیہ نگاروں پر بڑے بصیرت افروز انداز میں سیر حاصل بحث کی ہے جو ہمارے لیے مشعل راہ ہو سکتی ہے. اس کے علاوہ ہم اس ادبی صنف کے بارے میں آج سے تقریباً تیس سال پہلے کیا سوچ رہے تھے اس کا اندازہ بھی اس سمپوزیم سے لگایا جا سکتا ہے. اُردو میں انشائیے پر اپنی نوعیت کا یہ پہلا سمپوزیم ہے جس کا سہرا قمر رئیس کے سر جاتا ہے.

آخر میں اُن انشائیہ نگاروں کا شکریہ ادا کرنا میں اپنا خوشگوار فرض سمجھتا ہوں جن کے انشائیے اس مجموعہ میں شامل ہیں اور ان کا بھی ممنون ہوں جنھوں نے رجوع کرنے پر بلا تامل نہ صرف مجھے اپنے انشائیے عنایت کیے بلکہ ان کی اشاعت کی اجازت بھی مرحمت فرمائی.

محمد حسن، کمال احمد صدیقی اور خصوصاً قمر رئیس صاحبان کا بھی بے حد مشکور ہوں کہ انھوں نے اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں مجھے اپنے گرانقدر مشوروں سے نوازا اور ہر طرح سے میری اعانت کی. دوست احباب کا بھی انتہائی شکر گذار ہوں جو اس موضوع پر اکثر و بیشتر مجھ سے تبادلۂ خیالات کرتے رہے. اپنے شعبہ کے ریسرچ اسکالرز شریف احمد قریشی اور محمد ذکریا بھی میرے شکریے کے مستحق ہیں جنھوں نے کسی اعتبار سے اس مسودے کی تیاری میں میرا ہاتھ بٹایا.

نصیر احمد خاں

اگست ۱۹۸۹ء
جواہر لال نہرو یونی ورسٹی
نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۶۷

اُمید

ماسٹر رام چندر

"حب الوطنی ایک نیکی و نایاب ہے اور اس سے ہماری یہ مراد نہیں ہے کہ کوئی شخص اپنے ملک کو اس قدر عزیز رکھتا ہو کہ اس کو نہ چھوڑے بلکہ ہم حُبِ وطن اس کو کہتے ہیں جو ہمیشہ اس کی رفاہ اور بہبود کی طرف ہو اور اس کے فائدے کے واسطے جان و مال کا دریغ نہ کرے۔ بعض صاحب یہ کہیں گے کہ ایسی نیکی خیالی ہے۔ وہ وجود میں نہیں، لیکن یہ محض غلط ہے، بہت آدمی زمانہ سابق سے ایسے ہوئے ہیں کہ انھوں نے وطن کی بہبود کے واسطے اس قدر کوشش کی ہے کہ بیان نہیں ہو سکتا.....“

پہلا منظر

"اُمید"

سر سید احمد خاں

"وہ عجیب قوت جس کو ہم یاد کہتے ہیں ہمیشہ پیچھے دیکھتی رہتی ہے جب کوئی موجودہ چیز ہم کو شغل کے لیے نہیں ملتی تو وہ قوت پچھلی باتوں کو بُلا لاتی ہے اور اس کے فکر یا خیال سے ہمارے دل کو بہلائے رکھتی ہے۔ اس کی مثال جگالی کرنے والے جانوروں کی ہے کہ پہلے تو گھاس دانہ سب کھا لیتے ہیں اور جب سیر ہو چکتے ہیں تو ایک کونے میں بیٹھ کر پھر اُسی کو پیٹ میں سے نکال کر چباتے جاتے ہیں، جس طرح کہ یاد پچھلی باتوں کو خالی وقت میں ہمارے دل کے مشغلہ کو بلا لاتی ہے اسی طرح ایک اور قوت ہے جو آئندہ ہونے والی باتوں کے خیال میں دل کو مشغول کر دیتی ہے اور جس کا نام اُمید و بیم یا خوف و رجا ہے۔ انھیں دونوں قسم کے خیالاتوں سے ہم آئندہ زمانے تک پہنچ جاتے ہیں ۔۔۔"

گُلشن اُمید کی بہار

محمد حسین آزاد

"انسان کی طبیعت کو خدا نے انواع و اقسام کی کیفیتیں عطا کی ہیں۔ مگر زمین جس قدر تخم اُمید کو پرورش کرتی ہے۔ اُسی کثرت سے کسی کیفیت کو سرسبز نہیں کرتی۔ اور اور کیفیتیں خاص خاص وقت پر اپنا اثر کر رکھتی ہیں یا بمقتضائے سِن خاص عمروں میں ان کے اثر ظاہر ہوتے ہیں۔ مگر اُمید کا یہ حال ہے کہ جس وقت سے اس بات کی تمیز ہونے لگی تو حالتِ موجودہ ہماری خوش حالی یا بد حالی بھی ہو سکتی ہے۔ اُسی وقت اس کی تاثیر شروع ہو جاتی ہے۔ اُمید ایک رفیق ہمدم ہے کہ ہر حال اور ہر زمانے میں ہمارے دم کے ساتھ رہتی ہے۔ دم بدم دلوں کو بڑھاتا ہے اور سینوں کو پھیلاتا ہے خیالات کو وسعت دیتا ہے اور نئی نئی کامیابیوں کی ترغیبیں دیتا ہے۔ غرض ہمیشہ کسی نہ کسی خوش حالی کا باغ پیش نظر رکھتا ہے کہ یا اُس سے کوئی کلفت رفع ہو جائے یا کچھ فرحت زیادہ ہو۔ خدا کی نعمتیں اور ساری خوش نصیبی کی دولتیں حاصل ہو جائیں۔ پھر بھی یہ جادو نگار مصور ایک نہ ایک

ایسی تصویر سامنے کھینچ دیتا ہے جیسے دیکھ کر یہی خیال آتا ہے کہ بس یہ بات ہو جائے گی، تو ساری ہوسیں پوری ہو جائیں گی اور پھر سب آرزوؤں سے جی سیر ہو جائے گا....“

”آگ“

مولوی ذکاء اللہ دہلوی

”آگ ایک عجیب نامبارک اولاد ہے پیدا ہوتے ہی ماں باپوں کو کھا جاتی ہے۔ جن لکڑیوں سے پیدا ہوتی ہے انھیں کو جلا کر خاک کر دیتی ہے۔ اور آپ ماں باپ کو مار کر زندہ رہتی ہے۔ آگ ہی ہماری دشمن جاں سوز بھی ہے اور دوست دل افروز بھی۔ وہ گھر گھر مبارک مہمان ہے۔ مہربان دوست ایسی کہ ہماری راحت کے لیے ہمارے رنج و تکلیف کو دور کرنے کے لیے آسائش و آرام کے واسطے صدہا ضرورت زندگی کے رفع کرنے کے واسطے وہ سامان مہیا کرتی ہے ہمارے چولہے پر ناگری کرتی ہے۔ اپنے کندے جلا کر روٹی اور کھانا پکاتی ہے آگ ہی نے انسان کو پکانا سکھایا ہے جس کے سبب سے وہ اور حیوانوں سے ممتاز ہو گیا ہے جیسا کہ غناق حیوان ناطق کہلاتا ہے۔

ایسا ہی پرندہ حیوان کیونکہ کوئی حیوان اپنی ہنڈیاں پکانے کے لیے آگ پر نہیں چڑھاتا۔ یہ تو حضرتِ انسان ہی عقل کے بندے ہیں کہ پھونک پھونک کر آگ روشن کرتے ہیں اور اپنی خوراک پکاتے ہیں اور اس کی دھونی سے آنکھوں کو اذیت پہنچاتے ہیں۔۔۔۔

چرخ شعبدہ باز

میر ناصر علی

اساتذہ کے لٹریچر میں آسمان کا ذکر اس کے عدم و وجود کے ثبوت میں اس قدر نہیں جس قدر کہ اس کی شعبدہ بازیوں کا حال ہے اور آسمان کے عدم وجود سے مجھے بھی بحث نہیں لیکن اس کی شعبدہ بازیاں واقعی اس قدر مشہور ہیں کہ تمام دنیا کے مداری، بھان متی، بازی گر اس کے آگے کان پکڑتے ہیں۔ چرخ شعبدہ باز کا یہ ادنیٰ کھیل ہے کہ اس نے نیلے پٹارے میں سے جسے آسمان کہیے آغازِ عالم سے خدا جانے کتنے چٹے بٹے نکال چکا ہے اور نکالے چلا جائے گا۔ بڑے بڑے شعبدہ باز و نظر باز اس کے الٹ پھیر کو نہ سمجھ سکے۔ شعبدہ بازی کے کمال میں ہے کہ بچہ کو بوڑھا اور بوڑھے کو جوان بنا دیا تو گویا بہت بڑی بات کی۔ سو وہ بھی ایک آدھ کو اور دو چار بار چرخ شعبدہ باز کو ایک زمانہ گذر گیا کہ ہر بچہ کو بوڑھا کر کے دکھا رہا ہے مداری ایک شاخ سے درخت بنا کر دکھا دیتا ہے اور دور سے پھل بھی۔ مگر یہ پھل دور سے دیکھنے کے سوا اور کسی کام کے نہیں اور دیکھنا بھی چند ساعت کا۔ یہاں ایک رائی کے برابر دانے سے سر بفلک درختوں کے جنگل کے جنگل دیکھ لیجیے۔ بہار کو خزاں اور خزاں کو بہار کر دکھانا اس کا معمولی کھیل ہے تمام عالم کے درخت جو ابھی برگ و بار سے

عریاں تھے یا دیوانوں کی طرح کپڑے پھاڑ چکے تھے کہ بہار نے ایک بار کی سب کو سبز و سرخ جوڑے پہنا دیے۔ معمولی بازی گر مشکل سے آگ اور پانی کو اکٹھا کر کے دکھاتے ہیں، عالم اسباب نے نہ صرف آگ اور پانی کو بلکہ ہوا و خاک اربعہ عناصر[1] کو جمع کر کے بے گنتی پتلے بنا بنا کر دکھا دیے اور انھیں کو بگاڑ کر بنا تا چلا جاتا ہے ایک کو مارتا ہے تو دو کو جلاتا ہے دس دانے زمین دبا تا ہے تو سو اگاتا ہے بے جان سے جان دار پیدا کرتا ہے اور جان دار کو بے جان کر دیتا ہے۔

ایک شاخ سے دو پھول نکالتا ہے۔ ایک کو حسینوں کے گلے کا ہار بناتا ہے دوسرا قبر پر چڑھایا جاتا ہے آسمان کی وہی بارش جو انگور پیدا کرتی ہے اسی سے کنارے پیدا ہوتے ہیں چرخ کی ایک گردش دولابی[2] نے حضرت یوسف علیہ السلام کو بے قصور کنوئیں میں گرایا اسی آسمان کی کروٹ نے حضرت یوسفؑ کو عزیز مصر کر دکھایا اسی آسمان کی ایک کروٹ میں نادر، تیمور، چنگیز خاں و ہلاکو سی بے گنتی کٹ پتلیاں نکل پڑیں پھر ایسی غائب ہوئیں کہ مہ و خورشید کی عینک سے بھی نظر نہ آئیں۔

اور تماشے تو اگر دو چار دفعہ دیکھیے یا ایک ہی تماشہ دیر تک دیکھتے رہیے تو اجیرن ہو جاتا ہے برخلاف اس کے آسمان کی شعبدہ بازیاں ہمیشہ دل چسپ ہی دیکھ لیجیے۔ محبت کے افسانوں میں ابروئے خمدار کے مارے ہوئے اس قدر نکلیں گے جتنے کسی تاریخ میں تلوار کے مارے ہوئے نہ نکلیں گے چرخ نیلوفری نے ایسے رنگ بدلے ہیں کہ کسی رنگریز کے فرشتوں نے نہ دیکھے نہ سُنے۔

دنیا میں آج تک کسی نے نہ جانا کہ یہ تماشہ کب سے ہو رہا ہے اتنا دکھائی دیتا ہے کہ جس طرح مداری گولیاں اڑا کر ایک دو انگلی کے اشارے سے کہہ دیتا ہے کہ وہیں تھم جا۔ اس طرح زندگی ہے کہ دم بھر کو ٹھہری دکھائی دیتی ہے۔

چرخ کج رفتار، اس کی کج رفتاری کوئی نئی بات نہیں حسین ابھی اٹھلا کر چلتے ہیں اور ترچھے

---

[1] چار عنصر جن سے دنیا بنی ہے آگ، پانی، خاک، ہوا۔

[2] رہٹ کی سی حرکت جس سے انسان کبھی نیچے کبھی اوپر جاتا ہے۔

نہیں لگے مگر آسمان کی رفتار عجیب ہے کہ خدا ہی جانے کب سے یہ چال چل رہا ہے آج تک تھکا نہیں، نہ اس بات کے آثار ہیں کہ کبھی تھکے گا۔ خوبان جہاں نے ستم شعاری میں گو آسمان کی نقل تھوڑی بہت اڑائی مگر ان سے نبھی نہیں کہ زیادہ عمر ہوئی نہیں۔ اور جفا شعاری بے کار گئی نہیں۔ پیر گردوں کی عمر جس قدر زیادہ ہوتی جاتی ہے اس کی جفا پیشی میں کمی تو کیا ترقی ہی نظر آتی ہے۔

دنیا میں کوئی تماشہ اس قدر عبرت انگیز نہیں دیکھا جس قدر گردش دوراں کا۔ باغ میں بجلی اس وقت گرتے دیکھی جب کہ مرغ چمن نے خس و خاشاک سے آشیاں بنا کر ذرا آرام کرنے کا ارادہ کیا۔

صدا بھٹکا کیے آئے تو اس دم
جب آتش لگ رہی تھی آشیاں کو

کھیت پک کر تیار ہوا کہ ٹڈی آ پڑی۔ منزل دو قدم رہ گئی کہ پاؤں جواب دے گئے۔

لیکن سب سے بڑا تماشہ چرخ شعبدہ باز کا ہمارا مرنا اور قیامت کا اٹھنا ہے۔ میں اس کو تماشہ اس لیے سمجھتا ہوں کہ اہل نظر کی نگاہ میں یار کی ہر ادا پر مرنا ضرور ہے اور قیامت تو خرام ناز سے بپا ہوتے شاعروں نے ہزار بار دکھائی۔

عاقبت کا خیال مجھے اس لیے زیادہ پسند ہے کہ اگر واعظ نہ ہوا تو اس کو غلط سمجھنے کی حرکت کیسے ہے

گئی گر فصل گل ہے ابر موجود
ابھی کیا آپ میں آنے کے دن ہیں

چرخ کی شعبدہ بازیوں میں ایک خصوصیت ہے جو دُنیا کے اور شعبدوں میں نہیں، اور شعبدہ بازوں کے کھیل تماشے ختم ہونے پر لوگ ہنستے خوش ہوتے اُٹھتے ہیں چرخ شعبدہ باز کے جتنے کھیل تماشے ہیں سب کا انجام رونے پر ہے۔

کسی کی تمنا اگر بعد از خرابی بسیار بر آئی ہو تو کب کہ جب لطفِ آرزو نہ رہا۔ قیس کو جیتے جی لیلیٰ نصیب نہ ہوئی نعش پر ماتم کرنا قسمت میں لکھا تھا۔ شیریں کو فرہاد کی محبت کا جوش اس وقت ہوا جب کہ فرہاد سر پھوڑ چکا تھا۔ یوسفؑ کو زلیخا اس وقت یاد آئی جب کہ زلیخا اپنی

جوانی سے ہاتھ دھو بیٹھی تھی اور حضرت جامی نے اسے دوبارہ جوان بنایا مگر وہ بات پھر میسر نہ ہوئی کہ زنانِ مصر نے جو زلیخا کو عشقِ یوسف پر ملامت کرتی تھیں بے ہوشی میں اپنے ہاتھ کاٹ لیے اور خبر نہ ہوئی ؎

مستوں نے ترکِ مے کی قسم کھائی بھی تو کیا
توبہ کہاں وہ بات جو مستی چلی گئی !

صوفیائے کرام کا قول ہے کہ ازل میں سب سے پہلے حرفِ عشق پکارا گیا مجھے اپنے مضمون کی دھن میں خیال آیا کہ عالمِ اسباب میں مادرِ گیتی کے پہلے بچے کے کان میں اذان کی جگہ چرخِ شعبدہ باز نے یہ پھونک دیا کہ بڑے بڑے کھیل تماشے اور اپنا پٹارہ سامنے رکھ بیٹھا۔ اب دنیا ہے کہ دیکھنے چلی آتی ہے اور محوِ تماشہ ہے وہی آواز ہر شخص کے کانوں میں گونج رہی ہے۔

دوسرا منظر

جھینگر کا جنازہ

خواجہ حسن نظامی

میری سب کتابوں کو چاٹ گیا۔ بڑا موذی تھا۔ خدا نے پردہ ڈھک لیا افوہ جب اس کی لمبی لمبی دو مونچھوں کا خیال کرتا ہوں، جو وہ مجھ کو دکھا کر ہلایا کرتا تھا، تو آج اس کی لاش دیکھ کر بہت خوشی ہوتی ہے۔ بھلا دیکھو تو قیصر ولیم کی نقل اتارتا تھا۔

اس جھینگر کی داستان ہرگز نہ کہتا اگر دل سے یہ عہد نہ کیا ہوتا کہ دنیا میں جتنے حقیر و ذلیل مشہور ہیں، میں ان کو چار چاند لگا کر چمکاؤں گا۔

ایک دن اس مرحوم کو میں نے دیکھا کہ حضرت ابن عربی کی فتوحات مکیہ کی ایک جلد میں چھپا بیٹھا ہے۔ میں نے کہا کیوں رے شریر تو یہاں کیوں آیا؟ اچھل کر بولا ذرا اس کا مطالعہ کرتا تھا۔ سبحان اللہ۔ تم کیا خاک مطالعہ کرتے تھے، بھائی یہ تو ہم انسانوں کا حصہ ہے۔ بولا واہ۔ قرآن نے گدھے کی مثال دی ہے کہ لوگ کتابیں پڑھ لیتے ہیں مگر نہ ان کو سمجھتے ہیں اور نہ ان پر عمل کرتے ہیں۔ لہذا وہ بوجھ اٹھانے والے گدھے ہیں جن پر علم و فضل کی کتابوں کا بوجھ لدا ہوا ہے۔ مگر میں نے اس مثال کی تقلید نہیں کی۔ خدا مثال دینی جانتا ہے۔ تو بندہ بھی اس کی دی

ہوئی طاقت سے ایک نئی شان پیدا کر سکتا ہے اور وہ یہ ہے انسان مثل ایک جھینگر کے ہے جو کتابیں چاٹ لیتے ہیں سمجھتے بوجھتے خاک نہیں۔

یہ جتنی یونیورسٹیاں ہیں سب میں یہی ہوتا ہے۔ ایک شخص بھی ایسا نہیں ملتا جس نے علم کو علم سمجھ کر پڑھا ہو۔ جھینگر کی یہ بات سن کر مجھ کو غصہ آیا اور میں نے زور سے کتاب پر ہاتھ مارا جھینگر پھدک کر دوسری کتاب پر جا بیٹھا اور قہقہہ مار کر ہنسنے لگا۔ واہ خفا ہو گئے۔ بگڑ گئے۔ لاجواب ہو کر لوگ ایسا ہی کیا کرتے ہیں۔

لیاقت تو یہ تھی کچھ جواب دیتے۔ لگے ناراض ہونے اور دھتکارنے۔

ہائے کل تو یہ تماشا دیکھا تھا، آج غسل خانہ میں وضو کرنے گیا تو دیکھا بیچارے جھینگر کی لاش کالی چیونٹیوں کے ہاتھوں پر رکھی ہے اور اس کو دیوار پر کھینچے لیے چلی جاتی ہیں۔

جمعہ کا وقت قریب تھا خطبہ کی اذان پکار رہی تھی۔ دل نے کہا جمعے تو ہزاروں آئیں گے خدا سلامتی دے نماز پھر پڑھ لینا۔ اس جھینگر کے جنازے کو کندھا دینا ضروری ہے یہ موقعے بار بار نہیں آتے۔

بے چارہ غریب تھا۔ خلوت نشین تھا۔ خلقت میں حقیر و ذلیل تھا۔ مکروہ تھا۔ غلیظ سمجھا جاتا تھا۔ اسی کا ساتھ نہ دیا تو کیا امریکہ کے کروڑ پتی راک فیلر کے شریک ماتم ہو گے۔

اگرچہ اس جھینگر نے ستایا تھا۔ جی دکھایا تھا لیکن حدیث میں آیا ہے کہ مرنے کے بعد لوگوں کا اچھے الفاظ میں ذکر کیا کرو۔ اس واسطے میں کہتا ہوں۔

خدا بخشے بہت سی خوبیوں کا جانور تھا۔ ہمیشہ دنیا کے جھگڑوں سے الگ کونے میں، کسی سوراخ میں، بوریے کے نیچے، آبخورے کے اندر چھپا بیٹھا رہتا تھا۔

نہ بچھو کا سا زہریلا ڈنک تھا، نہ سانپ کا سا ڈسنے والا پھن۔ نہ کوے کی سی شرپر چونچ تھی نہ بلبل کی مانند پھول کی عشق بازی۔ شام کے وقت عبادت رب کے لیے ایک مسلسل بین بجاتا تھا اور کہتا تھا کہ یہ غافلوں کے لیے صور ہے اور عاقلوں کے واسطے جلوۂ طور ہے۔

ہائے آج غریب مر گیا۔ جی سے گزر گیا۔ اب کون جھینگر کہلائے گا۔ اب ایسا مونچھوں والا کہاں دیکھنے میں آئے گا۔ ولیم میدان جنگ میں ہے ورنہ اسی کو دو گھڑی پاس بٹھا کر جی بہلاتے

کو مری میں کی نشانی ایک یہی بیچارہ دنیا میں باقی رہ گیا ہے۔

ہاں تو جھینگر کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے۔ چیونٹیاں تو اس کو اپنے پیٹ کی قبر میں دفن کردیں گی۔ میرا خیال تھا کہ ان محکم پرستوں سے اس توکل شعار فاقہ مست کو بچاتا۔ ویسٹ منسٹر ایبے یا قادیان کے بہشتی مقبرے میں دفن کراتا۔ مگر جناب یہ کالی چیونٹیاں بھی افریقہ کے مردم خوار سیاہ وحشیوں سے کم نہیں۔ کالی جو چیز بھی ہو۔ ایک بلائے بے درماں ہے۔ اس سے چھٹکارا کہاں ہے۔

خیر تو مرثیے کے دو لفظ کہہ کر مرحوم سے رخصت ہو۔

جھینگر کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے
قیصر کا پیارا ہے اسے توپ پہ کھینچو

اے پروفیسر! اے فلاسفر!! اے متوکل درویش!!! اے نغمۂ ربانی گانے والے قوال۔ ہم تیرے غم میں نڈھال ہیں اور توپ کی گاڑی پر تیری لاش اٹھانے کا اور اپنے بازو پر کالا نشان باندھنے کا ریزولیوشن پاس کرتے ہیں۔ خیر اب تو چیونٹی کے پیٹ کی قبر میں دفن ہو جا۔ مگر ہم ہمیشہ ریزولیوشنوں میں تجھے یاد رکھیں گے۔

پٹنا

مرزا فرحت اللہ بیگ

دیوانہ را ہوئے بس است۔ اب اس مضمون کی حد تک دیوانہ تو آپ مجھے فرض کر لیجیے اور "ہو" اس تحریک کو سمجھ لیجیے جو مرزا عظیم بیگ صاحب چغتائی نے "پٹنے" کے متعلق کی ہے۔ ان کی یہ تحریک پڑھ کر مجھے جوش ہی تو آ گیا کہ اپنے کسی پٹنے کے واقعہ کو لکھ ڈالوں۔ مگر میری بد قسمتی دیکھیے کہ مہینوں تک سوچنے کے بعد بھی کوئی واقعہ یاد نہیں آتا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ مضمون نگار کے لیے "پٹنے" کی مشق کرنا بھی ایک لازمی امر ہے۔ یقین مانیے کہ اگر مجھے پہلے سے اس کی اہمیت معلوم ہوتی تو کسی نہ کسی طرح دو چار واقعات اپنے اوپر ضرور نازل کر لیتا۔ اب بھی میں نے بہت کوشش کی کہ خیر جب نہیں پٹے تو اب پٹ جاؤ۔ مضمون تو لکھ لو گے۔ مگر کیا کیا جائے کہ باوجود ایسی کارروائیاں کرنے کے جو ایک بھلے آدمی کے پٹ جانے کے لیے بالکل کافی ہو سکتی ہیں، میری یہ مراد کسی طرح بر نہ آئی۔ اب ایک ہی صورت رہ گئی ہے کہ مرزا عظیم بیگ صاحب یا کسی اور مزاحیہ نویس صاحب کو دعوت دی جائے کہ وہ یہاں تشریف لائیں تاکہ ان سے پالی میں ایک دو دو چونچیں ہو جائیں۔ اس کے بعد یقین ہے کہ میرا مضمون پورا نہ بھی ہوا تو انشاء اللہ ان کا مضمون ضرور

کمپلیٹ ہو جائے گا۔ اس لیے ؎

صلائے عام ہے یاراں نکتہ داں کے لیے

اے مرداں بکوشید تا جامہ زنان نپوشید۔

ہاں ایک شرط ہے اور وہ بڑی ٹیڑھی شرط ہے یعنی یہ کہ جو صاحب اس مضمون کی تلاش میں بجز چہ خود یہاں آئیں۔ وہ اپنے نجیب الطرفین ہونے کا باضابطہ رجسٹری شدہ سارٹیفکٹ لے کر آئیں کیونکہ میں کہے دیتا ہوں کہ میں کسی ایرے غیرے نتھو خیرے کے ہاتھ سے پٹنے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہوں۔ اس سارٹیفکٹ کے ساتھ ہی کسی ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کا دیا ہوا اجازت نامہ خود کشی بھی شریک رہنا چاہیے۔ کیونکہ ایک مزاجی کے ہاتھ کی مار کسی مارواڑی کی توند کی مار تو ہے نہیں کہ آواز تو کرے "دھن سے" اور چوٹ لگے کسی سڑے ہوئے تربوز کی بہر حال جو کوئی آئے وہ پوری طرح تیار ہو کر آئے اور ایسی شکل میں آئے کہ مرد اور عورت کی بآسانی تمیز ہو سکے تاکہ پٹ جانے کی صورت میں یہ نالہ و فریاد بلند نہ ہو کہ۔

ڈر موئے تو مرد ذات ہو کر "بیربانی[1]" پر ہاتھ اٹھاتا ہے۔

عربی کی ایک مشہور مثل ہے کہ "کُلُّ شَیءٍ یَرجِعُ اِلٰی اَصلِہٖ" جس کے معنی یہ ہوئے کہ اے لوگو کسی کام کو اختیار کرنے سے پہلے اس کی اصلیت کو معلوم کر لو[2]۔ اس لیے قبل اس کے کہ میرا چیلنج یا "مبارزت[3]" قبول کی جائے۔ میں مناسب سمجھتا ہوں کہ اس پٹنے کی ترکیب۔ اس کی تعریف اور اس کی تاریخ سے ہر کس و نا کس کو آگاہ کر دوں تاکہ جس طرح ارکان مذہب کو اچھی طرح سمجھ لینے کے بعد ان کی ادائی میں مزا آتا ہے۔ اسی طرح ہر وہ شخص جس پر پٹنے کا عمل ہونے والا ہے۔ بروقت وقوع واقعہ اس سے پوری طرح لذت اندوز ہو سکے۔

---

[1] جرمنی میں اس لفظ کا مترادف "فراین" ہے جس سے اردو کا لفظ فلاین نکلا ہے بیربانی کے معنی ہیں عورت۔

[2] یہ اس کمترین کا ترجمہ ہے اور خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ہم اس ترجمہ کرنے میں اپنے استاد مرحوم۔ مولوی نذیر احمد صاحب کے بھی ممنون احسان نہیں۔ ھذا من فضل ربی۔ [3] یہ خالص عربی لفظ ہے اس لیے ہر کس و ناکس آمد کا فر گردد۔ ملاحظہ غیاث اللغات طبع ششم مطبوعہ مطبع نولکشور واقع کانپور صفحہ ۲۹۳ سطر ۱۹

بس جاننا چاہیے کہ علم مجبوریات میں یہ ایک ٹھیٹ ہندی لفظ ہے اور قواعد اردو مولفہ مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن کی رو سے فعل متعدی مجہول یعنی یہ کہ اس فعل کا عمل ہمیشہ بے وقوفوں پر ہوتا ہے۔ اور یہ اسی قوم اور ملک کے لغات میں پایا جاتا ہے۔ جو کسی زبردست خاں کے زیر اثر ہوتا ہے یا ہوتی ہے یا ہوتے ہیں[1]۔ اردو کے علاوہ ہم خدا کے فضل سے فارسی اور عربی بھی جانتے ہیں۔ لیکن جہاں تک ہم کو معلوم ہے زبان فارسی میں ایسے معنی دینے والا کوئی مصدر نہیں ہے۔ وہاں اس کی بجائے لفظ "کشتہ شدن" استعمال ہوتا ہے کیونکہ جن ملکوں میں زبان فارسی رائج ہے وہاں ایسا کوئی بے غیرت نہیں ہوتا کہ سر بازار یا زیادہ سے زیادہ دیوار کی آڑ میں پٹے۔ اور پھر رسالوں میں اپنے پٹنے کی جوانمردی کا غلغلہ بلند کرے۔ وہاں جب پٹنے کی صورت پیش آتی ہے تو دو میں سے ایک "کشتہ شدن" ہو جاتا ہے۔ اب رہی عربی تو بھلا اس زبان میں یہ منحوس لفظ کیوں آنے لگا۔ بہادر عربوں نے اپنے ہاں ذرا پہلو بدل کر ایک مصدر "ضرب زید عمرو" ایجاد کیا ہے جس کے معنی ہیں کہ گا کوئی اور پیٹے گا وہی۔ یہ ایک وسیع المعنی مصدر ہے کہ ہر فاتح قوم نے اس کو اپنی زبان میں لے کر اس پر عمل کرنا شروع کر دیا ہے چنانچہ اب ہر فاتح قوم کی معمولی سے معمولی غلطی کا خمیازہ مفتوح "قومچہ[2]" کو اٹھانا پڑتا ہے۔ مثلاً میم صاحبہ سے پٹ کر اگر کوئی صاحب بہادر اپنا غصہ۔ بذریعہ ولایتی جوتے کے عمداً کسی قلی کے "بَینَ الصُّلبِ وَالتَّرائِب" پر اتاریں اور اس طرح وہ نالائق اپنی تلی پھٹ جانے دے۔ تو ایسی صورت میں اس ولایتی جوتے کا کوئی قصور نہیں ہے بلکہ سارا قصور اس تلی کا ہے جو ایک ٹھوکر کی

---

[1] یہاں مجھ کو اس مصیبت کا سامنا ہوا کہ "قوم" مونث ہے اور "ملک" مذکر۔ آخر اس جوڑے کے لیے فعل کیا استعمال کیا جائے۔ اس لیے میں نے بلحاظ قوم کے فعل مونث بلحاظ ملک کے فعل مذکر اور بلحاظ قوم و ملک کے فعل جمع استعمال کیا ہے اور میری رائے میں اس طریقہ سے زبان دانی میں تذکیر و تانیث کے جو جھگڑے ہیں وہ بآسانی مٹ سکتے ہیں۔

[2] قومچہ اسم تصغیر ہے۔ لفظ قوم کا جیسے صندوق سے صندوقچہ۔ کسی مفتوح ملک کے رہنے والوں کو حق نہیں ہے کہ وہ اپنے نام کے ساتھ لفظ قوم استعمال کریں۔ مفتی ہونے کے بعد وہ قومچہ رہ جاتے ہیں۔

بھی تاب نہ لا سکی۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں ہر مہذب ملک کی عدالت ضرب زید عمر والے حاصل مصدر کو پیش نظر رکھ کر یقیناً ولایتی جوتے اور ملزم دونوں کو بری کرے گی۔ یہ تو ہوئی "پٹنے" کی ترکیب۔ اب اس کے بعد اس کی تعریف لیجیے۔

فلسفے میں "پٹنا" اس مسئلہ کو کہتے ہیں جس کا صغریٰ جوتی اور جس کا کبریٰ لکڑی ہو۔ اور جس کا نتیجہ ٹانٹ کی صفائی نکلے خواہ وہ چکنائی کی صورت میں ہو یا بھنڈارہ پھوٹ جانے کی شکل میں سائنس میں اس کی تعریف کی گئی ہے کہ ایک جسم کے جوارح کی گردش سے ہوا کا جو تموج پیدا ہو کر دوسرے جسم پر ختم ہو۔ اور دوسرے جسم کی رنگت کو مائل بہ سرخی کر دے "پٹنا" کہلائے گا۔ طب میں "پٹنے" سے مراد جسم کا وہ ابھار ہے جو مومیائی کھائے اور ہلدی چونا ملے بغیر دفع نہ ہو سکے معاشرت خانگی میں یہ لفظ بوجہ کثرت استعمال تعریف سے مستغنی ہو گیا ہے اور ارتقاء تہذیب کے لحاظ سے گو اس کی صورتیں بدل جاتی ہیں مگر معنی میں تغیر نہیں ہوتا مثلاً اگر کسی پانسو پانے والے انگریز نما ہندوستانی کی جنٹلمین بیوی بازار سے ایک ہزار کا سامان ایک دم خرید لائیں تو گو تھرڈ کلاس لوگ اس کو ٹانٹ گنجی ہونا کہیں گے۔ لیکن مہذب سوسائٹی میں ہمیشہ اس واقعہ کا اظہار "پٹ جانے" سے کیا جائے گا بہر حال ہمارے روزمرہ کی زندگی میں یہ لفظ ایسا عام ہو گیا ہے کہ امیر ہو یا غریب۔ شریف ہو یا رذیل۔ موٹا ہو یا دبلا۔ لمبا ہو یا ٹھنگنا۔ کالا ہو یا گورا۔ اس کے استعمال سے پوری طرح واقف ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ شریفوں میں اس "پٹنے" کے اثرات میاں پر اور رذیلوں میں بیوی پر زیادہ نمایاں ہوتے ہیں۔ اور زمانہ موجودہ کی تہذیب میں انہی مائل بہ سرخی اثرات کو دیکھ کر انسان کی شرافت اور رذالت کا تعین کیا جاتا ہے۔

تحقیق لغت کے لیے لازمی ہے کہ اس لفظ کے متعلق یہ بھی غور کیا جائے کہ اس کی ابتدا کیونکر ہوئی ہے لفظ "پٹنا" میں "نا" تو مصدر کی علامت ہے۔ اب رہ گیا "پٹ" تو اس کے متعلق ماہر لسانیات کی یہ رائے ہے کہ یہ اسم صوت ہے اور یہ وہ آواز ہے جو کسی چپکنی یا دستپنا میاں کی کمر پر پڑنے سے پیدا ہوتی ہے۔ اور چونکہ متمدن انسانوں میں یہ آواز اکثر گھروں سے آیا کرتی تھی۔ اس لیے دوسروں کو اس واقعہ کی اطلاع دینے کی غرض سے اس آواز کو مصدر کی شکل بنانا پڑا۔ تاکہ لفظ "پٹنا" کے کہتے ہی سننے والوں کو معلوم ہو جائے کہ فلاں گھر میں چپکنی اور کسی

جسم انسانی کا اتصال ہو رہا ہے یا ہو چکا ہے۔ اس کے بعد اس لفظ نے عمومیت کی شکل اختیار کی اور ہر ایسی کارروائیوں کے متعلق جو دو ہستیوں میں اختلاف ہو جانے کی صورت میں رونما ہوتی ہیں اس کا استعمال ہونے لگا۔

اگر اس لفظ کی تاریخ کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ انسان کچھ پٹنے ہی کے لیے پیدا ہوا ہے۔ بچپن میں رونے پر پٹتا ہے۔ لڑکپن میں نہ پڑھنے پر پٹتا ہے۔ جوانی میں شادی کر کے پٹتا ہے۔ بڑھاپے میں دادا۔ نانا بن کر پٹتا ہے اور کہتے ہیں کہ مرنے کے بعد اس پٹنے کا سلسلہ مختلف وجوہ اور نئی نئی شکلوں میں جاری رہنے والا ہے جہاں تک منقولی شہادت مل سکتی ہے اس سے ثابت ہے کہ پٹنے کی ابتداء ایک بڑے فرشتے سے ہوئی ہے یعنی سب شاگردوں نے مل کر اپنے استاد کو ٹھونک دیا۔ اس سے دو نتیجے نکلتے ہیں۔ اول یہ کہ استاد جو شاگردوں کو پیٹتے ہیں تو وہ درحقیقت اسی گستاخی کا بدلہ لیتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ اگر کوئی شاگرد اپنے استاد کو مار بیٹھے تو اس کا یہ فعل قابل ملامت نہیں بلکہ قابل ستائش ہے۔ کیونکہ ایسا کرنا افعال انسانی سے بڑھ کر فرشتوں کا فعل ہو جاتا ہے چنانچہ اس لحاظ سے میں بھی ایک دفعہ فرشتہ بن چکا ہوں۔

میں مڈل میں پڑھتا تھا۔ ہمارے حساب کے ماسٹر صاحب ترقی پا کر دوسری جگہ چلے گئے اور ان کی جگہ ایک دوسرے حضرت تشریف لائے نام تو ان کا برکت رام تھا۔ لیکن مدرسہ میں بلحاظ اپنی چگی ڈاڑھی کے برکت اللہ کہے جاتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ایسی ننھی سی ڈاڑھی سے طالب علم کیوں ڈرنے لگے۔ ان کا گھنٹہ شروع ہوا۔ اور کلاس مکتب بن گئی۔ برابر ہی ہیڈ ماسٹر کا کمرہ تھا۔ وہ تھے صاحب بہادر اور بڑے کڑوے مزاج کے آدمی۔ دو ایک روز تو ذرا چپ رہے مگر جب اس ہوتق کا سلسلہ گھٹنے کی بجائے بڑھتا ہی گیا۔ تو ایک دن صاحب نے برکت اللہ کو بلا خوب ڈانٹا۔ یہ غصے میں بھرے کلاس میں آئے۔ جاتے وقت ایک سوال دے گئے تھے۔ ہم نے حل کر لیا تھا۔ ان کے کمرہ میں قدم رکھتے ہی ہم نے بنچ سے اٹھ خوشی خوشی جا سلیٹ ان کے سامنے کر دی۔ یہ نٹ دئے تو تھے ہی آؤ دیکھا نہ تاؤ زور سے ایک پڑ رسید کیا۔ ہم روز ازل سے استادوں کو مارنا سیکھے ہوئے تھے۔ ادھر انھوں نے ہم کو پڑایا۔ اور ادھر برکت اللہ کے

پیٹ میں اس زور سے مُکا پڑا کہ بچارے پیٹ پکڑ کر وہیں بیٹھ گئے۔ یہ کچھ نہ پوچھو کہ اس کے بعد کیا ہوا۔ دریافت ہوئی۔ شہادتیں لی گئیں اور جو فیصلہ آسمان پر ہوا تھا۔ وہی زمین پر ہوا یعنی فرشتے اپنی جگہ رہے اور ان کے اُستاد نکالے گئے۔ خیر یہ تو ایک واقعہ معترضہ تھا۔ اب اصلی بحث کو لیجئے۔

تاریخ سے یہ پتا نہیں چلتا کہ میاں بیوی میں اس "ٹپے پٹانے" کا آغاز کب سے ہوا نسل انسانی کے ابتدائی خانگی تعلقات کے متعلق کوئی صحیح روایت ہم تک نہیں پہنچی ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ بعض واقعات ایسے پیش آئے ہیں کہ شریف سے شریف انسانوں میں بھی۔ اس پر خانہ جنگی ہو جانا۔ ایک لازمی امر ہے۔ سب سے بڑا جھگڑے کا جھونپڑا تو وہی جنت والا معاملہ تھا۔ آپ خود ہی غور کیجیے کہ کسی میاں کے رزق کا دروازہ اگر محض بیوی کی غلطی سے بند ہو جائے تو ان حضرت کو کیا کچھ تاؤ نہ آئے گا۔ اور فطرت انسانی کا لحاظ کرتے ہوئے۔ اس تاؤ کا نتیجہ کیا کچھ نہ نکلے گا۔ جھگڑے کے دوسرے مواقع ان کے ہاں اولاد پیدا ہونے کے بعد سے پیش آنے لازمی تھے اور ضرور پیش آئے ہوں گے۔ کیا ہمارا مشاہدہ نہیں ہے کہ جس گھر میں دو بچے بھی ہوتے ہیں وہاں جس بچے کو میاں چاہتے ہیں۔ اس کو بیوی نہیں چاہتیں اور جس کو بیوی چاہتی ہیں اس کو میاں نہیں چاہتے۔ اور یہی "اختلاف" چاہیت" اکثر خطرناک صورتیں پیدا کر دیتا ہے۔ پھر بھلا جس گھر میں دن کو ایک اور رات کو ایک بچہ پیدا ہوتا ہوگا۔ وہاں اراکین خاندان مشترکہ میں کیا کچھ "اختلاف[1]" نہ ہو گیا ہوگا۔ لیکن چونکہ اس مادہ میں کوئی عینی شہادت نہیں ہے اس لیے اس

---

[1] یہاں لفظ اختلاف تلمیحاً استعمال ہوا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ میرے چھوٹے بھائی صاحب بڑے غصیلے ہیں۔ انھوں نے ایک گھڑی ساز کو گھڑی بننے کو دی۔ وہ تھے بڑی لمبی ڈاڑھی والے اس لیے وعدہ کی پابندی ان پر لازم نہ تھی۔ ہزاروں تقاضے کئے گئے مگر اللہ کے بندے نے نہ گھڑی واپس دی اور نہ بنائی۔ ایک دن آ بگڑی اور ہمارے بھائی صاحب نے ان کو خوب ٹھوکا خیر اچھا کیا مگر سوال یہ ہے کہ بلا ضرورت ان کی ڈاڑھی کا کچھ حصہ نوچ کر گھر کیوں لے آئے۔ چند ہی روز کے بعد مجھے بھی گھڑی بنوانے کی ضرورت ہوئی ان کے ہاں گیا ایک روز یہ گھڑی ساز صاحب فرمانے لگے کہ (باقی صفحہ دیگر پر)

پر عقل کرائی کرنی اور قیاس سے کام لینا اصول درایت کے خلاف ہے۔ مگر پھر بھی اس سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ خانہ جنگی کا تخم ہماری فطرت میں ابتدا ہی سے بویا گیا ہے اور بات بھی یہ ہے کہ گھر میں اگر اس قسم کی دانا کلکل نہ ہوئی تو وہ گھر کا ہے کا ہوا۔ قبر ہو گیا۔

اس کے بعد سے "ٹپنے" کے متعلق تاریخی شہادت برابر ملتی چلی جاتی ہے چنانچہ اس بارے میں پہلا تاریخی واقعہ ہابیل اور قابیل کا جھگڑا ہے۔ یہ تو معلوم نہیں کہ اس جھگڑے کی وجہ کیا تھی۔ اور عموماً جھگڑے کی وجہ معلوم بھی نہیں ہوتی۔ اور اگر معلوم ہوتی بھی ہے تو وہ اکثر غلط ہوتی ہے۔ لیکن اس واقعہ سے جس کی لاٹھی اس کی بھینس "کا مصدر عالم وجود میں آ گیا اس کے بعد کے واقعات اگر معلوم کرنے اور اس مصدر کے مشتقات دیکھنے ہوں تو ملاحظہ ہو تاریخ عالم مؤلفہ مولوی فطرت اور مسٹر ضرورت۔

اس قدر سننے اور سمجھنے کے بعد ہے کوئی باہمت جو میرے سامنے میدان میں آئے اور نعرہ لگائے کہ

منیژه منم دخت افراسیاب
برہنہ ندیدہ تنم آفتاب

(بقیہ صفحہ سے آگے) ______ میاں وہ جو گورے صاحب آپ کے ساتھ رہتے ہیں کیا وہ آپ کے بھائی ہیں؟ میں نے کہا جی ہاں کہنے لگے وہ تو بڑے اچھے آدمی ہیں۔ مجھ سے بہت دوستی ہے ہاں ایک دن ہمارا ان کا کچھ "اختلاف" ہو گیا تھا۔ اہل زبان نوٹ کر لیں: شرفا کی زبان میں بری طرح پٹنے کے لیے لفظ اختلاف استعمال ہوتا ہے۔ ہذا من کثر الدقائق۔

درۂ موت

مولانا خلیقی دہلوی

• موت کا ہمیشہ کھلا ہوا دروازہ • ابتدائے عالم کے دوسرے ہی لمحے سے شاید کھول دیا گیا ہے اور اب اس کے بند ہونے کے متعلق وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ کب ہوگا لیکن یہ امر مسلّم ہے کہ لاکھوں ہی اس راہ سے گزر گئے اور جو باقی ہیں۔ ان سب کو بھی اسی راستے سے گزرنا ہوگا مبہم اور واضح معیّن اور غیر معیّن ہزاروں باتیں اور لاکھوں دلچسپیاں ہیں جو اسی راہ گذر سے اس کنارے سے وابستہ بیان کی جاتی ہیں اور صورت حال یہ ہے کہ جو ادھر سے اُدھر گیا، پھر لوٹ کر نہیں آیا۔ کاش کہ کوئی تو پلٹ کے آتا۔ اور ہمیں اپنے مشاہدہ و سیر کے افسانے سناتا جس سے ہم قطع مسافت کی دقتوں و مصائب کی لذتوں، اور منازل کی صعوبتوں کا اندازہ کر سکتے کسے معلوم ہے کہ وہاں گرمی ہے یا سردی کیسی مخلوق بستی ہے، وہ کچھ کھاتے پیتے ہیں یا نہیں۔ ان کی بولی کیا ہے، کس چیز کی قدر کی جاتی ہے۔ وہ کیا شے ہے جس سے سب کو نفرت ہے۔ اگر اس کا کچھ ٹھیک ٹھیک پتہ چل جاتا تو زاد راہ کی فراہمی، سامان کی ترتیب اور مسافرت کے لوازم دنیاوی میں بہت مدد ملتی۔ اب وہی اکابر امم ہیں جنھوں نے اپنے ملکات روحی اور حدت ایمانی سے اس راہ کے متعلق کچھ

اطلاعیں دی ہیں۔ وہی ہمارا جغرافیہ ہے، وہی ہماری تاریخ اس سے تقسیم منازل کا پتہ لگتا ہے اور اسی سے صورت قیام معلوم ہوتی ہے۔ مسافرت کے لوازم۔ اور اس دیار کے رسم و رواج کی کچھ سن گن لگتی ہے تو بھی اسی سے اور یہی ہمارا دین و ایمان ہے۔

انسانی حیات کی تکمیل طفلی، شباب اور کہولت کے تین درجوں پر موقوف ہے جب انسان آخری درجہ طبعی کو طے کر لیتا ہے تو اس کے امتحانِ فراغت کی گھڑی آجاتی ہے۔ امتحان گاہ تک پہنچنے کے لیے اجل کے دروازے سے گذرنا ناگزیر ہے اور ایک بھی راہرو آخرت ایسا نہیں جو اس راہ سے نہ گزرا ہو۔ انسان کا اس عالم کے مختصر سے قیام کے بعد جو قدم اس سمت کو اٹھتا ہے وہ یکسر بیم و رجا سے معمور ہوتا ہے اور یہی دھڑکا جان کے ساتھ لگا رہتا ہے کہ دیکھیے کہ پہلی منزل میں کیا کچھ بیت جائے۔ ملک اجنبی ہے۔ طور و طریق قیام سے ناواقفیت ہے۔ زبان اور آداب سے بیگانگی ہے پھر مسافر غریب کی بے سروسامانی۔ اس کے پاس۔ تو کچھ ہے بھی نہیں۔ ہاں عمل کے چند کھوٹے سکے ہیں۔ جو اس دنیا میں تو مکر و فریب سے چلتے رہے اور جعل نہ کھلا۔ اب خدا جانے وہاں بھی ان کا چلن ہے یا نہیں۔ اس کے بعد زاد راہ۔ بس سے کچھ اور بھی اگر ہے تو ایک فرد حساب ہے اس کی بھی یہاں جانچ پڑتال نہ ہو سکی۔ ادھر دیکھیے اس کا کیا لکھا پورا ہوا۔

جانے والوں میں سے ایسے لوگ، جنھوں نے اسباب سفر کچھ پہلے سے باندھ رکھا تھا پھر بھی کچھ نہ کچھ پوچھ گچھ کر ساتھ لے ہی گئے۔ مگر ایسے نادان جو کاروبار اور علائق میں مصروف و منہمک ہے وہ تو اچانک طلب پر دفعتاً چل کھڑے ہونے پر مجبور تھے۔ اللہ! ان کے ساتھ کیا گذرے گی؟

ہائے وہ غافل اور مست ہوس انسان، جس کی زیست کا سارا زمانہ لہو و لعب میں گزرا۔ جس کی بساط حیات نسیاں کی گل کاریوں سے حلقہ فریب بنی رہی۔ اس نے ایک لمحہ کے لیے بھی نہ سوچا کہ اس کی یہ ریشمی ڈوری انجام کار اسی کے گلے کا پھندا بنے گی۔ درہم و دینار کے ظرف بجائے مفرح شربت سنہرے ساغروں میں اڑتے رہے۔ اس کی خبر بھی نہ لی کہ اجل کے جام تلخ سے اس کے لب و حلقوم کے ذائقے بدل جائیں گے اور اس آب آتشیں کو بھی پینا پڑے گا جس سے قضا کے اسہال لگ جاتے ہیں۔

بُرے اعمال کی فتنہ سامانیاں، وہ بھی وقت تھا جب کہ پری پیکر بھوت کی طرح سر پر سوار

تھی مئے ومطلوب کی جلوہ فرمائیوں سے ہوش و مزط کی آنکھیں چندھیائی ہوئی تھیں۔ دماغ معطل تھا اور فکرِ عاقبت کافور پھر جب عیش کا دور ختم ہوا اور بزمِ شب کی سحر ہوئی۔ تو لیلائے حیات بھی ردا چاک تھی۔ نہ رخنہ کوئی رفو کے قابل تھا اور نہ دھبہ کوئی دھلنے کے لائق نفس کے جس تار کو دیکھیے ٹوٹ جانے پر آمادہ پیراہنِ زیست کے جس داغ کو دیکھیے چھوٹنے سے بیزار زیست کا احساس ہے کہ روح میں سوئیاں بھونک رہا ہے۔ عمل کی ندامت ہے کہ دل وجگر میں بجلیاں تڑپا رہی ہیں۔ اس رستخیز بلا میں "شباب گریزپا" پر جو نہ گزر جائے کم ہے اب یہ رو تھے کرنے، رونے کرنے عشرت کے خمیازے کو جھیلے بغیر چارہ نہیں۔

او منچلے نادان! تیری شوخیاں، سرمستیاں اور بے باکیاں گنہگار نگاہوں میں کس قدر محبوب تھیں۔ مگر تجھے معلوم نہ تھا کہ پایان کار یہ سب باتیں، یہ ساری ادائیں، بے ادبیوں، گستاخیوں اور سرکشیوں کا عنوان بن جائیں گی اور قانونِ ادب کی زبان ان کو معصومیت کے نام سے تعبیر کریں گی پھر معصیت اپنے ارتکابِ عمل کے بعد لاکھ سرنگوں اور شرمسار اپنے آپ کو پیش کرے اور عالمِ رنگین کے نقش ونگار سے ہزار منہ پھیر پھیر کر بیٹھے، پر عصمت کی وہ آب کہاں! معصیت پھر معصیت ہے اور پاداش، اس کا ثمر لازمی ہے ہاں وہ کروڑ تاسف کیا کرے مایوسیوں کی ماتم داری اور بیچارگی کی نمائش کرتی رہے مگر اس کی کوئی پرسش اور وقعت نہیں، مکافات کے قانون کا فیصلہ اٹل ہے اور لغزشِ عمل کی سزا بھگتنا ناگزیر ہے۔

دنیائے احساس جہاں قدم قدم پر ایمان اور ضمیر کی فرمانروائی ہے جس کے حضور کے ہر ذرہ میں تصدق کی روح بڑی جگمگا رہی ہے۔ حقیقت میں ایسے ہی قدسی نفوس انسانوں کا ملجا امن ہے جو رات اور دن تاریکی اور روشنی، برائی اور بھلائی میں تمیز کا وقوف رکھتے ہیں، جن کا مبارک کام یہ ہو کہ وہ راہ سے بھٹک جانے والوں کو ٹھکانے تک پہنچائیں ..... بہک جانے والوں کو سیدھی راہ سجھائیں پھر کون ہے جو مجاہدِ حق، کے اس محمود مسلک کو بہ نظرِ استحسان نہ دیکھے گا اور کس کی عقل ہے جو حق وصداقت کے اس ممدو معاون محترم وجود کے لیے کوئی بخشش، اور حیلہ نہ تسلیم کرے لاریب کہ باوقعت وذی عزت وذی ہستیاں ہیں جو امر بالمعروف کے علم بردار اور نہی عن المنکر کے لیے بشکل تادیب وسرزنش ہیں احتساب ان کی انسانیت کا اولین فرض، اصلاحِ مفاسد کا

مادہ ان کا مایۂ خمیر اور برائیوں کی پرچول ان کی گھٹی۔ جہاں کسی سے جرم صادر ہوا یہ دارو گیر پر مستعد۔ جب کوئی خطاکاری پر بری ہوا۔ اس کے قلع وقمع پر آمادہ۔ پس شرف اس عالم میں اگر کسی کو بے توان ہی کو اور آخرت کی بزرگی بھی اگر کسی کے واسطے ہے تو ان ہی کے لیے خطا کار غلطیاں کرتے ہیں ٹھوکریں کھاتے ہیں اور تماشہ دیکھتے۔ برائت یے نت نئی منطق چھانٹتے ہیں، قوتِ تعقل دلیل کی آڑ پیدا کرتی ہے لیکن یہ امر مسلم ہے کہ مرتکبِ جرم کی خفت وتذلیل وسزا وتعزیر لازمی ہے وہ اس دنیا میں بھی ذلیل عمل ہے اور آخرت میں بھی رسوا انجام۔ پس اس کی ہر ایسی تلاش بیکار ہے۔ اس کی ہر ایسی تاویل بے سود ہے اور اس کی ہر ایسی فریب خوردہ پناہ ہے۔ بے در و دیوار کا ایک مکان ہے جس میں کون راحت سے رہنے کا ارادہ کرے۔

انسانی اعمال کا سیاہ نامہ ہر لحظہ وقعت تحریر و نگارش ہے اور افسوس اس کو ایسی منشیانہ قوت لکھتی ہے جس کی عبارت مختصر ہے اور جامع جس کا انداز رقم محمود ہے و مسلم جس کے آگے نہاجنی ڈھانچے پہونچے مگر سب گرد، جو شارٹ ہینڈ رائٹنگ سے زیادہ زود نویس جس کی سطریں طویل تر احوال کا خلاصہ اور جس کے فقرے طوالت کا نچوڑ ہیں۔ پھر ایسے چابک دست کاتبِ اعمال کے آگے ہمارے روزنامچے کی کیا چیز پیش کی جائے گی؟ یہ حکمت اندازیاں اور کذب آمیز سخن سازیاں، سب دھری رہ جائیں گی، اور نفسِ امارہ نے جس قدر ستم اور چوریاں کی ہیں ان کو جب میزانِ تنقید پر رکھا جائے گا، تو حساب کی پول کھل جائے گی۔ ہمارے فریب کے جوڑ توڑ اور مکر کے سلسلے ہمارے حق میں زنجیرِ ملامت اور طوقِ لعنت بن کر آئیں گے!

وہ خراب، فسق، جس نے خدائے بزرگ وبرتر کی پاک زمین کے گل بوٹوں کو غارتِ پامالی کیا ہے جس نے چمنستانِ عالم کے سبزۂ آسودہ عصمت کو نفسِ شریر و گستاخ کی چراگاہ سمجھا ہے کیا وہ مطمئن ہے کہ اس کو تاراجِ گل وتباہی غنچہ کا حساب نہ دینا پڑے گا؟ چپہ چپہ گلشنِ دہر کا، کڑا کڑا باغِ دنیا کا، جب اپنی مظلومی کی داستان اس کے خلاف سنائے گا تو کیا اس کو چھوڑ دیا جائے گا؟

وہ لعین شرکت جس کو مادیت کی کثرتِ جلوہ نے نخول چشم بنا دیا ہے اس کے لیے یہ دو رنگی ملبوس کے نت نئے رنگ کب تک! رفع ذہل کے یہ تھکنڈے کہاں تک ساتھ دیں گے؟ من مانے معبودوں کی خدائی تابہ کے؟ یہ دیکھ لینا! ایک جرم کی دو دو سزائیں بھگتنی پڑیں گی

نہ چھوٹے گا۔ وہ دن سر پر کھڑا ہے جب انانیت کا طلسم ٹوٹے اور تیری بے بضاعت تعلّی اور بانکپن رو پڑے۔

کیسے مطمئن اور شاد ہیں وہ لوگ جنھوں نے سیدھی اور سچی راہ اختیار کرلی۔ دنیا میں سب سے زیادہ کٹھن منزل موت ہے اور دنیا میں ہزاروں مرتبہ یہ تماشہ دیکھ لیا ہے کہ جب کسی رضائے الٰہی کے بندے کو یہ نوبت آئی ہے تو وہ نہایت مسرت، سکون، نہایت تصدیق کے ساتھ روح کی امانت کو اجل کے سپرد کر دیتا ہے اس کے قلب سے ایک ایمانی روشنی نکلتی ہے جو سکرات کی تلخیوں اور نزع کی پُرظلمت تکلیفوں کو بہت جلد لذت و راحت سے بدل دیتی ہے اور یہ مسافر ہنستا کھیلتا اس راہ سے گذر جاتا ہے۔ موت کی ہیبت ناک صورت اپنی طاقت شعار کو ذرا بھی تو ڈراونی نہیں لگتی۔

برخلاف اس کے وہ پانی جس کے گھونٹ میں میل ہے وہ مسافر جس کے ہاتھ میں چوری کا سامان ہے کبھی اطمینان کے ساتھ راستہ طے نہیں کر سکتا جب پرسش و تفحص کی گھڑی پیش آتی ہے تو اس کے دل کی دھڑکن غیر معمولی طور پر بڑھ جاتی ہے یہ جوان ہمت بھی مشہور ہو مگر ایسی ساعتوں میں بچوں کی طرح بے بس و بے کس نظر آتا ہے، خوف کے مارے اس کے حواس خراب ہو جاتے ہیں وہ ڈر جو سیاہ کاری کی وجہ سے پیدا ہو جاتا ہے انسانی روح کے لیے ایک جونک ہے جو آہستہ آہستہ مسرت و اطمینان کے سارے خون کو چوس لیتی ہے اور وہ خوف جو بر بنائے مآل اندیشی پیدا ہو جائے وہ دنیا میں ہزاروں نیک اعمال کا محرک ہے اور اس سے بڑھ کر تفرع و انکسار کے پیدا ہونے کی کوئی اور صورت نہیں۔ مگر آہ! گناہ گار کا خوف وہ خوف ہے، جو اڑیاں رگڑوا رگڑوا کر انسان کو ہلاک کر دیتا ہے۔

دنیا میں مذاہب نے جو تعلیم اخلاق اور حق پرستی کی دی ہے اس میں اگر فلاح مرکوز ہے تو ابن آدم ہی کی ہے۔ تعجب ہے کہ اگر ایسے الہامی صحیفوں اور آسمانی کتابوں کے ارشاد و ہدایت سے انسان روگردانی اختیار کرے لیکن کچھ بھی ہو۔ سرگزشت ابن آدم کی یہی ہے کہ اس کو معلم اخلاق ملے۔ ہادیان راہ حق نصیب ہوئے اس کو کتابیں راستی اور نیکی کی باتیں اختیار کرنے کے لیے عطا ہوئیں مگر جب یہ اپنی مستی پر آتا ہے تو سب کو پس پشت ڈال دیتا ہے پھر آگے چل کر خمار گندم اترتا ہے تو حضرت ہائے وائے پر اتر آتے ہیں۔

سب سے زیادہ فطرت انسانی کے آزمائش و امتحان کی ساعت وہ ہے جب کہ اس کو دنیا میں تاج شاہی برسر اور عبائے حکومت زیب بر کرنے کا موقع ملے پھر اس نے بھی تخلیق انسانی کے ہر دور میں تجدید رسم ہامان و فرعون، اور احیائے سنت نمرود و شدّاد کے مناظر دکھلا دیے ہیں۔ کاش! اس کو بن کے کھیل بگڑ جانے اور گلشنوں کے پھل پھول کے اجڑ جانے سے کوئی عبرت نصیب ہوتی۔ سرفرازوں کے سر کو ذلت سے جھکتے اور شاہی تاجوں کو خاک میں گرتے دنیا نے بارہا دیکھ لیا ہے مگر نصیحت معلوم!

دنیا نام مقام عشرت کا نہیں۔ یہ تو مزرعۂ آخرت ہے جیسا بونا ویسا پانا: اعمال حسنہ کے بیج خلوص کی زمین کو سونپو تا کہ حاصل کے وقت مراد کے دامن پھل اور پھول سے بھریں اور مشام روح کے لیے یہ تحفہ عطر آگیں قابل مسرت اور راحت ہو۔ ورنہ یوں تو ہر لغزش عمل اور ہر بہک جانے کی شکل کے لیے "مواخذہ" کی دار و رسن موجود ہے۔

ادبی چور

سید یوسف بخاری

چور سے مطلب وہ چور نہیں جو پچھلی رات چوری کے ارادے سے نکل چھپ کر مکان میں داخل ہوتا ہے اور صاحب مکان اپنی جان اور مال کی حفاظت کے لیے یا چور کو پکڑنے کے واسطے چور چور کہہ کر چیختا ہے۔ آپ سوتے سوتے جاگ اٹھتے ہیں، عورتوں اور بچوں کی اس کے ڈر سے گھگی بند جاتی ہے اور نہ حضرتِ ذوق کے بقول ؎

کشتہ ہوں میں اس ناوک دزدیدہ نظر کا ۔۔۔ جاتے کا نہیں چور مرے زخم جگر کا

اس چور کا تعلق عاشقوں کے زخم جگر سے ہے، نہ اس چور کا تعلق اس چور کا تعلق اس چور سے ہے جس کا اشارہ حضرت ناسخ نے اپنے اس شعر میں کیا ہے۔

بے سبب آنکھیں نہیں مجھ سے چراتا وہ صنم ۔۔۔ کچھ نہ کچھ میری طرف سے اس کے دل میں چور ہے

اور نہ یہ وہ شاطر چور ہے جو حضرت برق کا دل لے کر گیا تھا وہ فرماتے ہیں ؎

کھیل تو دیکھو وہ مجھ کو آتا ہے لے کر ہاتھ میں ۔۔۔ دل نہیں قبضہ میں گویا گنجفہ کا چور ہے

نہ یہ عورتوں کی مہندی کا چور ہے جو ہاتھ پاؤں میں مہندی لگانے کے بعد رہ جاتا ہے، نہ چور بالو ہے، وہ ریت جسے دور سے دیکھو تو پانی کا دھوکا ہوتا ہے نہ چور بدن ہے جس کا موٹاپا اور عیب پوشیدہ

ہو، نہ چور پیٹ ہے، وہ ڈبا جس کا مداری تماشہ کرتے وقت چالاکی سے ایک رخ خالی اور دوسرا بھرا ہوا دکھاتے ہیں۔ نہ چور پیسہ ہے جو خاک میں گر کر مشکل سے پایا جاتا ہو۔ نہ چور تالا ہے جس کا قفل نظر نہ آتا ہو۔ نہ چور زینہ ہے جس پر چور خفیہ اور بے کھٹکے چلتے ہوں۔ نہ چور خانہ ہے جو صندوقچے میں زر و جواہر رکھنے کے لیے مخصوص ہوتا ہے، نہ چور زمین ہے جس میں دلدل کے سبب اندر دھنس جانے کا اندیشہ ہو، نہ چور کچہری ہے جہاں سراغ رسانی کے لیے خفیہ پولیس رہتی ہو، نہ چور کھڑکی ہے کہ وقتِ ضرورت کود پھاند کر کہیں بھاگ جاؤ، نہ چور محل ہے جس میں بیاہتا بیوی سے چھپا کر نکاحتا کو رکھا ہو۔ نہ چور مونگ ہے جو مونگ یا اڑد کی دال میں پکنے کے بعد گلنے سے رہ گیا ہو، نہ چور بازار ہے جہاں اچکے اور بدمعاش چوری کا مال فروخت کرتے اور دوکاندار کوڑیوں کے دام خریدتے ہوں۔

پھر آخر یہ کون چور ہے، ضرور کوئی دھاڑی چور ہوگا، چور کی ڈاڑھی میں تنکا یہ مثل تو آپ نے سنی ہوگی۔ بس یہی اس چور کی پہچان ہے، اصل میں ہمارا مطلب ادبی چور سے ہے، ادبی چوروں کی بہت سی قسمیں ہیں لیکن اس سے قبل کہ آپ ان سب سے دوچار ہوں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے آپ اس چوری کی تعریف سن لیں جو ادبی چوری کہلاتی ہے، ادبی چوری اصل میں علمِ ادب کی چوری ہے اور اس کا تعلق نظم اور نثر دونوں سے ہے۔

علم ادب میں چوری اور سرقہ کی تعریف یہ ہے کہ دوسرے لوگوں کے الفاظ اور معانی کو تبدیل کرکے اپنے اشعار میں استعمال کرنا اور ان کی تشبیہات اور استعارات کو اپنے کلام میں جگہ دینا اس کی چار قسمیں ہیں:۔

پہلی قسم کا نام انتحال ہے یعنی کسی کے شعر کو بغیر کسی تبدیلی کے اپنے نام سے پیش کرنا۔ دوسری قسم کو سلخ کہتے ہیں اس لفظ کے لغوی معنی کھال کھینچنے کے ہیں یہاں یہ مقصد ہے کہ ایک مطلب کو دوسرے الفاظ میں ادا کرنا۔

تیسری قسم المام ہے اس کے لغوی معنی کسی چیز کا ارادہ کرنا اور سرقات شعر میں اس کا مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ معنی تو وہی رہیں لیکن عبارت اور طریقہ بدل دیں۔

چوتھی قسم نقل ہے یعنی ایک شاعر کسی دوسرے شاعر کے معنی لے کر ایک جگہ سے دوسری

ے جائے چنانچہ ترجمہ بھی جو ایک زبان سے دوسری زبان میں ہوتا ہے اسی کے ماتحت آتا ہے۔

یہ چاروں قسمیں سرقہ سے متعلق تھیں لیکن اسی سلسلہ کی ایک کڑی اور ہے جسے توارد کہتے ہیں یعنی اصطلاح شعر میں ایک مضمون کا دو شخصوں کے ذہن میں آنا یا دو شاعروں کا ایک ہی مصرع یا شعر نظم کر جانا بشرطیکہ ایک کو دوسرے کے کلام کا علم نہ ہو یہ توارد کیوں کر وقوع میں آتا ہے ذرا اسے بھی سمجھ لیجیے۔

فرض کیجیے کہ آپ کو اس وقت فکرِ سخن مطلوب ہے جس ردیف اور قافیہ میں آپ غزل کہنی چاہتے ہیں، وہ آپ کے سامنے ہے۔ آپ کی کوشش و جستجو یہ ہے کہ کسی طرح کوئی نیا اور اچھوتا خیال سوجھ جائے تو ایک عمدہ شعر ہو جائے ورنہ پھر اسی خیال کو نظم کرنا پڑے گا کہ جس معنی کا وہ قافیہ بظاہر حامل ہے، یہی وہ مقام ہے جہاں سے توارد کی بنیاد پڑتی ہے۔ کیونکہ اکثر و بیشتر ایسا ہوتا ہے کہ ہم اچانک وہ شعر یا اسی شعر کا مضمون جسے ہم نے کسی دیوان یا رسالہ میں پڑھا تھا یا کسی سے سنا تھا اپنے ہی فکر کا نتیجہ سمجھ کر بجنسہٖ یونہی نظم کر جاتے ہیں۔ اور اگر اس خیال کا ماخذ یاد آ بھی گیا تو پھر مجبوراً اس سے استفادہ کرنا پڑتا ہے۔ اس استفادے کے لیے انتہائی احتیاط اور عزم سے کام لیا جاتا ہے اور لینا چاہیے تاکہ سخن گو اور نقاد دونوں اس سے قطعی بے خبر رہیں کہ اس شعر کا ماخذ فلاں شاعر کا فلاں شعر ہے۔ اس لیے کہ وہ اپنی رائے میں اس استفادے کو عین سرقہ اور استفادہ کرنے والے کو قطعی مجرم گردانتے ہیں۔ ان حالات کا شکار اکثر نوآموز اور مبتدی ہی ہوتے ہیں جیکم آغا جان عیش کی غزل کا ایک شعر ہے۔

اے شمع صبح ہوتی ہے روتی ہے کس لیے
تھوڑی سی رہ گئی ہے اسے بھی گذار دے

بعینہٖ اسی مضمون کا ایک شعر استاد ذوق کا بھی ہے ؎

اے شمع تیری عمر طبیعی ہے ایک رات
رو کر گذار یا اسے ہنس کر گذار دے

دونوں اشعار استادوں کے ہیں کسی کو اس توارد میں شبہ کی گنجائش اور سرقہ کی شکایت نہیں ہاں اگر یہی توارد کسی استاد یا مبتدی کے درمیان ہوتا یا اب ہو جائے تو بغیر تحقیق سرقہ کا الزام

غریب مبتدی ہی پر لگایا جائے گا حالانکہ اشعار کا سرقہ صرف ان ہی اشعار کے حق میں کہا جا سکتا ہے جو بغیر کسی تبدیلی کے اپنے نام سے پیش کیے جائیں یا ان میں محض ایک دو لفظوں کی کمی کی گئی ہو یا وہ اپنی ہی زبان کے کسی مشہور شعر سے ماخوذ ہوں اور ماخوذ ہونے کے باوجود اپنی فصاحت و بلاغت میں اصل سے کمتر ہوں، ایسی صورت میں خواہ توارد ہی کیوں نہ ہوا ہو اس شعر کو غزل سے خارج کر دینا ہی لازم ہے اور اگر اپنے ماخذ سے بلند ہو تو چونکہ وہ ادب میں ایک اضافہ ہے۔ اس لیے اس کو قائم رکھنا اور اپنا قرار دینا ہرگز کوئی گناہ اور عیب نہیں، ذرا آپ ہی انصاف سے کہیے کہ وہ شاعر جو اتفاق سے ایک ہی زمین ایک ہی ردیف اور ایک ہی قافیہ میں فکرِ سخن کر رہا ہو۔ کیونکر ایک بالکل نیا اور اچھوتا خیال آپ کے سامنے پیش کر سکتا ہے، ایسی حالت میں وہ دانستہ یا نادانستہ دوسروں کا خیال مستعار لینے کے لیے اتنا ہی مجبور اور محتاج ہو گا جتنا اردو کے شعرائے متقدمین شعرائے فارس کا مضمون اخذ کرنے کے لیے معذور اور ضرورت مند تھے اور یہ بھی سب کو معلوم ہے کہ دورِ حاضر کے اکثر شعرا انگریزی نظموں کا اردو میں آزاد ترجمہ کرتے ہیں۔ الغرض کسی کے شعر کو بغیر کسی تبدیلی یا معمولی تغیر و تبدل کے اپنے نام سے پیش کرنا تو فی الواقعی سرقہ ہے اور اس کا مرتکب اخلاقی اور قانونی دونوں حیثیتوں میں یقیناً مجرم ہے لیکن کسی کی زبان سے کچھ سن کر اور کسی کتاب سے کچھ پڑھ کر اس بات کو یا اس خیال کو اپنے الفاظ میں ڈھال کر پہلے سے بہتر اور عمدہ پیش کرنا یا ایک زبان کی چیز کو دوسری زبان میں ترجمہ کرنا چوری اور نقل نہیں ہے، استفادہ بہر صورت ضروری اور ناگزیر ہے۔

اب آپ کو سرقہ کی تعریف اور اس کی مختلف قسمیں معلوم ہو گئیں اور سرقہ اور توارد کا باہمی فرق بھی سمجھ میں آ گیا۔ یقیناً ان اصولوں کی مدد سے آپ ادبی چوروں کو پکڑنے اور ان کی چوریوں کو پبلک میں بے نقاب کرنے میں حسبِ دلخواہ کامیاب ہو سکتے ہیں۔ آئیے اب ان لوگوں سے ملاقات بھی کریں۔

پہلے ذرا ان صاحب پر نگاہ ڈالیے آپ نے "پہلے مسلمان" کے عنوان سے ایک نظم لکھ کر حضرتِ حالی مرحوم مغفور کی روح پر احسان اور قوم کی اصلاح فرمائی ہے، طبیعت تو دیکھیے کس قدر بے باک اور کلام کس درجہ مصلحانہ پایا ہے۔

جب امت کو سب مل چکی حق کی نعمت ادا کر چکی فرض اپنا رسالت

رہی حق پہ باقی نہ بندوں کی خدمت   پیارے نبی گو گیا یاں سے رخصت

تو اسلام کی وارث ایک قوم چھوڑی

کہ دنیا میں جس کی مثالیں ہیں تھوڑی

اس بند کے دوسرے شعر کے پہلے مصرعے میں خدمت کی بجائے حجت ہے اور دوسرا مصرع اصل مسدس میں اس طرح ہے ؏

نبی نے کیا خلق سے قصدِ رحلت

خلیفہ تھے اُمت کے ایسے نگہباں   ہو گلّے کا جیسے نگہباں چوپاں

سمجھتے تھے ذی علم و جاہل کو یکساں   نہ تھا عبد و حُر میں تفاوت کسی آں

کنیز اور آقا تھیں آپس میں ایسی

کہ ماں جائی بہنیں ہوں آپس میں جیسی

دوسرے شعر میں ذی علم و جاہل کی بجائے مسدس کے اصل الفاظ ذِمّی و مُسلم ہیں اور کسی آں کی بجائے "نمایاں" کا لفظ ہے۔ اس بند کے آخری شعر کے دونوں مصرعے تو اس خوبی سے بدلے ہیں جس سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ ہمارے یہ نوجوان شاعر شاید تذکیر و تانیث کے زمرہ سے الگ کوئی تیسری جنس ہیں۔ اصل شعر یوں ہے ؎

کنیز اور بانو تھیں آپس میں ایسی   زمانے میں ماں جائی بہنیں ہوں جیسی

الغرض آپ نے اصل مسدس حالی کے آٹھ بند یا چوبیس اشعار کو لفظ بہ لفظ نقل کر کے کہیں کہیں کسی مصرعے میں ایک دو الفاظ کا تصرف فرما کر اپنی نظم کو مکمل فرمایا ہے۔

نظم کا نمونہ تو آپ نے ملاحظہ فرمایا اب ذرا نثر کی ایک نظیر بھی دیکھ لیجیے اصل مضمون نگار کا مضمون ایک مشہور رسالہ میں شائع ہوا تھا۔ کچھ مدت بعد ایک دوسرے رسالہ میں تمام و کمال یہی مضمون ایک دوسرے صاحب نے اپنے نام سے شائع کر دیا۔ اصلی اور نقلی دونوں تحریریں پڑھیے۔ عبارت کے علاوہ قصے کے ہیرو اور ہیروئن کے ناموں کو بھی دھوکا دینے کے لیے تبدیل کر دیا ہے:۔

(۱)

"زکیہ جو نظرِ تلطف کی خواہاں اور محبت کے ادنیٰ انداز کی آرزومند

تھی کہ وہ شوکت اپنے بے پرواہ شوہر کے سامنے اپنے وارداتِ قلب اپنے جذباتِ رقیق کی نمائش کرے یہ سن کر دم بخود ہو گئی"۔

"رضیہ جو رفاقت کی ایک نظر اور محبت کا ایک لمحہ چاہتی تھی۔ اور اس لیے چاہتی تھی کہ وہ حامد کو اپنے بے پرواہ شوہر کو کچھ اپنے وارداتِ قلب سنائے۔ کچھ اپنے جذباتِ دل عرض کرے کچھ اپنے حیات و تاثرات پیش کرے دم بخود رہ گئی"۔

(۲)

"لیکن آہ! اگر ایک مجبورِ محبت نے تمہیں جو کہ ذرا چھو لیا تو کیا تمہیں اسی طرح جھڑکنا، غصہ میں بھر کر بے قابو ہو جانا اور میرے بے گناہ ہاتھ کو غایت بے رحمی سے مروڑ دینا مناسب تھا؟"

"لیکن آہ! محبت کی مجھ مجبور نے اگر ایک دل ہلا دینے والے تخیل سے متاثر ہو کر نہیں بلکہ فرطِ محبت سے بیتاب ہو کر تم سے اپنا دکھڑا بیان کیا تو کیا تمہیں تلخ کامی سے پیش آنا چاہیے تھا اور باندیوں کی طرح جھڑکنا مناسب تھا۔ غصے میں بھر کر بے قابو ہو جانا اور نگاہ قہر آلود سے دیکھنا جائز تھا"۔

(۳)

"ہر وقت گھروں میں گھسے رہنا اور جاہل عورتوں میں بیٹھ کر وقت ضائع کرنا مہذب دنیا اور تعلیم یافتہ طبقے کا دستور نہیں وہ اپنی فرصت کی ساعتوں کو بہترین مشاغل میں گذارتے ہیں"۔

"ہر وقت گھروں میں گھسے گھسے رہنا اور بیوقوف عورت ذات کے پاس بیٹھ کر وقت ضائع کرنا جاہل ہندوستانیوں میں رائج ہے، مہذب دنیا وقت کی قدردان ہے اور وہ اپنا وقت بہترین مشاغل اور مصروفیات میں گذارنا پسند کرتی ہے"۔

یہ ایک نئی نویلی مضمون نگار خاتون ہیں۔ مضمون نویسی کا نیا نیا شوق ہے۔ اپنی سہیلی کو

ایک خط لکھ رہی ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ عبارت رنگین اور شوخ ہو، وہ اپنی اِس کوشش میں ایک حد تک کامیاب بھی ہیں کیوں کہ اُن کی ہر بات سے ایسا ہی اظہار ہو رہا ہے۔

صبح کا سہانا وقت ہے، بالائی منزل کے ایک کمرے میں ایک مکلّف پلنگ پر بیٹھی ہیں۔ ہوا کی آمد و رفت کے لیے کھڑکی کھلی ہوئی ہے دوات کی پہلی بدبودار سیاہی پھینک کر رنگین اور روشن سیاہی ڈالی ہے۔ قلم کا نب بھی بدلا گیا ہے، فیروزی رنگ کا نیا کاغذ ہے، کچھ مسکرانے اور گنگنانے کی سی کیفیت طاری ہے۔ ابھی صفحے کے آغاز پر مقام و تاریخ لکھا ہے، القاب زیرِ غور ہے، لیجئے "عزیز سلمیٰ" لکھ دیا گیا۔ القاب لکھتے ہی یہ خیال پیدا ہوا کہ رسمی طور پر سلام لکھوں یا شوقِ ملاقات کا اظہار کروں، کچھ سوچ کر لکھا "شوقِ ملاقات" لکھتے لکھتے زیادہ محبت کا اظہار مقصود ہوا "ہزاروں ارمان" کے الفاظ اور بڑھا دیئے گئے۔ اب اصل خط شروع ہوتا ہے، پیرایۂ آغاز، تمہید و انجام، مضمون اور مطلب تمام باتیں دماغ میں گھوم رہی ہیں۔ قلم انگوٹھے اور انگلی کے درمیان دبی ہوئی ہونٹوں سے لگی ہے۔ آنکھیں صفحۂ کاغذ پر جمی ہوئی ہیں۔ دل میں ایک خیال پیدا ہوا۔ اسی وقت دماغ میں پہنچ کر ٹکرایا۔ قلم کے ذریعہ فوراً صفحۂ کاغذ پر آیا۔ ابھی قلم نے صرف یہ الفاظ "تمہارا خط ملا" لکھے تھے کہ ہوا کے تند اور گستاخ جھونکے سے سنوارے اور بنائے ہوئے بال پریشان ہو گئے حنائی انگلیوں نے بالوں کو درست کیا، ہوا پھر چلی، گیسو پھر بکھر گئے پھر بنایا پھر بگڑ گئے، غضب ہوا دماغ میں آیا ہوا مضمون یک لخت دھیان سے اتر گیا بہت سوچا کچھ یاد نہ آیا، آخر اس خیال کو ترک کر کے دوسرا مضمون گانٹھنا شروع کیا۔ دل کو الجھن اور دماغ کو تھکن سی محسوس ہونے لگی۔ طبیعت میں ایک انتشار پیدا ہو گیا۔ سوچا کچھ لکھا کچھ اور لکھ کر بھی کاٹ کاٹ دیا اسی کاٹ چھانٹ میں کافی وقت گزر گیا۔ آخر اٹھ کر الماری کھولی۔ دس پندرہ منٹ غالب کے دیوان کی ورق گردانی کر کے چند اشعار انتخاب کیے اور ایک کاغذ پر نقل کر لیے پھر ایک ناول اور دو تین رسالے الٹ پلٹ کر دیکھے جہاں کہیں مفید مطلب عبارت نظر آئی۔ وہیں سے اس کا کوئی فقرہ لکھ لیا اِس طرح دس پندرہ سطروں کا مواد جمع کر لیا، اب پلنگ پر دوبارہ سر جوڑ کر بیٹھیں۔ القاب و آداب سے پہلے ہی فراغت مل چکی تھی، ذرا غور کر کے فقروں کو مقدم و موخر کرتے ہوئے اور درمیان میں دو تین اشعار پھنسا کر اچھا خاصا ایک خط لکھ مارا

یہ ایک نو آموز شاعر ہیں۔ کل شہر میں ایک مشاعرہ ہونے والا ہے، اس کی تیاری میں مصروف ہیں۔ الماری کھولے کتابوں کو الٹ پلٹ کر دیوان نکال رہے ہیں ان کے دادا مرحوم بڑے پائے کے شاعر تھے ان کے دیوان سے چند اشعار نقل کیے ہیں ان کو لکھ کر اپنے استاد کی خدمت میں بغرض اصلاح پیش کریں گے، ظاہر ہے ایسے چوٹی کے اشعار کو استاد بغیر اصلاح کیے پڑھنے کی اجازت دے دیں گے۔ استاد شاعر تو ضرور ہیں لیکن زبردستی کے استاد مشہور ہیں، اپنے متعدد شاگردوں کو غزلیں تقسیم فرما رہے ہیں جو اپنے نام و تخلص سے بڑے جوش اور طمطراق سے پڑھیں گے، آپ جب ایک دو اچھے اشعار سنیں گے تو بے ساختہ تعریف کرنی پڑے گی، شعر پڑھنے والے صاحب عجز و انکساری کے ساتھ فرمائیں گے "استاد کا فیضان ہے، ان کی جوتیوں کا صدقہ ہے" دوسرے استاد بھائی موقعہ پا کر چیخیں گے "واہ واہ واہ! سبحان اللہ کیا شعر فرمایا ہے آپ نے واللہ جواب نہیں ہے۔ قلم توڑ دیا ہے زبان ہو تو ایسی ہو کیا حقیقت فرما رہے ہیں آپ، کمال ہے کمال بھئی! کتنا مرصع خیال ہے، وہ جواباً سر بہ قد کھڑے ہو جائیں گے اور کہیں گے "آپ کا حسن ادب ہے، حُسن اخلاق ہے۔ سخن فہم حضرات ہی کے لیے شعر کہتا ہوں، آداب عرض، ذرہ نوازی ہے، قدر دانی ہے، آداب عرض ہے آداب عرض"

یہی صاحب دوسرے دن صبح کو ایک شادی کی محفل میں سہرا پڑھتے نظر آتے ہیں، یہ انہی سہروں میں سے ایک سہرا ہے جو اُن کے اُستاد متعدد بار اپنے شاگردوں کو مختلف شادی کی تقریبوں میں پڑھنے کے لیے دے چکے ہیں۔ آج بھی یہ دو چار نام اور ایک دو اشعار کی معمولی سی تبدیلی کے بعد کاغذ پر چھپا ہے اور ہمارے نوجوان زبردستی کے شاعر اس کو بے تکلف ہو کر پڑھ رہے ہیں۔

یہ صاحب واعظ ہیں اور لیڈر بھی۔ فنِ تقریر اور چند مواعظ کی کتابیں ہر وقت ان کے گھر میں موجود رہتی ہیں، سال میں شہر کے اندر جب کبھی کوئی عظیم الشان جلسہ ہوتا ہے یا حسن اتفاق سے دو چار مرتبہ کہیں سے کوئی بڑے مولوی صاحب شہر میں آ دھمکتے ہیں تو یہ چند لیڈروں کی تقریر اور مولوی صاحبان کے پند و نصائح اور بیان خفیہ پولیس کے ایک خبر رساں کی طرح چپکے چپکے کاغذ پر لکھ لیتے ہیں اور پھر کچھ مدت بعد کسی دوسری جگہ مسخ کردہ بھی اور رٹی ہوئی تقریریں بے تکلف

دوہراتے ہیں۔

یہ ایک مشہور و معروف ادیب ہیں، ویسے تو تین چار سو ناولوں کے بادشاہ مشہور ہیں۔ کیوں کہ وہ تمام ناولوں کو اپنی ہی تصنیف بتاتے ہیں۔ حالانکہ وہ تمام انگریزی ناولوں کا ترجمہ ہیں اور اُن میں سے بھی بیسیوں ناول ایسے ہیں۔ جو پہلے شائع ہو چکے ہیں لیکن اب نئے نام، نئے سرورق اور نئے الفاظ کا جامہ پہن کر نئے روپ میں سامنے آرہے ہیں۔

یہ ایک مترجم ہیں اور ایک مشہور مصنف کی ایک کتاب کا حال ہی میں ترجمہ بھی کیا ہے، ترجمہ تو کرلیا لیکن دل ہی دل میں کڑھ رہے ہیں کہ کاش میں ہی اس کتاب کا مصنف ہوتا اور یہ مقالات میرے ہی مطالعہ کا نتیجہ اور تجربہ کا نچوڑ ثابت ہوتے، پھر مصنف کی حیثیت سے سامنے آتے ہوئے بھی گھبراتے ہیں، اس لیے کتاب کے دیباچہ میں کچھ اس قسم کی گول مول عبارت لکھتے ہیں :

"ان مقالات کے متعلق یہ دعویٰ نہیں کیا جاسکتا کہ یہ طبع زاد ہیں اور نہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ ترجمہ ہیں بلکہ بیشتر خیالات محض میرے مطالعہ کا ایک عکس ہیں۔ اگر یہ مفید ثابت ہوئے تو میں سمجھوں گا کہ میری کوششیں بارآور ثابت ہوئیں"

یہ ایک نئے رسالے کے ایڈیٹر ہیں، دو تین پرچے شائع ہو چکے ہیں اُن کے پاس جہاں روپے کی کمی ہے وہاں مضمون نگاروں کا بھی کال ہے اشاعت کی تاریخ سر پر آپہنچی ہے، رسالہ کو بہر حال مضامین سے پُر کرنا ہے آخر کچھ پرانے اور کچھ نئے رسالوں اور اخباروں سے چند مضامین پھاڑ کر کاتب صاحب کے حوالے کیے تاکہ وہی اُن کے رسالے کی زینت بن سکیں اسی سلسلہ میں آپ نے ایک دو مقامی رسالوں کے خریداروں کے پتے بھی اُن کے دفتر والوں سے مل جل کر اڑا لیے ہیں اور نہایت اطمینان کے ساتھ نمونے کے پرچے بھیجے جارہے ہیں، اُن کے رسالے کا بھی وہی حشر ہوتا ہے جو اوروں کا ہوتا ہے کہ خریداروں تک پہنچنے سے پیشتر درمیان سے اڑا لیے جاتے ہیں شکایتی خطوط وصول ہوتے ہیں پرچے دوبارہ بھیجے جاتے ہیں اور جب نیا پرچہ شائع ہوتا ہے تو شذرات میں یہ نوٹ نکلتا ہے۔

"ڈاک کے ڈاکو۔ رسالہ دفتر سے ہر ماہ ۱۵ تاریخ کو روانہ کردیا جاتا ہے، اگر آپ کو رسالہ وقت پر نہ ملے تو اپنے ہاں کے پوسٹ ماسٹر سے شکایت کیجئے اور تحقیق فرمایئے اور ہمیں بھی لکھئے تاکہ ڈاک کے ان ڈاکوؤں کا پتا چلانے کے لیے ہم کوئی قدم اٹھا سکیں۔ دفتر کو اس سلسلہ میں ہر ماہ بہت بڑا نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے،

"منیجر"

یہ کتابوں کے مشہور پبلشر ہیں، آپ کو اپنی ادبی تجارت چمکانے اور روپیہ کمانے کے بہت سے گُر اور نسخے معلوم ہیں، آپ کسی شہرۂ آفاق مصنف کی جو اتفاق سے مرحوم ہو چکا ہے، کوئی ابتدائی اور غیر معروف سی کتاب کو نیا نام دے کر ایک نئی سج دھج کے ساتھ شائع کرتے ہیں، اور پڑھنے والے اپنے دل پسند مصنف کے نام کا فریب کھا کر کتاب پر کتاب خریدتے ہیں۔

یہ صاحب مطالعہ کے بڑے ہی شوقین ہیں لیکن حالت یہ ہے کہ خرید کر پڑھنا حرام سمجھتے ہیں۔ جس لائبریری یا ریڈنگ روم میں جاتے ہیں تو گویا ان پر احسان کرتے ہیں اس احسان کا عوض حاصل کرنے کی اُن کے نزدیک نہایت آسان صورت یہ ہے کہ اخبار اور رسالوں کے عمدہ مضامین، کتابوں کی ضروری تصویریں اور نقشے پھاڑ کر جیب میں رکھ لیں، موقعہ لگے تو ایک دو کتابیں بھی اُچکا لائیں ورنہ اُن کے دوست زندہ و سلامت ہیں۔

یہ ادبی چور اپنے ملنے والوں کے کتابی دوست بن کر اُن کے پاس جائیں گے۔ اُن کے علم و قابلیت کی تعریف کریں گے۔ کتابوں کے عمدہ انتخاب اور کثیر تعداد پر خوشی اور حیرت کا اظہار کرتے ہوئے ایک دو کتابوں کی شدید اور فوری ضرورت بتائیں گے۔ وہ غریب خواہ کتنے ہی حیلے وحوالے کیوں نہ کرے لیکن یہ کسی نہ کسی طرح اُن سے مستعار ورنہ آخر دبے جھٹکا کر لے ہی آئیں گے۔ پھر وہ کتاب ان کی اور ہزار بار اُن کی، اور علم اور مطالعہ تو گویا انھیں میراث میں ملا تھا۔

مرزا چپاتی

اشرف صبوحی

خدا بخشے مرزا چپاتی کو، نام لیتے ہی صورت آنکھوں کے سامنے آگئی۔ گورا رنگ بڑی بڑی ابلی ہوئی آنکھیں۔ لمبا قد۔ شانوں پر سے ذرا جھکا ہوا۔ چوڑا شفاف ماتھا۔ تیموری داڑھی۔ چنگیزی ناک۔ مغلئی ہاڑ۔ لڑکپن تو قلعہ کے در و دیوار نے دیکھا ہوگا۔ جوانی دیکھنے والے بھی ٹھنڈا سانس لینے کے سوا کچھ نہیں کہہ سکتے۔ ڈھلتا وقت اور بڑھاپا ہمارے سامنے گزرا ہے۔ لُٹے ہوئے عیش کی ایک تصویر تھے رنگ و روغن اترا ہوا محمد شاہی کھلونا تھا۔ جس کی کوئی قیمت نہیں رہی تھی۔

کہتے ہیں کہ دلّی کے آخری تاجدار ظفر کے بھانجے تھے۔ ضرور ہوں گے۔ پوتڑوں کی شاہزادگی ٹھیکروں میں دم توڑ رہی تھی لیکن مزاج میں رنگیلا پن وہی تھا۔ جلی ہوئی رسّی کے سارے بل گن لو۔ جب تک جیے پرانی وضع کو لیے ہوئے جیے مرتے مرتے نہ کبوتر بازی چھوٹی نہ پتنگ بازی مرغے لڑائے یا بلبل۔ تیراکی شغل رہا یا شعبدے بازی کا۔ خدا جانے غدر میں یہ کیونکر بچ گئے۔ اور جیل کے سامنے والے خونی دروازے نے ان کے سر کی بھینٹ کیوں نہ قبول کی۔

انگریزی عملداری ہوئی بدامنی کا کوئی اندیشہ نہیں رہا تو مراحم خسروانہ کی لہر اٹھی۔ خاندان شاہی کی پرورش کا خیال آیا پنشنیں مقرر ہوئیں۔ مگر برائے نام۔ ساڑھے تیرہ روپے۔ مرزا چپاتی کے حصے میں آئے۔ اللہ اللہ کیا زمانے کا انقلاب ہے۔ ایک زلزلے چکر میں تقدیر ہزار قدم پیچھے ہٹ گئی۔

لیکن صاحب عالم مرزا فخرالدین عرف مرزا فخرو الملقب بہ مرزا چپاتی نے مردانہ وار زندگی گزاری۔ گھر بار جب کبھی ہوگا۔ ہوگا۔ ہماری جب سے یاد اللہ ہوئی دم تقدہی دیکھا۔ قلعہ کی گود میں بازیوں کے سوا اور سیکھا ہی کیا تھا جو بگڑے وقت میں آب رو بناتا۔ اپنے والد مرزا رحیم الدین حیا سے ایک نقطہ شاعری ورثے میں ملی تھی پڑھنا لکھنا آتا نہ تھا پھر زبان توتلی مگر حافظ اس بلا کا تھا کہ سو سو بند کے مسدس ازبر تھے۔ کیا مجال تھی کہ کہیں سے کوئی مصرعہ بھول جائیں گویا گراموفون نے کوک دیا اور چلے۔ قلعہ مرحوم کے حالات اور موجودہ تہذیب پر ان کی نوکا جھونک جتنی مزہ دیتی تھی وہ میرا دل ہی جانتا ہے کبھی کبھی وہ مجھے پتنگ بازی کے دنگلوں میں لے جاتے تھے بیسیوں مرغ اور بلبلوں کی پالیاں بھی دکھائیں۔ تیراکی کے میلوں میں بھی لے گئے کبوتر بھی مجھے دکھا دکھا کر اڑاتے۔ سب کچھ کیا میں جہاں تھا وہیں رہا۔ ہر جگہ ان کا دماغ کھایا۔ انھیں بھی میری خاطر ایسی منظور تھی کہ بادل خواستہ یا ناخواستہ وہ سب کچھ مجھے بتاتے۔

ایک دن دوپہر کے کوئی دو بجے ہوں گے برسات کا موسم تھا کئی گھنٹوں کی موسلا دھار بارش کے بعد ذرا بادل چھٹے تھے کہ حضرت معمول کے خلاف میرے پاس تشریف لائے۔ منہ بنا ہوا۔ آنکھیں ابلی ہوئی چہرہ سے غصہ ٹپک رہا تھا۔ میں نے کہا خدا خیر کرے آج صاحب عالم کے تیور کچھ اور ہیں۔ کئی منٹ تک خاموش بیٹھے رہے اور میں ان کا منہ تکتا رہا ذرا سانس درست ہوا تو بولے سنیے۔ اس پٹھانچے کا نشہ مغزا بن بھی دیکھا بڑا افلاطون بنا پھرتا ہے۔ باوا تو جھک جھک کر مجرا کرتے کرتے مر گیا۔ یہ بابو بن کر بابو کی طرح دلتیاں جھاڑتا ہے۔ بے شرطا کچا چار کس دوں ساری شیخی نکل جائے گی۔

میں: میں بالکل نہیں سمجھا۔ ہوا کیا؟ کون پٹھانچہ؟

مرزا: ایسے ننھے سمجھے ہی نہیں۔ میاں وہی کالے خاں کا لڑکا جو کچہری میں نوکر ہے۔

میں۔ منیر۔ کیا اس نے کچھ گستاخی کی ؟

مرزا۔ گستاخی۔ نہ ہوا۔ ہمارا زمانہ۔ خاندان بھر کو لہو میں پلوا دیتا۔

میں۔ بڑا نالائق ہے کیا بات ہوئی ؟

مرزا۔ ہوا یہ کہ میں کبوتروں کا دانہ لینے نکلا۔ گلی کے نکڑ پر بنیے کی دکان ہے۔ نالیوں میں جائیں دھائیں پانی بہہ رہا تھا۔ ساری گلی میں کیچڑ ہی کیچڑ تھی۔ محلے والوں نے جابجا پتھر رکھ دیئے تھے کہ آنے جانے والے ان پر پاؤں رکھ کر گزر جائیں۔ دیکھتا کیا ہوں کہ وہ اکڑے خاں بیچ گلی میں کھڑے ہوئے ایک ناچنے والے سے جھک جھک کر رہے ہیں۔ گلی تنگ کیچڑ اور پانی۔ پتھروں پر ان کا قبضہ۔ کوئی بھلا مانس گزرے تو کہاں سے ؟ میں نے کہا کہ میاں راستہ چھوڑ کر کھڑے ہو۔ یہ کونسی انسانیت ہے کہ راستہ روک رکھا ہے تڑا کر جواب دیا کہ چلے جاؤ۔ مجھے تاؤ آگیا۔ بولا کہ تمہارے سر پر سے جاؤں۔ پھر کیا تھا جامہ سے باہر نکل پڑا وہ تو پاس پڑوس کے دو چار آدمی نکل آئے۔ اور بیچ بچاؤ کرا دیا ورنہ آج وہ نہیں تھا یا میں۔ خیر جاتا کہاں ہے آج کے تیسرے آج ہی نہیں جلا کرتے۔

میں۔ صاحب عالم آپ اپنی طرف دیکھیے جو ظرف میں ہوتا ہے وہی چھلکتا ہے۔ آنے دیجیے وہ ڈانٹ بتاؤں کہ ہاتھ جوڑتے بنے۔ . . . . سنا ہے کہ قلعے کے آخری دور میں شہر کی حالت بدل گئی تھی نہ چھوٹوں کا رکھ رکھاؤ تھا اور نہ بڑوں کا ادب۔

مرزا۔ توبہ توبہ تم نے دلی کو دم توڑتے بھی نہیں دیکھا۔ اس کا مردہ دیکھا ہے مردہ۔ وہ بھی لاوارث۔ میاں شہر آباد کی باتیں قلعے والوں کے صدقے میں تھیں جیسے جیسے وہ اٹھتے گئے دلی میں اصلیت کا اندھیرا ہوتا گیا۔ اب تو نئی روشنی ہے نئی باتیں اور تو خدا بخشے۔ دلی کی صفتیں تم کیا جانو۔ پڑھے لکھے ہو۔ شاعری کا بھی شوق ہے۔ بھلا بتاؤ تو بھی اُردو کی کتنی قسمیں ہیں ؟ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ صاحب عالم اُردو کی قسمیں کیسی ؟ یہ بھی ایک کہی۔ مجھ پر داؤ کرنے لگے۔ بولے۔ واہ بھئی معلوم ہوا کہ تم دلی والے نہیں کہیں باہر سے آکر بس گئے ہو۔ میں شرمندہ تھا کہ کیا جواب دوں میرے نزدیک تو صرف ایک ہی قسم کی اُردو تھی۔ زیادہ سے زیادہ عوام و خواص کا فرق سمجھ لو۔ مگر یہ قسمیں کہاں ؟ مجھے چپ دیکھ کر مرزا مسکرائے اور کہنے لگے۔ سید پریشان نہ ہو۔ مجھ سے سن اور یاد رکھ۔

بھولیو نہیں۔ پھر پوچھے گا تو نہیں بتاؤں گا۔ میں بڑے شوق سے متوجہ ہوا۔ انھوں نے انگرکھے کے دامن سے منہ پونچھ کر کہنا شروع کیا۔ دیکھ اول نمبر پر تو اُردوئے معلّیٰ ہے۔ جس کو ماموں حضرت اور ان کے پاس اُٹھنے بیٹھنے والے بولتے تھے وہاں سے شہر میں آئی اور قدیم شرفاء کے گھروں میں آ چھپی، دوسرا نمبر قل آعوذی اُردو کا ہے جو مولویوں واعظوں اور عالموں کا گلا گھونٹتی رہتی ہے تیسرے خود رنگی اُردو۔ یہ ماں تینی باپ کلنگ والوں نے رنگ برنگ کے بچے نکالے ہیں اخبار اور رسالوں میں اس قسم کی اُردو ادب کا اچھوتا نمونہ کہلاتا ہے۔ چوتھے بدرنگی اُردو مسخروں اور آج کل کے قومی بلم تیروں کی منہ پھٹ زبان ہے پانچویں لفنگی اُردو ہے جسے آکا بھائیوں کی لٹھ مار کڑا کے دار بولی کہو۔ یا پہلوانوں کرخنداروں ضلع جگت کے ماہروں۔ پھبتی بازوں اور گلیروں کا روزمرہ۔ چھٹے نمبر پر فرنگی اُردو ہے، جو تازہ ولایت انگریز۔ ہندوستانی عیسائی ٹوپ لگائے ہوئے کراتی دفتر کے بابو۔ چھاؤنیوں کے سوداگر وغیرہ بولتے ہیں۔ پھر ایک سر بھنگی اُردو ہے یعنی چرسیوں بھنگڑوں بینواؤں اور تکیہ داروں کی زبان۔

میں نے کہا آج تو بہرا کھلا ہوا ہے، بھئی خوب تقسیم ہے کیوں نہ ہو آخر شاہجہانی دیگ کی کھرچن ہے۔ میری طرف دیکھ کر ایک گہرا ٹھنڈا سانس بھرا۔ آنکھوں میں آنسو آگئے اور کہنے لگے سید! ابھی تم نے کیا دیکھا ہے اور کیا سنا ہے قلعہ آباد ہوتا۔ دربار دیکھے ہوتے تو اصلی زبان کا بناؤ سنگار نظر آتا۔ اب تو ہماری زبان بھی ہنسی ہو گئی ہے۔ وہ کھیلی چونچلے کی باتیں شریفوں کے انداز۔ امیروں کی آن۔ سپاہیوں کی اکڑفوں۔ وہ خادمانہ اور خوردانہ آداب انکسار۔ شاعروں کے پھبے دار فقرے، شہر والوں کا میل جول، پرانے گھرانوں کے رسم و رواج وہ مروت وہ آنکھ کا لحاظ کہاں ؟ مجلسوں محفلوں کا رنگ بدل گیا، میلے۔ ٹھیلے پرانے پرانے کرتب اگلے نہر سب مٹتے جاتے ہیں۔ اشرف گردی نے بھلے مانسوں کو گھر بٹھا دیا فیل نشین پالکیوں میں بیٹھنے والے کھپریلوں میں پڑے ہوئے ہیں مفلسی ناداری نے رذالوں کے آگے سر جھکوا دیئے۔ موری کی اینٹ چوبارے چڑھ گئی۔ کم ظرفوں بنیوں کے گھر میں دولت پھٹ پڑی۔ زمانہ جب کمینوں کی بستی پر ہو تو خاندانیوں کی کون قدر کرتا ؟ پیٹ کی مار نے۔

صورتیں بگاڑ دیں چال چلن میں فرق آگیا۔ ہمت کے ساتھ حمیت بھی جاتی رہی۔

مرزا نے یہ تقریر کچھ ایسے عبرت خیز لفظوں میں کی کہ میرا دل بھر آیا۔ اور میں نے گفتگو کا پہلو بدلنے کی کوشش کی۔

میں۔ کیوں حضرت غدر سے پہلے دِلّی والوں کا لباس کیا تھا؟ دو چار پرانی وضع کے لوگ دیکھنے میں آتے ہیں ان کی برزخ کچھ عجیب ہی تو معلوم ہوتی تھی۔

مرزا۔ جھوٹے ہو تم نے کہاں دیکھا ہوگا۔ کوئی بہروپیا یا نقال نظر آگیا ہوگا۔ میاں ان وقتوں میں ادنیٰ و اعلیٰ میں ایک رنگی نہ تھی..... درباری اور بازاری لوگ لباس سے پہچانے جاتے تھے۔ عام طور پر اپنی شکل و شباہت تن و توش جسامت اور پیشے کے مطابق کپڑا پہنا جاتا تھا۔ تاکہ دور سے دیکھ کر پہچان لیں کہ کس خاندان کا اور کیسا آدمی ہے۔ اگر نوجوان ہے تو ایک ناٹے پر نوجوانی برستی ہے بوڑھا ہے تو پیری اور سادگی ٹپکتی ہے بانکوں کا بانکپن۔ چھیلاؤں کا چھیلا پن۔ ملاؤں کی ملاپی۔ پہلوانوں کی پہلوانی۔ رذالوں کی رذالت اور شریفوں کی شرافت لباس سے صاف بھانپ لی جاتی تھی۔ چھوٹے آدمی جس پوشاک کو اختیار کر لیتے بھلے مانس چھوڑ دیتے دو پلڑی ٹوپیوں کا عام رواج تھا مگر چوگوشی، پنج گوشی، گول بغلئی۔ تاجدار ٹوپیاں مغل بچے اور شریف زادے پہنتے تھے قلعے کے آنے جانے والوں میں مندیلیں بنارسی دوپٹے۔ گوٹے دار پگڑیاں مسلمانوں کا حصہ تھا۔ درباری جامہ بھی پہنا کرتے تھے۔ امرا جیغہ۔ سرپیچ اور شہزادوں میں کلغیاں بھی مروج تھیں۔ ہندوؤں میں پہلے جامے کا زیادہ دستور تھا۔ پھر نیم جامہ اور الٹی چولی کے انگرکھے پہننے لگے۔ علاوہ ازیں الخالق اچکن قبا عبا جبہ چغہ مرزئی بھی استعمال ہوتے تھے۔ پاجامے یا تو تنگ موری کے یا اک برے یا غرارے دار ہوتے تھے ڈاڑھی مونچھوں کی وضع بھی ہر خاندان اور ہر پیشہ ور کی علاحدہ تھی۔ آج کی طرح نہیں کہ کوٹ پتلون نے تمیز ہی اڑا دی۔ دوسروں کی پوشاک پہننے میں کوئی شرماتا ہی نہیں علی گڑھ والوں کو شیروانی اور دو تکیوں کے غلاف والا پاجامہ پہننے دیکھا۔ اس کی نقل کر لی۔ پنجابی آئے تو ان کی شلواریں اڑا لیں مونچھوں کی جگہ بچھو پال لیے۔ ڈاڑھی کبھی چو نخ دار ہے تو کبھی صفا چٹ۔ اور تھوڑے دن سے ڈاڑھی کو منڈا ڈال تو مونچھوں کا کھیڑا سنتے آئے تھے آنکھوں سے دیکھ لیا۔ ہندوؤں مسلمانوں کی پہچان

تو ایک طرف مردوں پر عورتوں کا دھوکہ ہونے لگا ہے اور کہاں تک سناؤں۔ بس یہ سمجھ لو کہ دلی کا نقشہ ہی بدل گیا ہے۔

میں۔ مگر یہاں والوں کو فضول کھیلوں دولت کو لٹانے والی بازیوں اور بیکار شغلوں کے سوا کام ہی نہیں تھا۔

مرزا۔ تم کیا جانوں کہ ان کی بازیاں اور ان کے مشغلے کیسے کمال کے تھے ویسے ہنر آج کوئی نہیں پیدا کر لیتا۔ زہرہ پھٹ جائے۔ زہرہ۔ بات یہ ہے کہ ساری چیزیں وقت سے ہوتی ہیں۔ نامردوں کا زمانہ ہے تو نامردوں کی سی باتیں ہیں۔ شریفوں کا شغل۔ ڈنڈ۔ مگدر۔ بانک بنوٹ۔ پھکیتی اکنگ۔ تیراندازی نیزہ باری، پنجہ کشی تھی۔ کہہ دو بیکار تھا۔ تیراکی، کشتی۔ شکرے اور باز کا شکار و پتنگ لڑانا کبوتر بازی وغیرہ سے دلچسپی تھی۔ کہہ دو یہ بھی فضولیات۔

میں۔ فضولیات نہیں تو اور کیا ہیں؟

مرزا۔ جی ہاں فضولیات ہیں۔ خدا کے بندے اُنھی باتوں سے تو دِلّی دِلّی تھی ورنہ شاہجہاں کی بسائی ہوئی محمد شاہی' شاہی دِلّی اور خورجہ بلند شہر میں کیا فرق۔ پھکیت اور بنوٹئے ایسے ہوتے تھے کہ موقع پڑتا تو رومال میں صرف پیسہ یا ٹھیکری باندھ کر حریف کے سامنے آجاتے اور دو جھکائیوں میں ہتھیار چھین لیتے۔ تیراکی کا یہ حال تھا کہ پالتی مارے ہوئے پانی پر بیٹھے ہیں جیسے مسند پر ایک زانو پر۔ پیچوان لگا ہوا ہے دوسرے پر رنڈی بیٹھی ہے دھنواں اڑاتے ملہار سنتے چلے جاتے ہیں قلعے کی حمام والی نہر تو دیکھی ہوگی گز سوا گز کا پاٹ ہے اور بالشت بھر سے زیادہ گہرائی نہیں اس میں آج کوئی مائی کا لال تیر کر دکھائے تو جانوں۔ میر مجھلی تو خیر استاد تھے ان کا سا کمال تو کسے میسر ہے دو چار گز تو لتنے پانی میں تیر کر میں بھی دکھا سکتا ہوں۔

میں۔ اجی جناب آپ ریت پر تیرئے۔ خیالوں پر کھٹری لگائیے۔ نتیجہ؟ کھیل ہی تو تھے۔ پھر یہ کبوتر بازی، پتنگ بازی مرغ بازی بینڈھے بازی کیا بلا تھی، بیچارے بے زبانوں کو لہولہان کرنا، اور اپنا دل بہلانا کیا اچھے ہنر تھے۔

مرزا۔ ارے میاں ایرانی تورانی منچلے وہم ہو کر کیا چوڑیاں پہن لیتے۔ جنگ و جدل کا خیال انسانی قربانیوں۔ ملک ستانیوں کے چاؤ۔ خون کی پچکاریوں سے ہولی کا وقت تو لد گیا تھا نہ

اُن پر کوئی چڑھکر آتا تھا اور نہ یہ کہیں چڑھائی کرتے تھے۔ انگریزی عمل داری کی برکت سے نکسیر بھی نہیں پھوٹتی تھیں۔ وہ جانوروں کو ہی لڑا کے اپنے دل کی بھڑاس نکال لیتے تھے۔ میں کچھ اور کہنے والا تھا کہ مرزا نے ایک جھرجھری لی اور یہ کہتے ہوئے کہ بھئی غضب ہو گیا۔ شام ہونے آئی، کبوتر بھوکے میری جان کو رو رہے ہوں گے اور چوک کا وقت بھی آ لگا ہے۔ لال بند کا جوڑا لگانا ہے۔ یہ جا وہ جا۔

ان باتوں کو ایک مہینہ گزرا ہوگا کہ صبح ہی صبح مرزا صاحب چلے آتے ہیں آتے ہی فرمانے لگے پرانی عید گاہ چلنا ہوگا۔ میں نے کہا خیریت ؟ بولے لکھنوؤں سے پیچ ہیں جانوں دھیری بامالوں ڈھیری پانچ روپے پیچ ٹھہرا ہے۔ بڑا معرکہ ہوگا۔ میں نے عرض کیا صاحب عالم مجھے نہ تو پتنگ بازی سے کوئی دلچسپی ہے اور نہ میرے پاس اتنا فضول وقت ہے کہ آپ کے ساتھ واہی تباہی پھروں۔" تاؤ کھا کر آنکھیں نکالیں حاکمانہ انداز سے کہنے لگے "تمہارے اور تمھارے وقت کی ایسی تیسی۔ بس کہہ دیا کہ چلنا ہوگا دوپہر کو آؤں گا۔ تیار رہنا۔" میں بہت پریشان ہوا مگر کرتا کیا دوستی بھی یا مذاق۔ قہر درویش بجان درویش۔ اپنی ساری ضرورتوں کو طاق پر رکھا اور حضرت مرزا چپاتی کا منتظر تھا کہ ٹھیک بارہ بجے آواز پڑی۔ سید! آؤ۔ آگے آگے مرزا صاحب اور پیچھے میں۔ اجمیری دروازے سے نکل کر قبرستان لانگتے پھلانگتے پرانی عید گاہ پہنچے۔ وہاں دیکھا تو خاصہ میلا لگا ہوا ہے۔ کبابی۔ کچالو والے۔ دہی بڑوں کے چاٹ۔ پان بیڑی پانی پلانے والے سقے پوری خرافات موجود ہے۔ جا بجا پتنگ بازوں کی ٹکڑیاں بیٹھی ہیں۔ مرزا صاحب کو دیکھتے ہی "صاحب عالم ادھر" "مرزا صاحب ادھر" "استاد صاحب پہلے میری سن لیجیے" "میاں ادھر تو آنے دو، بات سمجھتے ہیں نہ بات کی دم اٹھنے سے کام۔ حضرت آپ یہاں آئیے میر کنکیا آپ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں" چاروں طرف سے آوازیں پڑنے لگیں۔ مرزا چونکے ایک ایک کو جواب دیے۔ شامیانے کے نیچے جہاں میر کنکیا تشریف فرما تھے پہنچے۔

میر کنکیا لکھنؤ کے واجد علی شاہی پتنگ باز تھے۔ کاکر تیری رنگ گول چہرہ چھوٹی چھوٹی آنکھیں بڑی ناک۔ دانتوں میں کھڑکیاں۔ سر پر کٹر پٹے۔ خشخاشی داڑھی، چھاتی کھلا۔ نیجات دار ڈھیلا ڈھالا انگرکھا۔ سر پر دو انگل کی کلابتوں کے حاشیے کی ٹوپی۔ پاؤں

میں مخملی گرگابی۔ کلے میں گلوری۔ اٹھ کر مرزا چپاتی سے بغل گیر ہوئے۔ پھر جو پتنگ بازی کا ذکر شروع ہوا تو تین بج گئے۔ میں بے وقوفوں کی طرح بیٹھا ہوا ایک ایک کا منہ تکتا رہا۔ پتنگ بازی کی ہوتی تو اس کی اصطلاحیں سمجھ میں آتیں آخر خدا خدا کر کے لوگ اپنی اپنی ٹکڑیوں میں گئے۔ آسمان پر چیل کوے منڈلانے شروع ہوئے۔ میں مرزا صاحب کے ساتھ تھا۔ عید گاہ کی دیوار کے نیچے سے انھوں نے بھی اپنا اختر بختر کھول کر ایک انگارا دھا اڑایا۔ ہچکا ایک لڑکے کے ہاتھ میں تھا، کوئی دس منٹ تک جھکائیاں دیتے رہے۔ پیچ ہوا۔ کبھی آگے بڑھتے کبھی پیچھے ہٹتے رہے۔ ایک دفعہ ہی جھلا کر لڑکے کو طمانچہ رسید کیا اور بولے "ابے ہچکا پکڑنے کی سرت بھی نہ تھی تو یہاں آن کیوں مرا۔ آخر کٹوا دیا نا!"

پھر ایک الفن بڑھائی اور اب کے ہچکا پکڑنے کی خدمت مجھے انجام دینی پڑی۔ بدقسمتی سے یہ گڈی بھی کٹ گئی بہت بگڑے کہ بس جب تم جیسے منحوس ساتھ ہوں تو ہم اڑا چکے۔ غضب ہے سانولیا ہمیں استاد کہنے والا۔ میر گولنداز ہمارے یہاں کے شاگرد۔ شیخ پیچک جیسے پیچ کھاؤ برابر پیچ نکالے جاتے ہیں اور مرزا فخرو او پر نیچے دو کنکوے کٹوائے۔ "سیمٹو میاں سیمٹو مجھے اپنی استادی تھوڑی گنوانی ہے" وہ کہتے رہے میں تو وہاں سے ہٹ کر رومال بچھا کر الگ جا بیٹھا۔ تھوڑی دیر میں وہ بھی اپنا اسباب جہالت لنگی میں باندھے میرے پاس آ بیٹھے تیوری پر بل تھے۔ چہرہ سرخ آنکھیں ابلی ہوئی۔ میں نے کہا مرزا صاحب ہوا کا کھیل ہے۔ اس میں کسی کی کیا بیری۔ آپ کی استادی میں کوئی فرق آتا ہے۔ سلطنت ہی جب ہتھے پر سے کٹ گئی تو ان دو کاغذ کے ٹکڑوں کا کیا غم۔ آپ آپ ہی ہیں۔ کہنے لگے سچ کہتے ہو میاں ہم قلعے والوں کی تقدیر ہی خراب ہے۔ ہوا بھی موافقت نہیں کرتی۔ میں نے ان کے بشرے سے ان کی دلی کیفیت کا اندازہ کرتے ہوئے اس ذکر کو موقوف کر دیا۔ اور پوچھا۔ کیوں مرزا صاحب قلعہ جب آباد تھا اس وقت بھی پتنگ بازی کے ایسے ہی دنگل ہوتے تھے ؟

مرزا۔ ایک دھوپ تھی کہ ساتھ گئی کہ آفتاب کے اس وقت کا سماں کیوں کر دکھاؤں میاں ہر بات میں ایک شان تھی ایک قاعدہ تھا اور ہزاروں غریبوں کی روٹیوں کے سہارے معمول

تو اکہ عصر کا وقت ہوا اور سلیم گڑھ پر جمگھٹ لگا۔ بڑے بڑے پتنگ دوتاوی اور سہ تاوی
نکلیں۔ ڈور کی چرخیاں لے کر شاہی پتنگ باز پہنچ گئے۔ خلوت کے امیر اور شوقین شہزادے
مرزا ننھو، مرزا کدال، مرزا کالیٹن، مرزا چڑیا، مرزا جھرجھری۔ آ موجود ہوتے۔ یہ سلاطین زادے بہت منہ
چڑھے تھے۔

میں۔ (بات کاٹ کر) حضرت یہ نام کیسے؟ کیا اسی بولی کا نام اردوئے معلیٰ ہے۔

مرزا۔ کچھ پڑھا لکھا بھی یا گھاس کھودتے ہی رہے ہو۔ ارے زبان کی ٹکسال قلعے میں ہی تو تھی
وہاں محاورات نہ ڈھلتے تو کہاں ڈھلتے۔ طبیعتیں ہر وقت حاضر رہتی تھیں۔ ہر بات میں جدت مدنظر
تھی ہنسی مذاق میں جو منہ سے نکل گیا گویا سکہ ڈھل گیا کسی کے چپٹے چپٹے دیدے ہوئے مرزا ننھو کہہ
کہہ دیا۔ لمبا چہرہ چگی داڑھی دیکھی مرزا چگا۔ یا مرزا کدال۔ کہنے لگے۔ چکلے چہرے والے پر چوپال کی اور
ٹھگنے پر گھٹنے کی پھبتی اڑا دی۔ غرض کہ مرزا چیل، مرزا چھپٹ، مرزا پابو، مرزا نگیلے، مرزا رسیلے
بیسیوں اسم بامسمّیٰ تھے۔ میں جمعرات کو چپاتیاں اور حلوے بانٹا کرتا تھا میرا نام مرزا چپاتی مشہور کر دیا۔

میں۔ لیجیے۔ ہمیں آج تک مرزا چپاتی کی وجہ تسمیہ ہی معلوم نہیں تھی۔ یہ آپ کا خیر سے ٹکسالی نام ہے۔

مرزا۔ اب زیادہ نہ اتراؤ قصہ سنتے ہو یا کوئی پھبتی سننے کو جی چاہتا ہے۔

میں۔ اچھا اب کان پکڑتا ہوں۔ بیچ میں نہیں بولوں گا۔ فرمائیے۔

مرزا۔ سب سامان لیس ہو گیا تو بڑے حضرت کی سواری آئی۔ دعا سلام مجرے کے بعد حکم لے کر
دریا کی طرف پتنگ چڑھایا گیا۔ دوسری جانب سے معین الملک نظارت خاں۔ بادشاہی ناظر کا۔

مرزا۔ باورجنت بہادر۔ یا جس کے لیے پہلے سے ارشاد ہو چکا ہے۔ پتنگ اٹھا۔ ریتی میں سوار کھڑے
ہو گئے۔ پیچ لڑے۔ ڈھیلیں چلیں۔ پتنگ یا تکلیں جھکتی ہوئی چلی جاتی ہیں یا ہاتھ روک کر ڈور دی۔ تو
ڈوبتے ڈوبتے آسمان سے جا لگیں پٹھا چھوڑ دیا۔ ڈوریں زمین تک لٹک آئیں۔ سواروں نے دوشاخیں
بانسوں پر رکھ لیں پتنگ کٹا تو دریا کے وار پار دوڑ پڑ گئی۔ ڈوریں لٹیں۔ پتنگ کے پیچھے پیچھے غول کے
غول شاہدرہ تک نکل گئے جس نے وہ تکل یا پتنگ لوٹی۔ پانچ روپے کی مزدوری کی ڈور بھی بیس بیس تیس تیس
[illegible] ہاتی تھی۔ بادشاہ کبھی تو خالی سیر ہی دیکھتے۔ جب کبھی جی میں آتا تو تخت رواں سے اتر پڑتے تکلی کے
تکلوں کے۔ [illegible] انہیں میں تھے ایک آدھ پیچ لڑا اور ہنستے ہوتے محل معلیٰ میں داخل ہو گئے۔ رسید!

یہ بھی خبر ہے کہ وہ پتنگ یا تکلیں کتنی بڑی اور کیسی محنت سے بنائی ہوئی ہوتی تھیں؟ تکلیں تو
تمہارے پیدا ہونے سے پہلے مرچکیں۔ خیر میں کبھی ان کی تصویر دکھا دوں گا۔ وہ تو قدآدم ہوتی
تھی اور ایک ایک کی تیاری میں کئی کئی دن لگ جاتے تھے ڈوریں بھی ایک بلی دو بلی چوبلی کنکوؤں
اور تکلوں کے زور کے موافق بنتی تھی۔ مانجھوں کے نسخے بھی ہر گھرانے کے الگ تھے۔ تکلیں تو
تکلیں آج ویسے پتنگ بھی نہیں بنتے ہیں نہ کسی میں اتنا بوتا ہے کہ اس کی جھونک سنبھال سکے چھوٹی
تکلیں رہ گئی ہیں۔ یا بڑے نامی پتنگ بازوں کے یہاں ادھے وہ بھی کنکوے نہیں گڈیاں
ہوتی ہیں۔ لنڈوری پن چھلے کی۔

میں۔ بھئی واقعی لطف تو بڑا آتا ہوگا۔

مرزا۔ جہاں اپنی حکومت، گھر کی بادشاہت اور پرائی دولت ہوتی ہے۔ یہی رنگ ہوا کرتے
تھے۔ عشرت گاہوں میں بروقت نمازیں نہیں پڑھی جاتیں۔ مجاہدے اور مراقبے نہیں ہوتے۔
اٹھائیں تو زندگی کی راحتیں کون اٹھاتے دنیا میں ہمیشہ یہی ہوتا رہا ہے اور یہی ہوتا رہے گا۔
سلطنتوں کی بھی عمریں ہوتی ہیں جس طرح آدمی کوئی پیٹ میں کوئی پیدا ہوتے ہی، کوئی
بچپن میں کوئی جوان ہو کر اور کوئی عمر طبعی طے کرنے کے بعد مرتا ہے۔ اسی طرح بادشاہتیں ہیں، کوئی
ایک پشت چلتی ہے۔ کوئی دو پشت۔ کسی کا سلسلہ سو پچاس برس میں ہی ٹوٹ جاتا ہے اور کسی
کی عمارت صدیوں کی خبر لاتی ہے۔ مغلوں نے چھ سو برس تک تخت کو سنبھالا آخر بڑھاپا تو سب کو
آتا ہے۔ ان کے کندھے بھی شل ہو گئے۔ دنیا کا یہی کارخانہ ہے۔ آج اس کا تو کل اس کا زمانہ ہے
عروج اور زوال بہانہ ڈھونڈتے ہیں، ہمارے لیے عیش عشرت ہی بہانہ ہو گئی

میں سمجھتا تھا کہ مرزا نرے شہزادے ہیں اور ان کی معلومات میں بازیوں کے سوا کچھ نہیں ہے
آج معلوم ہوا کہ قلعے والوں کا دماغ بگڑی میں بھی کتنا بنا ہوا تھا۔ میں نے کہا، مرزا صاحب! یہ آپ
نے کس فلسفی کا لیکچر یاد کر لیا ہے۔ دو چار جملوں میں کیسے کیسے نکتے حل کر گئے۔ بولے پیارے ہمارے
زوال پر نہ جاؤ۔ جان کر دیوانے بنے ہوئے ہیں نہیں تو کیا نہیں جانتے کیا نہیں آتا ہے

عالم میں اب تلک مذکور ہے ہمارا   افسانہ محبت مشہور ہے ہمارا

دِلّی کی پھول والوں کی سیر

خواجہ محمد شفیع

(پہلے مسٹر آصف علی بیرسٹر کے مضمون کا کچھ حصّہ پڑھا گیا جس میں انھوں نے پچاس سال پہلے کی سیر کا نقشہ کھینچا تھا۔ اس مضمون کا آخری جملہ تھا "سیر ہو چکی"۔)

سیر ہو چکی مگر سیلانی جیوڑے ابھی زندہ ہیں۔ دِلّی اجڑ گئی پر مرے گرے دلّی والے اب بھی اس اُجڑے دیار کے کونوں کھدروں میں پڑے ہوئے ہیں۔ فارغ البالیاں نہیں وہ پوتڑوں کے رئیس اب دکھائی نہیں دیتے تاہم فاقہ مستوں کی کمی اب بھی اس شہر میں نہیں۔ میلے ٹھیلے اب بھی ہوتے ہیں وہ گہما گہمی نہ سہی۔ سیریں اب بھی منائی جاتی ہیں مانا کہ اس شان کی نہیں۔

داستان پارینہ تو آپ سُن چکے یا یوں کہیے کہ پھول والوں کی سیر کا مرثیہ تو آپ کی نذر کیا جا چکا۔ اس کو بھول جائیے۔

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سُنا افسانہ تھا۔

اب بیسویں صدی کی سیر دیکھیے۔

پہلے یہ تیز رفتار سواریاں تو تھی نہیں جن کو اکثر بڑھیاں ٹھڑیاں شیطانی چرخے کے نام سے پکارتی ہیں۔ میری مراد موٹر سے ہے۔ بہلیاں تھیں۔ چھکڑے تھے۔ سیج گاڑیاں پالکی نالکی۔ ہوادار غرض کہ مہینوں کی ساخت مہینوں میں طے ہوتی تھی اور گھنٹوں کی گھنٹوں میں۔ اب زمین کی طنابیں کھنچ گئی ہیں۔ مہینوں کے سفر گھنٹوں اور گھنٹوں کے پلوں میں طے ہو جاتے ہیں۔ آن کی آن میں آدمی کہیں کا کہیں نکل جاتا ہے اجمیری دروازے سے لاری میں بیٹھنے کی دیر ہوتی ہے قطب صاحب پہنچنے کی نہیں۔ دم کے دم میں حضور کا مقبرہ اور وہاں بجو فراٹا بھرا تو قطب صاحب پر تھے۔ فی زمانہ سب کام چلتا پھرتا ہے ہماری سیر بھی چلتی پھرتی ہوتی ہے۔ صبح اجمیری دروازہ گئے چار آنہ میں پندرہ منٹ کے اندر قطب صاحب جا پہنچے شام کو واپس۔ پہلے لوگ دنوں پہلے سے جاتے تھے۔ ڈیرے ڈلتے تنبو تانتے۔ گھر بنا کر بیٹھتے تھے جنگل میں منگل اب بھی ہوتا ہے پر کچھ پل کے لیے۔ پہلے ہر کام میں سکون اور اطمینان تھا۔ اب یہ چیز رواں دواں ہے۔

لو بھائی باتوں باتوں میں وقت گزر گیا۔ شام ہونے کو ہے سورج غروب ہوا چاہتا ہے۔ آؤ مینا بازار کے کسی کوٹھے کی چھت پر سے سیر کی سیر کریں۔

اللہ اللہ کیا کیا دربائے شہرار اس خاک میں دفن ہیں۔ ایک جانب رائے پتھورا کے قلعے کی دیواریں ہندو عظمت و شان کی داستان سناتی ہیں۔ لوہے کی لاٹھ شمع فسردہ کی طرح اجڑی ہوئی محفل کی یاد دلاتی ہے۔ سامنے قطب مینار اس ذات لایزال کی وحدانیت کا چار دانگ عالم میں اعلان کر رہی ہے جس کے دست قدرت میں فنا بقا ہے اس کے پہلو میں ناتمام لاٹھ زندگی مستعار کی بے ثباتی کا ثبوت دے رہی ہے اور زبان حال سے کہتی ہے ؎

اس شمع کی طرح سے جس کو کوئی بجھا دے
میں بھی جلے ہوؤں میں ہوں داغ ناتمامی

وہ تاجدار سر جس کے سامنے بڑے بڑے سورماؤں کے سر جھکتے آج اس اس خاک میں سرنگوں پڑے ہیں وہ تلوار چلانے والے بازو جن کے قبضہ اقتدار میں عنان حکومت تھی جن کا لوہا

ایک عالم مانتا تھا عاجز و لاچار شکارِ اجل ہو کر سپردِ خاک کر دیئے گئے اور چند بوسیدہ قبروں کے سوا کچھ نہ بچا جن کے نقارہ کی آواز ساتویں آسمان تک جاتی تھی جن کے محل کی آرائش کو رضوان بھی للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتا تھا۔ ع

چپ پڑے ہیں قبروں میں ہوں نہ ہاں کچھ بھی نہیں

یہ حال ہے دنیا کے بادشاہوں، راجاؤں اور تاجداروں کا۔ اب ذرا دوسری طرف دیکھیے۔ خواجہ خواجگان حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کا مزار مبارک پیش نظر ہے اللہ اللہ آج بھی یہ بزرگ دلوں پر حکومت کر رہے ہیں دربار جما ہے۔ مجرائی مجرے عرض کر رہے ہیں۔ نذر و نیاز پیش ہو رہی ہے۔ کسی کی مجال نہیں کہ مزار مبارک کی طرف پشت کر سکے۔ آداب دربار کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔ ورنہ نقیب سرزنش کے واسطے موجود غرض کہ مہرولی کی سرزمین دیدۂ عبرت نگاہ اور گوش نصیحت نیوش کے واسطے ایک دفتر عبرت ہے۔

(نفیری کی آواز)

لیجیے وہ پنکھا آن پہنچا

بھئی کیا خوشنما بنایا ہے۔ کسی استاد کی کاریگری معلوم ہوتی ہے اور کیوں نہ ہو میاں میتا کے ہاتھ کا ہے۔ پنکھا کیا ہے پھولوں کی کیاری معلوم ہوتی ہے لال لال پھول کیا مزہ دے رہے ہیں۔ استاد تمہارے قدم لے۔ کس خوبی سے رائے بیل۔ بیلا۔ چنبیلی۔ گلاب کو گوندھا ہے ڈنڈی تک پر کنٹھے لپٹے ہیں اور کیوں نہ ہو خیر سے پھول والوں کا پنکھا ہے۔ آگے آگے ٹپا بانڈل کا اکھاڑہ ہے اس کے پیچھے ڈنڈے والے اپنا کمال دکھا رہے ہیں۔ واللہ کیا تال سر کے ساتھ کام کرتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ انسان نہیں۔ مشین گردش میں ہے۔ ٹھیک وقت پر ہاتھ پہنچتا ہے۔ کیا ممکن کہ دیر سویر ہو جائے۔ اور کیوں نہ ہو اسی دن کے لیے برسوں سے محنت کر رہے تھے۔ لیجیے وہ ترنم والے آ پہنچے یہ بھی کام مشکل ہے جس کے ریاض بندھے ہوئے ہوں وہی کر سکتا ہے ہر ایک کے بس کا روگ نہیں پنکھے کے ساتھ آدم سا آدم ہے تو مجھ پہ میں تجھ پہ بلا مبالغہ تھالی چھوڑیئے تو سروں پر جائے گی پر یہ بھیڑ بھاڑ تھوڑی دیر کی ہے پھر

قدرے چھیڑ ہو جائے گی۔

لیجیے وہ جنت کی چڑیاں چلی آ رہی ہیں۔

باہر والا۔ ہائیں! یہ جنت کی چڑیاں کیسی؟

دِلّی والا۔ ارے میاں! جنت کی چڑیاں نہیں جانتے واہ بھئی واہ ہیجڑے اپنے آپ کو جنت کی چڑیاں کہتے ہیں۔ اب جب آپ کے گھر میں خوشی کے دن قریب آئیں تو ان کو دلی سے آنا پھر دیکھنا کیا سیر ہوتی ہے یہ غوغائی گھر پر آ کر وہ شور و شغب مچائیں کہ کانوں کے پردے پھٹ جائیں جہاں کسی کے ہاں لڑکا ہوا اور یہ اللہ کی اماں پیرزلوں کا سایہ کرتے آن دھمکے بن لیے ٹلتے نہیں۔ اگر کوئی سیدھی طرح نہیں دیتا تو مغلظات سنانی شروع کرتے ہیں پھر بھلا یہ آئیں تو جائیں کہاں ایک ایک ایسی ایسی موٹی سناتے ہیں جو نہ کہی جائے نہ اٹھائی جائے اور جو کوئی ڈانٹ ڈپٹ بتاتا ہے تو وہ وہ پھبتیاں کستے ہیں ایسے ایسے فقرے چست کرتے ہیں کہ بیچارہ اپنا سا منہ لے کر رہ جاتا ہے اور خود ایسے چکنے گھڑے ہوتے ہیں کہ کسی بات کا اثر ہی نہیں ہوتا۔ آپ جوتے مارے جایئے یہ اپنی بکواس کیے جائیں گے انجام کار عاجز آ کر "دہنِ سگ بلقمہ دوختہ بہ" کا مضمون کرنا پڑتا ہے۔

ایک کارخندار جو بابو جی کے پاس کھڑے تھے اور جان پہچان کے تھے بولے۔

کارخندار۔ اجی بابو جی کس فکر و وحشت میں ہو؟

بابو جی۔ میاں کارخندار ہم یہ سوچ رہے ہیں اچھے خاصے پیسے سیر کی نذر ہو گئے۔

کارخندار۔ واہ بابو جی آپ لوگوں کا کیا ہے آپ تو پیسے کی طرف سے نچنت ہیں۔ گھر بیٹھے رقم آ جاتی ہے مشکل تو ہم غریبوں کی ہے سچ کہتا ہوں بابو جی آج کل دو روٹیوں کے بھی ٹوٹے پڑے ہوئے ہیں۔

بابو جی۔ پھر میاں ایسے مندے میں تم یہاں کیسے آن پہنچے؟

کارخندار۔ کیسے آن پہنچے۔ بس کچھ نہ پوچھو ہم نے گھر والی سے ناواں اینٹھ لیا پر بڑی مشکلوں سے دیا۔

بابو جی۔ میاں کماتے تو تم ہو اور ناواں گھر والی کے پاس یہ کیا بات؟

کارخندار۔ بابو جی بات یہ ہے۔ یار خاں جو کماتے ہیں سو اڑاتے ہیں پر میری گھر والی بڑی ہی سلیقے والی ہے۔ وہ روز آٹے دال کے خرچے میں سے کتربیت کرتی رہتی ہے۔ اور؟

پاولا اس کنے رہتا ہے اور اس کے لینا یار لوگوں کے بائیں ہاتھ کا کام ہے سو بابوجی ایمان کی تو یوں ہے کہ ہم تو گھر والی کے صدقہ میں آ گئے اور بابوجی ہماری کیا بیل۔ بیل تو تم لوگوں کی ہے۔ اب یہ بتایئے آپ یہیں ٹنگے رہیں گے یا کہیں پھرنے بھی چلیں گے۔

بابوجی۔ ہم تمہارے ساتھ ہیں جہاں چاہے لے چلو۔

کارخندار۔ اچھا تو آیئے ذرا نیچے چلیں۔

(کٹوری کی آواز)

لیجیے وہ سقّوں کی ٹولی چلی آ رہی ہے۔

بابوجی۔ کیوں میاں کارخندار کوئی سقّوں کی بات یاد ہو تو سناؤ۔

کارخندار۔ اچھا سنیے۔ سقّے کا لونڈا سقہ کہلائے۔ باندھے لال لنگوٹی کٹوری بجائے۔ لائے نل کی کنویں کی بتائے صبح بلاؤ تو شام کو آئے۔

بابوجی۔ واہ کیا کہنے سقّے کا نقشہ کھینچ دیا۔ بندہ نواز اس شہر میں سقّے اسی حلیہ اور اسی قماش کے ہوتے ہیں لال کسا و اکمرے باندھے رہتے ہیں۔ کٹوری بجانا ان کا خاندانی فن ہے اور کیسی کیسی سریلی کٹوری بجاتے ہیں ان ہوئے کا سننے کو دل چاہے آیئے آپ کو بھی سنوا دیں۔

(کٹوری بجنا)

کارخندار۔ آیئے بابوجی اب ذرا کسی بائی جی کا گانا سنیں۔

بابوجی۔ بسم اللہ

کارخندار۔ وہی بابوجی شام کو جد میں ادھر سے جا رہا تھا تو اس کوٹھے پر بڑی انوٹ کی لگائی نظر پڑی تھی ذرا کی ذرا دیکھ لیں

بابوجی۔ ہم تو تمہارے ساتھ ہیں۔

کارخندار۔ اچھا تو آیئے۔

بابوجی۔ بھائی آگے تم چلو۔

کارخندار۔ واہ بابوجی۔ آپ بھی بڑے جھینپو ہیں اچھا لیجیے میں ہی آگے چلتا ہوں۔

بے نظیر۔ آداب عرض کرتی ہوں۔

بابوجی۔ تسلیم۔

کارخندار۔ جیتی رہو۔ بیگم جیتی رہو۔

بابوجی۔ آپ کا اسم گرامی؟

بے نظیر۔ لونڈی کو بے نظیر کہتے ہیں۔ کیا میں جناب کا اسم شریف دریافت کر سکتی ہوں؟

بابوجی۔ مجھے بدر منیر کہتے ہیں اور کیوں بیگم آپ رہنے والی کہاں کی ہیں؟

بے نظیر۔ میں احسن پورہ کی رہنے والی ہوں۔ اور سرکار؟

بابوجی۔ یہ ناچیز عشق نگر میں رہتا ہے۔ اچھا بی بے نظیر۔ باقاعدہ تعارف تو ہو چکا۔ اب کچھ سناؤ۔

بے نظیر۔ جو حکم! کیا سناؤں؟

بابوجی۔ ہم کو تو کوئی غالب کی غزل سنا دو

گانا

بابوجی (چلتے ہوئے) اچھا بی بے نظیر

اب تو جاتے ہیں میکدہ سے میر

بے نظیر۔ پھر بھی تشریف لایئے گا۔

بابوجی۔ ہم تو ہزار دفعہ آئیں۔ آپ بلائیں بھی

بے نظیر۔ بلائیں تو لاکھ۔ آپ آئیں بھی۔ اب دانا ڈالنا پڑے گا۔

بابوجی۔ بھلا سرکار کو دانہ ڈالنے کی کیا ضرورت ہے؟

گندمی رنگ بھی ہے زلف سیہ فام بھی ہے

بے نظیر۔ حضور گردان معلوم ہوتے ہیں۔

بابوجی! اجی یہاں گردان کو کون گردانے ہے۔ اس کوچہ میں تو پر قینچ رکھے جاتے ہیں۔ اچھا خدا حافظ۔

کلی

آصف علی

غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں

شعر کی ہستی کی اُمید، ثمر کی بقا کی نوید، پھول کی آرزو کا راز، رنگ و بو کے مضمون کا اعجاز، بادِ سحر کی منتوں کی مراد، شبنم کی عرق ریزی کی داد، تاروں کی شب بیداری کا انعام، بلبل کے زمزموں کا انجام، کائناتِ عالم کے راز کی سربمہر نشانی، قدرت کی خودداری اور خودنمائی کی کہانی کلی عالمِ موجودات کا ایک لاثانی کرشمہ اور دنیائے امکان کا لاجواب معما ہے۔

دیکھنے میں تو پانچ سات پنکھڑیاں ہیں جو سر جوڑے شرمائی لجائی کھڑی ہیں مگر سحرِ فطرت کی کیا کیا نیرنگیاں ان میں چھپی ہوئی ہیں۔ جب تک ان کی آنکھ نہ کھلے گی نہ معلوم ہوگا۔ اِدھر نسیم سحری نے انھیں جھنجھوڑا، اُدھر شبنم نے منہ پر ٹھنڈے ٹھنڈے چھینٹے دیے۔ سورج کی کرن کے نمودار ہونے سے پہلے ان کی آنکھ کھلی۔ گھر بھر مہک گیا، باغ معطر ہوگیا۔ رنگین غبار اڑنے لگا۔ رنگ آنکھوں میں کھلنے لگا جدھر دیکھو رنگ و بو پر پرواز کھولے اڑ رہے ہیں، بو کی لپٹیں اس طرح آ رہی ہیں جیسے پریوں کے غول اور رنگ اِس طرح کھل رہا ہے جیسے بچوں کا قہقہہ۔ یہ

معلوم ہوتا ہے کہ پھول سے بچے آپس میں بیٹھے کھیل رہے ہیں اور ذرا ذرا سی بات پر کھلکھلا کھلکھلا کر ہنس دیتے ہیں۔ سورج نکل آیا اور اس کی سنہری کرنیں پھولوں کو گود میں کھلانے لگیں۔ ان کے شبنم آلود رخساروں کو بوسے دے دے کر تازگی لوٹ لی۔ آفتاب اب سوا نیزے پر ہوگا۔ تمازت بڑھ چلی، نازک پنکھڑیاں کُھلانے لگیں۔ اِدھر سورج کی کرنیں اُدھر شہد کی مکھیاں اور اگر ان دونوں سے بھی شاید جاں بری ہو تو گلچیں موجود ہے۔

ہے عدم میں غنچہ محوِ عبرتِ انجامِ گل
یک جہاں زانو تأمل در قفائے خندہ ہے

دیکھنے والوں کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ پھول ہنس رہے ہیں، کھلکھلا رہے ہیں مگر شاعر کہتا ہے کہ وہ کلیاں جو ابھی عالمِ ہستی میں نہیں آئیں، پردۂ عدم کے پیچھے آنکھوں سے چھپی بیٹھی ہیں اور یہ تماشا دیکھ رہی ہیں اور رہ رہ کر کہتی ہیں: "ہے ہے! کون اس عالمِ ہستی میں جائے، لو ایک کھلنا کیا تھا مصیبت تھی۔ اِدھر پھول کھلا اور اُدھر ایک دنیا جہاں اس کا دشمن ہوا کوئی آیا اور اس نے بے دردی سے ادھ کھلی کلی ہی کو چھٹک لیا۔ کہیں لوگ توڑ توڑ کر بیچ رہے ہیں تو کہیں کوئی سوئیاں چبھو چبھو کر ہار گوندھ رہا ہے، گجرے، کنٹھے، سہرے اور بدھیاں بن رہی ہیں۔ اِدھر ذرا مرجھائے اُدھر پھینک دیے گئے اور بلا سے یہ بھی سہی مگر اِدھر تو یہ مصیبت اور اُدھر بادِ صبا رنگ و بو لیے اڑتی ہے۔ کہیں ٹھکانا نہیں۔ کسی کے ہاتھ کو چین نہیں۔ جو ہے وہ نوچنے کھسوٹنے پر تیار اور ہر ایک ملنے دلنے پر آمادہ۔ کہیں لوگ کپڑوں کی تہوں میں بچھا رہے ہیں۔ کہیں کتابوں کے ورقوں میں دبا رہے ہیں۔ کوئی رنگ کے کارن توڑ رہا ہے تو کوئی خوشبو کی غرض سے۔ عطر کھینچنے والا سب پر سبقت لے جاتا ہے کہ کھولتے پانی میں ڈالتا اور بے دردی سے پھول کے رازِ بو کو قطرہ قطرہ کرکے اس سے چھین لیتا ہے اور پھر عطر کی شیشیاں خاص و عام کے ہاتھ بکتی ہیں۔ بھلا اس مصیبت میں کوئی کیوں پڑے، پھر اگر عدمستان میں کلیاں زانوئے تأمل ہو کر نہ رہیں تو کیا کریں۔ اگر وہ اس زہر خندہ کے پس پشت عبرت کا نمونہ نہ ہوں تو کیا کریں۔ اس پر بھی اکتفا ہو تو غنیمت ہے۔ مگر وہاں تو ایک دوامی دور بندھا ہوا ہے۔ اِدھر مرجھائے اور اُدھر ثمر میں اور کلیوں اور پھولوں کی آرزو سے ثبات کے بیج بوئے گئے۔ کھلتے ہیں تو مشکل

نہ کھلنے کا چارہ نہیں۔ یا الٰہی! کس وبال میں پھنس گئے، کس مصیبت کا شکار ہو گئے۔

نہیں نہیں یہ غلط ہے۔ مصیبت اور کلفت کا کوئی واسطہ نہیں۔ ہر کلی میں ایک تمنا مقفل ہے جو بو ہو کر مشامِ عالم کو معطر کر دیتی ہے اور ایک شوقِ خود آرائی ہے جو رنگ ہو کر آنکھوں میں کھب جاتا ہے۔ اے کاش! اس کی آرزوئے ہستی اس طرح مقید نہ ہوتی اور اس کو اپنی ہستی سے تمام عالم کے بو دینے کا موقع ملتا۔

مگر نہیں، بھولو نہیں، یہ موقع بھی اُسے میسر تھا۔ کبھی ارتقائی درجے میں وہ زمانہ بھی تھا کہ تمام ارض صرف ایک پھول کے زیرِ نگیں تھی۔ ایک ہی رنگ کی سلطنت تھی۔ لہر وادی و لب جو ایک ہی پھول کے پالنے بنے ہوئے تھے۔ قدرت نے اسے وہ موقع بھی دیا کہ تمام عالم اس کی ہستی سے پُر ہو۔ اس نے سب موجودات پر حکمرانی کی۔ مگر تعیش، افراطِ دولت اور تساہلی، وفورِ تعیش کا نتیجہ تھی۔ جب اس کے دولت و اقبال کا ستارہ چپے چپے پر پھول ہو کر چمکتا تھا اور ایک ایک پھول قد و قامت میں آفتاب کی ہمسری کرتا تھا، تو تساہل نے اُسے آلیا اور اس کی جنس میں وہ تمام نقائص نہیں گئے جو تساہل کا نتیجہ ہیں۔ اُدھر قد و قامت گھٹا اِدھر اس کی افراط کم ہوئی۔ دوسری جنس کی ابتدائے ہستی ہوئی اور رفتہ رفتہ پھول کی حکمرانی سے ارض آسودہ ہو گئی اور ارتقائے مدارج دیگر اجناس طے کرنے لگیں۔

اس ارض کی ہستی میں وہ زمانہ بھی آیا تھا کہ تمام زمین گیاہ سے ڈھکی ہوئی تھی اور وہ زمانہ بھی آیا کہ جب پرسیاوشاں کا دور دورہ تھا۔ اس وقت بجز پرسیاوش کے اور کسی کا چراغ نہ جلتا تھا اور اس وقت کے سیاوش بھی سر بہ فلک کشیدہ تھے۔ آج کل کے نازک پرسیاوشاں اسی شاندار ہستی کا تنزل پذیر اور کاہش آثار بقیہ ہے۔ ہزارہا صدیاں گذریں کہ بقائے ہستی کے لیے پھول اختراع ہوا۔ مگر ارتقائی تلوار نے اُسے بھی قلم کیا اور اب محض ایک نمونہ باقی ہے۔ پھل مدت بعد پیدا ہوا اور وہ محض لالچ دینے کے لیے۔ ایک نام ہی ہے کہ ہر کس و ناکس اس کے ذائقے کی خاطر اُسے مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب ہر جگہ اور ہر ملک میں لے جاتا ہے اور خواہ وہ بار آور ہو یا نہ ہو مگر ہو کر اس کی نگہداشت کرتا ہے۔ کسی نے پھلیاں بنائیں جنھیں پرندے اپنے شکم میں لیے جگہ جگہ بیج بوتے پھرتے ہیں۔ کہیں غبارہ نما بیج مثل سنبھل کے

تیار کیا کہ جو خود دوشِ صرصر پر سوار ہو کر ایک ملک سے دوسرے ملک میں پہنچے۔

کلی یا پھول، ثمر یا شجر، کسی ایک کا دوسرے سے جدا کرنا اور ان کی جدا ہستی کا خیال کرنا غیر ممکن ہے، یہ ہے تو وہ بھی ہے۔ ورنہ ایک نہ دوسرا۔ اسی طرح دُنیا میں ہر ایک کے لیے یہ کیفیت ہے جو نظرِ غامض رکھتے ہیں۔ ان کے لیے پھول اور ثمر کی نسبت ہر جگہ موجود ہے۔ ایک وجود کا دوسرے وجود سے اسی قسم کا تعلق معلوم ہوتا ہے۔ ایک قوم کا دوسری قوم سے بھی واسطہ نظر آتا ہے۔ مگر یا ایں ہمہ

کھل کے مرجھائے گی بلکہ مر جائے گی
ہر کلی میں نہاں ہے ستم کی خبر

کائناتِ عالم خود ابھی ایک غنچۂ ناشگفتہ ہے۔ رنگ و بو ابھی پنکھڑیوں میں مقفل ہیں۔ وہ بھی دن آئے گا کہ رازِ سربستہ کی مہرِ سکوت ٹوٹے گی اور ہر کس و ناکس کا مشامِ وجود بوئے بقا سے معطر ہوگا۔

تیسرا منظر

آنکھ کی شرم

مرزا محمود بیگ

میرے دوست کہتے ہیں کہ میری طبیعت میں مروّت زیادہ ہے بلکہ ضرورت سے کچھ زیادہ ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اتنا مروّت برتنا بھی ٹھیک نہیں ہے۔ میں خود بھی کبھی سوچتا ہوں کہ شاید وہ ٹھیک کہتے ہیں۔ اور لوگ میری طبیعت سے چوں کہ واقف ہیں اس لیے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔

ایک دفعہ ارادہ بھی کیا کہ بس آج سے مروّت ختم۔ اب کوئی ملے گا تو اس سے صرف معاملے کی بات کروں گا۔ اس ارادے کے ساتھ کچھ دیر جان کر منہ لٹکائے رکھنے کی کوشش کی۔ جب کوئی ملا تو مزاج پرسی کے بعد خاموش رہنے کی بھی کوشش کی۔ جو لوگ میری نرمی سے ناجائز فائدہ اٹھانے کے عادی تھے۔ جب انھوں نے مجھے اس حالت میں دیکھا تو موقع کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے ذرا ٹل گیے مگر میں اپنی اس کوشش سے بہت جلد تھک جاتا ہوں آخر کب تک ماتھے پر بل ڈالے رکھوں۔ کب تک ہونٹوں کو سیے رہوں کب تک اپنی طبیعت کے خلاف اپنے مزاج کو خشک بنائے رکھوں لب و لہجے کو بدلے رہوں..... اب آپ جو

چاہے کہہ لیجیے۔ مگر میں کیا کروں۔ طبیعت ہی کچھ ایسی ہے کہ اس گھٹن کو پسند نہیں کرتی۔

اور جیسے کوئی چپکے سے کہتا ہے جو ہو سو ہو ہم سے تو یوں نہیں رہا جاتا۔ اور جہاں میرے دوستوں نے یہ دیکھا وہ آموجود ہوئے ایک صاحب ہیں جو بقول خود اپنے سب دوستوں سے زیادہ مجھے چاہتے ہیں اور اسی نسبت سے مجھ پر اپنا سب سے زیادہ حق سمجھتے ہیں میں ان کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں جانتا مگر وہ میرے بارے میں جیسے سب کچھ جانتے ہیں۔

ایک دفعہ میں نے ان کو مشکل میں دیکھتے ہوئے اپنی عادت کے خلاف ان کے لیے اپنے دو ایک دوستوں سے کچھ کہہ سن دیا اور جب وہ شکریہ ادا کرنے لگے تو میں نے کہا اس کی کیا ضرورت ہے میں تو اسے اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ اب وہ حرب بے ضرب اپنے ہی لیے نہیں اپنے دوستوں کے دوستوں کے لیے مجھے میرا فرض یاد دلانے کے لیے آجاتے ہیں..... بات ہونے والی ہو یا نہ ہو سفارش ضرور ہونی چاہیے۔ اول تو میں سرے سے یہ بات ہی پسند نہیں کرتا دوسرے اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جن صاحب سے یا جن صاحب کے ذریعہ سفارش کرنی ہوتی ہے ان سے میری دور کی واقفیت بھی نہیں ہوتی میں ان سے ساری صورت حال تبلا کر معافی مانگ لیتا ہوں۔

مگر میری پہلی بات کا جواب تو ان کے پاس وہی ایک ہوتا ہے۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ آپ کو یہ بات پسند نہیں آپ کا دل نہیں چاہتا آپ اپنے دل کو سمجھایئے۔ صاحب ساری دنیا میں یہی ہوتا ہے، ہوتا آیا ہے اور ہمیشہ ہوتا رہے گا۔ اس میں برائی ہی کیا ہے۔ اور جب میں دوسری بات کہتا ہوں تو وہ بڑی بے تکلفی سے فرماتے ہیں۔ آپ ان کو بالکل نہیں جانتے وہ تو آپ کو جانتے ہیں۔ مگر میں ان سے کہوں کیسے، ارے صاحب کہنے میں کیا لگتا ہے جو چاہے کہہ دیجیے۔ اور جس طرح کہہ دیجیے بھلا وہ آپ کی بات ٹالیں گے۔ اچھا مان لیا آپ ان سے نہیں کہنا چاہتے تو آپ اپنے فلاں دوست سے کہہ دیجیے۔ جن کے دوست کے بھائی کی بیوی کے ماموں ایک ایسے صاحب سے واقف ہیں جن کی سسرال میں ایک صاحب کا ان کے افسر کے ساتھ کلب میں اٹھنا بیٹھنا ہے۔ چلیے سفارش کے لیے راستہ نکل آیا۔

گویا میں اپنے دوست سے یہ کہوں کہ وہ اپنے دوست سے یہ کہیں کہ وہ اپنی بیوی سے یہ کہیں کہ وہ اپنے ماموں کی معرفت ان کے دوست سے یہ درخواست کریں کہ فلاں صاحب

جب اُن کو کلب میں ملیں تو ان سے بس ذرا اتنی سی بات کہہ دیں۔ اب آپ ہی بتایئے اس کا کیا جواب ہے جب انھوں نے اتنی محنت اتنی تحقیق اتنے تجسس کے بعد اس سلسلے کی کڑیاں ملا دیں تو میں آنکھوں پر ٹھیکری رکھ کر کیسے انکار کر دوں، ان کو ٹکا سا جواب دے دوں کہ نہیں صاحب میں یہ نہیں کر سکتا۔ یہ خواہ مخواہ کا احسان لینا مجھے پسند نہیں۔

ایک صاحب اور ہیں اچھے خاصے کھاتے پیتے آدمی ہیں ان سے کچھ ایسی دوستی بھی نہیں بس یوں ہی علیک سلیک ہے اس کے باوجود ہفتہ اتوار کو ضرور تشریف لاتے ہیں اور کبھی اس تکلف میں نہیں پڑتے کہ مجھے پہلے سے اطلاع کر دیں۔ خیر سے تنہا ہی نہیں آتے ایک بیوی دو بچے ساتھ ہوتے ہیں۔ عام طور پر چائے کے وقت تشریف لاتے ہیں، ان کے مرتبہ کا خیال کرکے میں نے شروع شروع میں کئی دفعہ چائے کے ساتھ کیک پیسٹری رس گلے پیٹھا پتے کی لوز کھیر پاک سموسے دال نمکی غرض کافی چیزیں میز پر لگوائیں۔ عام طور پر اتنی چیزیں پندرہ بیس آدمیوں کے لیے کافی ہو جاتی ہیں مگر خدا بھلا کرے ان کی بیوی اور بچوں کا کہ پورا دو پونڈ کا کیک، دو درجن پیسٹری، ڈیڑھ درجن رس گلے، آدھا سیر پیٹھا، پاؤ بھر پتے کی لوز، پندرہ سموسے، پاؤ بھر دال نمکی اور گھر کے بنے ہوئے پکوڑے سب صاف تھے حیران ضرور ہوا مگر اپنی طبیعت سے مجبور جب میز کو خالی دیکھا اور ساتھ ہی یہ بھی پتہ چلا کہ ان کا ابھی جانے کا ارادہ نہیں ہے تو میز پر بادام کی گری، پستے، نمکین، کاجو، کشمش چلغوزے یہ سب رکھوا دیے۔ پیٹ بھر چکے تھے اس لیے خیریت ہوئی۔ مگر ان کی بیوی کا دیدہ دیکھیے کہ چلتے ہوئے سب کا سب میوہ اپنے شوہر اور بچوں کی جیبوں میں ٹھونس ٹھونس کر بھر دیا۔

میری طرف دیکھتی جاتی ہیں اور کہتی جاتی ہیں۔

سردی بہت ہے اتنی دور جانا ہے راستے میں ہوا لگے گی، میوہ بہت گرمی پہنچاتا ہے بیگ صاحب آپ اتنا اچھا میوہ کہاں سے لے آتے ہیں، میں نے تو ان سے کئی بار کہا کبھی ایسی چیز نہ لائے کہ دیکھ کر جی بھنا ہو جائے۔ میں خاموش یہ تماشا دیکھتا رہا اور کرتا بھی کیا کیا جیبیں خالی کروا لیتا۔ سوچا کھانے پینے کی چیز ہے میں نے کھائی انھوں نے کھائی ایک ہی بات ہے پھر یہ لوگ کھانے کے بہت شوقین معلوم ہوتے ہیں شاید اسی لیے تکلف نہیں کرتے۔ مگر ایک دن یہ بھی معلوم

ہوگیا کہ وہ کھانے پینے کے کتنے شوقین ہیں۔

خود انھوں نے تو کبھی جھوٹوں کو بھی نہیں بلایا۔ ایک دفعہ میں خود ہی ان کے یہاں چلا گیا بدقسمتی سے چائے کا وقت تھا میاں بیوی دونوں موجود مگر چائے کو کوئی نہیں پوچھتا اتفاق سے ایک بچے نے چائے مانگی تو انھیں پوچھنا ہی پڑا "کیسے چائے پیے گا جی ہاں کوئی مضائقہ نہیں مگر صرف چائے۔ سوچا جہاں ان سب کے لیے چائے بنے گی میرے لیے بھی ایک پیالی نکل آئے گی۔ بیوی نے ملازم کو آواز دی اس نے آکر میری طرف دیکھا اور پھر بیوی جی کی طرف۔ دودھ کتنا ہے۔ دودھ تو صبح ہی ختم ہوگیا تھا پاؤ بھر تو تھا ہی بیوی جی، اس نے ذرا جھجکتے ہوئے کہا۔ آپ کہیے تو میں اور لے آؤں۔ اور کہاں سے لائے گا، ابھی تو موٹے حلوائی کے یہاں دودھ بھی نہ آیا ہوگا اور پھر اتنی دیر میں دودھ لائے گا چائے بنائے گا بیگ صاحب کہاں بیٹھے رہیں گے۔ چل جلدی پاپڑ بنا کر لا تلنے کا وقت نہیں ہے کبھی تو کیمیا بنانے بیٹھ جائے۔ بس یوں ہی توے پر سینک لا اور پانی کا گلاس بھی لیتے آنا۔

جی میں تو آیا کہ میں فوراً کھڑا ہو جاؤں اور کہوں نہیں نہیں کوئی بات نہیں، میں گھر جا کر چائے پی لوں گا اور توے پر سنکا ہوا پاپڑ پھر کبھی دیکھا جائے گا۔ اب اس کی کوئی ضرورت نہیں مگر پھر وہی بات کہ خواہ مخواہ انھیں شرمندگی ہوگی ممکن ہے برا لگے اس لیے بیٹھا رہا اور سوکھے پاپڑ پانی کے گلاس کے ساتھ حلق سے اتار کر چپ چاپ چلا آیا۔ کہتا بھی کیا۔

لیکن گھر آکر مروت کے خلاف جنگ کرنے کا فیصلہ کر لیا اور ملازم سے کہہ دیا کہ آئندہ جب فلاں صاحب آئیں وہی کپتان صاحب جو اپنی بیوی اور دو بچوں کے ساتھ آتے ہیں تو چائے کا وقت ہونے کے باوجود خاموش رہنا۔ مگر ملازم کوئی ایک دن میں تھوڑا ہی سدھایا جاتا ہے۔ جب کپتان صاحب کو بیٹھے ہوئے کافی دیر ہوگئی تو آکر کہنے لگا۔ آپ ان سب کے جانے کے بعد چائے پییں گے نا؟ یقین جانیے پاؤں کے تلے سے زمین نکل گئی۔ پسینے آنے لگے۔ ایک رنگ آئے تو ایک جائے۔ اب کیا کروں فوراً کہا ارے کم بخت تو نے ابھی تک چائے بھی تیار نہیں کی۔ میں تو سمجھ رہا تھا۔ بازار سے کچھ لینے گیا ہے اور اتنی شرمندگی مٹانے کو پہلے سے زیادہ چیزیں ان کے لیے چائے کے ساتھ منگوائیں۔

ایک اور واقعہ یاد آگیا۔ ایک دفعہ کسی دکان پر دو نہایت خوب صورت گلدان دکھائی دیے۔ طبیعت جیسے مچل ہی تو گئی۔ قیمت پوچھی بہت تھی۔ پھر بھی لے ہی لیے ایسی چیزیں روز روز تھوڑا ہی ملتی ہیں جو یوں پسند آجائیں۔ چھوڑنے کو جی نہ چاہے۔ جیب خالی کی اور گلدانوں سے ہاتھ بھر لیے۔ گھر آنے سے پہلے ایک صاحب کے یہاں ملنے جاتا تھا۔ سوچا ان کو بھی دکھلا دوں اپنی خرید اور پسند کی داد تو ملے گی۔ خوش خوش ان کے سامنے رکھے۔ انھوں نے دونوں ہاتھوں میں اٹھائے ہوئے کہا بھئی بیگ صاحب "واہ واہ داد نہیں دی جا سکتی" اجی دیکھتی ہو ذرا ادھر دیکھو: اپنی بیوی کو آواز دیتے ہوئے بولے۔

"یہاں آؤ" بیگ صاحب کتنے عمدہ گلدان لائے ہیں بیوی دوڑی ہوئی آئیں اور دیکھ کر پھڑک ہی تو گئیں، میں خوش کہ آج پسند کی داد ملی ہے۔ اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ بیوی نے دونوں گلدان مینٹل پیس پر سجا دیے دور سے گردن موڑ موڑ کر دیکھ رہی ہیں اور کہہ رہی ہیں کیسے سج کر رہے ہیں۔ شوہر صاحب فرما رہے ہیں بیگ صاحب گلدان تو اچھے ہیں قیمت بھی زیادہ ہوگی مگر آپ نے یہ تکلیف کیوں کی۔ مگر یہ تو میں کیا عرض کر سکتا ہوں . . .

چلیے قصہ ختم ہوا، میں یہ کہہ سکتا تھا کہ صاحب میں تو یہ اپنے گھر کے لیے لایا ہوں۔ آپ کو تو میں نے صرف دکھلانے کے لیے ان کو دیا تھا۔ اس کا یہ مقصد ہرگز نہ تھا کہ آپ انھیں اٹھا کر رکھ لیں۔ مگر بھلا ہو اس آنکھ کی شرم کا کہ ہونٹ بند رہے۔ آنکھوں نے کچھ کہا ہو تو کہا ہو مگر ان کی بات سمجھتا کون۔ اور کیوں سمجھتا۔

میں نے ڈوری اور کاغذ سمیٹتے ہوئے کہا جی نہیں اس میں تکلیف کی کیا بات ہے۔ وہ کہتے رہے کہ چائے پی کر جائیے آپ بھلا کب آتے ہیں۔

سفر کے لطائف

مرزا محمود بیگ

سفر کے معاملہ میں ہر شخص کی طبیعت الگ۔ پسند الگ۔ کچھ تو ایسے ہیں جو سفر کے نام سے گھبراتے ہیں۔ ان کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو بغیر سفر کیے ہی زندگی بسر ہو جائے اور اگر ان کو مجبوراً سفر کرنا پڑے تو اسے موت کے ملاپ سے کم نہیں سمجھتے ایک ہفتے پہلے سے تیاری ہے، ہر چھوٹے بڑے سے خاص طور پر ذکر ہے کہ سفر کرنا ہے۔ دل ہی دل میں سوچ رہے ہیں کہ دیکھیے سفر کیسے کٹتا ہے۔

ایک وہ ہیں جو سفر سے گھبراتے تو نہیں مگر سفر کو اہمیت بہت دیتے ہیں۔ یہ لوگ بڑے ساز و سامان سے چلتے ہیں۔ بڑی سے بڑی اور چھوٹی سے چھوٹی چیز ساتھ لے جانے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ ایسا نہ ہو کہ سفر میں کسی چیز کی ضرورت پڑے اور ان کے پاس نہ نکلے۔ گویا سفر میں بھی وہی آرام چاہتے ہیں جو ان کو گھر میں ملتا ہے۔

ایک وہ ہیں جن کی زندگی ہی سفر ہے۔ دن ہو یا رات، مینھ ہو یا آندھی، گرمی ہو یا برسات یہ آج یہاں تو کل وہاں مہینے کے ۲۹ دن یا ریل میں ہیں یا موٹر میں ہیں یا گاڑی میں ہیں۔ ان کے

یہ سفر بالکل اہم نہیں ہے اس حد تک کہ ان کو معلوم بھی نہیں ہوتا کہ یہ سفر کر رہے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ نہ ان کو سفر کی وجہ سے کوئی تکلیف نہیں ہوتی ہے نہ لطف آتا ہے اگر ریل میں ہیں تو سوتے جائیں گے۔ تاکہ اپنی منزل پر پہنچ کر اچھی طرح کام کر سکیں۔ اگر موٹر میں ہیں تو کاغذات دیکھتے جائیں گے تاکہ وقت بے کار نہ جائے۔

ان سب قسموں کے علاوہ ایک قسم ان لوگوں کی ہے جو نہ سفر سے گھبراتے ہیں نہ سفر کو اہمیت دیتے ہیں۔ نہ ہر وقت سفر میں رہتے ہیں بلکہ سفر صرف اس واسطے کرتے ہیں کہ ان کو سفر میں وہ لطف آتا ہے جو اپنے گھر رہنے کے کام میں نہیں آتا۔ ان کو دلّی کی زبان میں سیلانی لوگ کہتے ہیں یعنی وہ لوگ جو سفر کے ذریعہ زندگی کا لطف اٹھاتے ہیں۔

مگر ان سیلانی لوگوں کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو وہ جو ریل سے سفر کرتے ہیں اور دوسرے وہ جو موٹر سے سفر کرتے ہیں ان دونوں میں اتنا ہی فرق ہے جتنا کالے گورے میں۔

جو لوگ تفریحاً ریل سے سفر کرتے ہیں وہ عام طور پر معمولی سامان لے کر چلتے ہیں جہاں جاتے ہیں سیر کی غرض سے کام کی غرض سے نہیں۔ اور جتنی دیر ریل میں رہتے ہیں، خوش رہتے ہیں۔ ہر اسٹیشن پر اترتے ہیں ایک چکر تمام پلیٹ فارم کا ضرور لگاتے ہیں۔ ایک آدھ چائے کی پیالی یا سوڈا لیمن تقریباً ہر دوسرے اسٹیشن پر ضروری ہے اس کے علاوہ ہر جگہ کی مشہور چیز کا خیال رکھتے ہیں۔ ریواڑی کی ریوڑی اور برفی متھرا کے پیڑے باپوڑ کے پاپڑ۔ الٰہ آباد کے امرود، ناگپور کے سنترے، بمبئی کے کیلے۔ لکھنؤ کا سفیدہ۔ بنارس کا لنگڑا، ان کے ذہن پر سوار رہتا ہے۔ ان کا سفر بے معنی ہے اگر انھیں یہ چیزیں نہ مل سکیں۔ ان کو شاید یہ معلوم نہیں کہ جس شہر جس جگہ کی جو خصوصیت ہوتی ہے وہ اسٹیشن پر نہیں بلکہ شہر کے خاص بازار اور خاص دوکان پر ملا کرتی ہے اس کے لیے تلاش اور ذوق سلیم کی ضرورت ہے اسٹیشن پر نقل ضرور ملتی ہے اور اصل کے داموں سے دوگنی مگر ریل کے سیلانی اس تفتیش میں نہیں پڑتے۔ ان کے لیے تو یہ کافی ہے کہ جہاں ریل ٹھہری اور کھڑکی کے پاس کسی نے آواز دی باپوڑ کے پاپڑ اور انھوں نے کھانا کھاتے دو پاپڑ لے ہی لیے کہ کہیں گاڑی چل پڑے اور یہ واپس آن کر اپنے دوستوں سے یہ نہ کہہ سکیں کہ انھوں نے پاپڑ کیا پاپڑ نہیں کھائے۔

ایک قسم تفریحاً سفر کرنے والے لوگوں کی وہ ہے جنہیں ریل کا سفر پسند نہیں ہے بلکہ موٹر کے سفر کو پسند کرتے ہیں اور آپ خود ہی دیکھیے کہ ریل کا سفر کیوں کر تفریح کا ذریعہ بن سکتا ہے، آپ جانتے ہیں کہ تفریح اور پابندی کا بیر ہے تفریح کا تو مطلب یہ ہے کہ جب جی چاہا ٹھہر گئے جب جی چاہا کھانے بیٹھ گئے۔ جب جی چاہا سو گئے۔ مگر ریل کے سفر میں پابندی ہی پابندی ہے۔ سب سے پہلے تو وقت کی پابندی ہے جو ریل کا وقت ہو اس وقت ہی آپ سوار ہو سکتے ہیں۔ اگر ریل آپ کے شہر سے صبح چھ بجے چلتی ہے تو آدھی رات گئے سے اُٹھیے، تیار ہوئیے اور گھبرائے ہوئے اسٹیشن پہنچیے، ٹکٹ لیجیے، ریزگاری گنیے۔ قلی کا نمبر لیجیے۔ اس کے پیچھے چلیے تب کہیں جا کر گاڑی میں بیٹھیے اور پھر گاڑی آپ کے بس کی نہیں بلکہ انجن کے ڈرائیور اور گارڈ کے بس میں ہے۔ اگر ریل چل رہی ہو آپ کو کسی کھیت کی سرسوں یا کسی پیڑ کے پھل یا پھول یا کسی جھیل پر منڈلاتے ہوئے پرندے یا کسی پنگھٹ کا سین اچھا لگے تو آپ نہ ریل کو روک سکتے ہیں نہ رکوا سکے ہیں ریل نکلتی چلی جاتی ہے اور آپ زیادہ سے زیادہ گردن نکال کر اپنی پسند کے منظر کو دور اور بہت دور سے دیکھ سکتے ہیں۔ بتائیے یہ کوئی سیر ہے؟ تفریح ہے؟

یہی وجہ ہے کہ جب کسی کام سے سفر کرنا ہوتا ہے۔ میں ریل سے سفر کرتا ہوں۔ مگر جب محض تفریح کی خاطر سفر کرتا ہوں تو موٹر سے سفر کرتا ہوں اور اس سفر میں جو لطف آتا ہے اس کی کیفیت الفاظ میں بیان نہیں ہو سکتی۔

اوّل تو موٹر کے سفر میں سڑک پر ایسے ساتھیوں سے ملاقات ہوتی ہے جو ریل کے سفر میں ممکن نہیں ریل کی پٹری صرف ریل کے لیے بنی ہے اس پر نہ چھکڑا چل سکتا ہے نہ اونٹ گاڑی نہ یکہ نہ تانگہ نہ ٹرک نہ لاری۔ مگر سڑک تو سب کی ہے۔ موٹر والے کی بھی ہے اور یکہ والے کی بھی ہے اور بہلی والے کی بھی۔ گائے بیل کی بھی اور بھیڑ بکری کی بھی۔ اس لیے سڑک پر سفر کرنے سے ان سب سے ملاقات لازمی ہے اور اس ملاقات میں بڑا لطف آتا ہے اگر آپ ان کی عادتوں سے واقف ہوں۔ مثلاً آپ کبھی کوشش نہ کیجیے کہ بھینس کو ہارن دے کر راستے سے ہٹائیں۔ اگر آپ زیادہ ہارن دیں گے تو وہ اپنے سینگوں سمیت آپ کی طرف متوجہ ہوگی۔ یہی حال اونٹ گاڑی کا ہے۔ اس کا کوچبان ہمیشہ سوتا رہتا ہے۔ اونٹ اپنی مرضی سے چلتا ہے۔ اگر اس کا پیٹ بھرا ہوا

ہو تو سڑک کے بیچ میں چلتا ہے اور بھوک کی حالت میں جس طرف بھی ہرے بھرے پتے نظر آئیں گے ادھر ہی مڑ جائے گا اس لیے اونٹ گاڑی کا احترام کیجیے اور اگر محض اونٹ ہو تو پھر تو اور بھی زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے کیوں کہ اتفاق سے اونٹ کی ٹانگیں گھبراہٹ میں بے جگہ پڑتی ہیں اور ان سے دور رہنا بہتر ہے۔ گائے بیل بھیڑ بکری شریف جانور ہیں۔ ان کو اطلاع کر دینا کافی ہے۔ پھر یہ جگہ دے دیتے ہیں۔ مگر گائے کے بچھڑے اور اکیلی بھیڑ کا اعتبار نہیں۔ لاری اور ٹرک بھی آپ کے لیے راستہ نہیں چھوڑیں گے اس لیے کوشش نہ کیجیے۔ اگر سامنے سے آتی دیکھیں تو شرافت اور جان کی امان کا تقاضا ہے کہ آپ چپکے سے ایک طرف ہو جائیں اور ان کو شن سے کان کے پاس سے گزر جانے دیں۔ اگر پیچھے سے آ رہے ہوں تب بھی راستے دے دیجیے۔ اور اگر آپ ان میں سے کسی کے پیچھے ہوں تو آگے نکلنے کی کوشش نہ کیجیے۔ خصوصاً رات کے وقت کیوں کہ سڑک کے اردگرد ایسی اونچ نیچ ہوتی ہے۔ جو زمانے کی اونچ نیچ سے کہیں زیادہ ہے اس لیے احتیاط برتیے۔

اب رہ گیا یکہ۔ سو ہارن دینے سے یہ ضرور ایک طرف ہو جائے گا اور آپ گاڑی کی رفتار کم کیے بغیر اس کے پاس سے زن سے نکل کر جا سکتے ہیں۔ مگر ایسا کرنا ظلم ہے۔ اوّل تو ہارن دینے سے یکہ سڑک سے زیادہ دور چلا جاتا ہے اور وہاں اس کے لڑھکنے کا خطرہ ہے۔ دوسرے یکہ دنیا کے ان عجائبات میں سے ہے جن کو قریب سے دیکھنا ضروری ہے۔ اس لیے آپ گاڑی کھڑی کر لیجیے۔ اور پھر خدا کی قدرت کا مشاہدہ کیجیے۔ کہ کس طرح گھوڑے کا ایک پاکٹ ایڈیشن پوری نو سواریوں کو لڑکھاتے لیے چلا جاتا ہے۔ ان نو سواریوں میں دبلے بھی ہوتے ہیں اور موٹے بھی۔ ہلکے بھی ہوتے ہیں اور بھاری بھی۔ بچے بھی ہوتے ہیں اور بوڑھے بھی۔ مگر یہ سب سرکس میں کام کرنے کے قابل ہوتے ہیں کیوں کہ جس جگہ ایک انگلی مشکل سے ٹک سکتی ہے وہاں یہ پورے کے پورے ٹکے ہوتے ہیں۔ کسی کے پاؤں باہر ہیں تو سر اندر ہے۔ کسی کا سر اندر ہے تو پاؤں باہر۔ غرضکہ یکہ نہ دیکھا ایک پورا سرکس دیکھ لیا۔ یہی وجہ ہے کہ میں چاہتا ہوں کہ آپ یکہ کے پاس سے آہستہ نہ نکلیں۔ رہ گئی رتھ اور بہلی تو اس کے پاس سے نہ نکلیں بلکہ کافی فاصلہ چھوڑ کر دور سے نکلیے اور وہ بھی بغیر ہارن دیے۔ کیوں کہ جو بیل اکثر ہل میں جوتے جاتے ہیں صرف بیاہ یا شادی کے وقت رتھ بہلی میں جوڑ دیے جاتے ہیں۔

وہ آپ کے ٹرک، موٹر یا ہارن سے واقف نہیں ہوتے۔ اس لیے آپ کے ہارن دینے سے وہ یا تو آپ کی موٹر سے ٹکرا جائیں گے یا ٹرک کے دوسری طرف کھائی میں جا گریں گے۔ یہی حال چھکڑوں کا ہے ان سے بھی قریب کی دوستی اچھی نہیں۔

ٹرک کے ساتھیوں کے علاوہ موٹر کے سفر میں جو لطف آتا ہے وہ یہ کہ آپ جب اور جہاں چاہیں ٹھہر سکتے ہیں، نہر کا پل ہو۔ گنے کے رس کا کولھو ہو، پنگھٹ ہو۔ دھان کوٹے جا رہے ہوں۔ ماسٹر جی بچوں کو پڑھا رہے ہوں۔ چودھری صاحب چوپال میں حقہ پی رہے ہوں، حلوائی تازہ جلیبیاں اتار رہا ہو، یا بندر آپس میں کھیل رہے ہوں کوئی جگہ ہو کوئی موقع ہو آپ گاڑی روک لیجیے اور لطف اٹھائیے۔ نہ ڈرائیور ہے کہ شور مچائے گا۔ نہ گارڈ ہے کہ جھنڈی ہلائے گا، نہ سگنل ہے کہ لال ہری روشنی دے گا آپ ہیں آپ کی موٹر اور آپ کے من کی موج۔

ساون، بھادوں

مہیشور دیال

اس خوشگوار موسم پر بھاؤ بھوتی کی ایک سنسکرت نظم میں منظر کشی اور جذبات نگاری ملاحظہ ہو۔

اودے اودے بادل آسمان پر گھر آئے ہیں
بجلی کبھی کبھی بڑی گرج کے ساتھ چمک رہی ہے
بادلوں کے جھاج میں سے بوندیں ٹپ ٹپ گرنے لگیں
دیکھتے ہی دیکھتے بارش اتنی تیز ہو گئی کہ ندی نالے بہنے لگے
ہوا چیخیں مار کر چلنے لگی
دن رات کی طرح تاریک ہو گیا ہے
برکھا اور ہوا کھڑکیوں میں سے گھر کے اندر بھی آرہی ہے
میرے پریتم بھادوں کے مہینے میں مجھے چھوڑ کر نہ جانا
کیوں کہ برہا وش کی طرح تڑپا دیتی ہے!

یہ موسم برسات کا ایک روپ ہے جہاں ساون بھادوں کی جھڑی اور پھوئیاں پھوئیاں بارش

مشہور ہے وہاں اس موسم کی دھوپ اور اُمس بڑی جان لیوا ہے۔ جب بارش کا چھینٹا بھی نہیں پڑتا اور ہوا بند ہوتی ہے اور سورج اپنی پوری آب و تاب سے چمکتا ہے تو دم گھٹا جاتا ہے پرانے وقت میں جب بجلی بھی نہیں تھی تو دلّی کے لوگ پنکھوں کو پانی سے تر کر کے جھلتے رہتے۔ لُو سے بچنے کے لیے موٹے موٹے پردے ڈالتے یا اگر تہ خانے ہیں تو دن میں ان کی ٹھنڈ میں پڑے رہتے ساون بھادوں سے پہلے مئی اور جون کی گرمی تو تڑپا دیتی۔ نہ کھانے پینے کا سواد اور نہ باسی پانی ٹھنڈا ہو نہ تازہ۔ ہر وقت پسینہ جاری۔ اِدھر کپڑا پہنا، اُدھر تر ہوا۔ چٹائی کا پنکھا لیے پڑے ہانپ رہے ہیں۔ ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ جاتے ہیں اور دل میں کسی قسم کا جوش نہیں رہتا۔ ساون کے آتے ہی سب کی آنکھیں آسمان پر لگ جاتیں۔ کبھی گھروں میں سات لڑا کو عورتوں کے نام لیے جاتے تاکہ آندھی یا جھکڑ ہی آجائے جس سے پانی برس جائے۔ قلعے کی بیگمیں اور شہزادیاں بارہ پرندوں کے نام جو "ب" سے شروع ہوتے ہیں، ایک سانس میں لیتی تھیں جیسے بگلا، بلبل، باز، بیا، بٹیر، بحری، باشہ، بھٹ، بھینیرا، بھجنکا، بط، اور بزہ۔ اس زمانے میں یہ عقیدہ تھا کہ اگر بغیر سانس ٹوٹے ایسے بارہ پرندوں کے نام لو تو ہوا چلے گی اور بادل آئیں گے لیکن ایک سانس میں عورتوں کے لیے جنھیں یہ سارے نام یاد بھی نہ رہتے مشکل ہو جاتا اور سانس ٹوٹ جاتا۔ مگر اس طرح بیگموں اور شہزادیوں کا جی لگ جاتا۔ اگر کوئی ان بارہ ناموں کو بغیر سانس ٹوٹے لینے میں کامیاب ہو جاتی تو سب تالیاں بجاتیں اور یقین کر لیتیں کہ اب کسی بھی وقت ٹھنڈی ہوا چلنے والی ہے اور پیڑ کی ڈالی کی طرف دیکھتی رہتیں کہ کب ہوا سے ہلتی ہے۔

مگر ساون بھادوں کا موسم ہے، تان ٹوٹے گی ہی۔ یہ لیجیے پیڑوں کی ڈالیاں ہلنے لگیں، پہلے آہستہ آہستہ، پھر زور سے، بڑی ٹھنڈی ہوا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے آسمان پر اودے اودے مٹیالے بادل گھر آئے ہیں۔ ایک موٹی سی بوند پڑی، پھر بہت سی موٹی بوندیں، چاروں طرف لڑکوں بالوں کا شور مچ گیا۔ بہت ذرا سے بچے بالکل ننگے اور بڑے بچے صرف جانگھیا پہن کر گلیوں اور سڑکوں پر نکل آئے ہیں۔ بارش دم بدم تیز ہو رہی ہے۔ لے لو یہ تو پرنالے دھائیں دھائیں کر کے گر رہے ہیں۔ کیسا خوب صورت اندھیرا چھا گیا ہے۔ بجلی بھی کڑک رہی ہے اور بعض دفعہ تو دل دہلا دیتی ہے

ذرا بارش رکی تو آنکھوں میں تراوٹ آگئی۔ واہ کیا موسم ہے۔ انسانوں پر، جانوروں پر، پرندوں پر، پودوں اور درختوں پر، تمام کائنات پر ہی ایک عجیب نکھار آگیا ہے، جیسے سب کے قدرت نے منھ دھو دیے ہوں۔ دلّی باغوں کا شہر تھا اور چپے چپے پر باغ بغیچے تھے۔ مور جھنکار رہے ہیں، کوئلیں کوک رہی ہیں اور پپیہا پی پی کی رٹ لگا رہا ہے، ٹیری الاپ رہی ہے۔ جانداروں کا تو کہنا ہی کیا، نباتات پر بھی ایک نئی بہار آجاتی ہے۔ جن پیڑوں کو پت جھڑ نے ٹنڈ منڈ بنا دیا تھا، ہری ہری کونپلوں اور پتیوں سے مالا مال ہو رہے ہیں۔ باغوں میں چاروں طرف ہریالی چھا گئی ہے اور کھیت لہلہانے لگے ہیں۔ جن باغوں میں خاص بہار ہوتی تھی اور لوگ سیر و تفریح کو جاتے تھے ان میں مبارک باغ، باغ محل دار خاں، باغ کڑے خاں اور شالیمار باغ خاص طور پر مشہور تھے روشن آرا باغ میں بھی بڑی رونق ہوتی تھی۔ ساون میں جھولے گھروں میں پڑتے تھے اور باغوں میں بھی۔ ساون کے مہینے میں جب باغوں کے پیڑ لدے پھندے ہو جاتے تو طرح طرح کی بے شمار چڑیاں اپنا پیٹ بھرنے آجاتیں۔ ساون ختم ہوتے ہی جب اناج کٹنا شروع ہو جاتا تو یہ چڑیاں بھی پھر پھر کر کے کہیں اور چلی جاتیں۔

برسات کے موسم میں جب بیر بہوٹیاں نکل پڑتیں تو قلعے کی شہزادیوں کو ان کا لال مخملی پن بہت پسند آتا۔ ایک ایک بیر بہوٹی ایک ایک اشرفی کو مول لے جاتی اور پھر انھیں بچوں کو بانٹا جاتا۔ ایک بار ایک پانچ برس کی بھولی شہزادی نے بیر بہوٹی کو اپنی ہتھیلی پر رکھا تو اس نے ہاتھ کے ہلنے جلنے سے اپنے پنجے سمیٹ لیے اور گول مٹول ہو کر ایسے لگنے لگی جیسے مر گئی ہو۔ شہزادی روتی روتی اپنی ماں کے پاس گئی اور بولی: "امی جان بیر بہوٹی مر گئی"۔

برسات میں دلّی کے سیلانیوں کی ٹولیوں کی ٹولیاں باہر نکل پڑتیں۔ کوئی ٹولی محل دار خاں جا رہی ہے تو کوئی جمنا کے کنارے فالیز پر۔ کسی نے فیروز شاہ کوٹلے کی راہ لی تو کسی نے دھوبے کنویں کی۔ چند ٹولیاں مدرسے جا پہنچیں تو چند ہمایوں کے مقبرے میں جا دھمکیں۔ جو ٹولیاں ذرا سکون کی جگہ پسند کرتیں وہ حوض خاص کا رخ کرتیں جنھیں مچھلی کے شکار کا شوق ہوتا یا پانی کا کنارا پسند کرتیں وہ اوکھلے میں دن گزارتیں۔ فالیز کی سیر مردوں کی ہوتی تھی۔ اس میں گھر کی عورتوں کو شریک نہیں کیا جاتا تھا۔ یہ سیر عمارات کو ہوتی تھی۔ جمنا کی ٹھنڈی

ریت پر دری چاندنی کا فرش ہو جاتا تھا۔ روشنی کے ہنڈے ساتھ ہوتے تھے جنھیں گیس کے ہنڈے کہا جاتا تھا۔ ہر ہنڈے کے ساتھ ایک پیپا مٹی کے تیل کا ہوتا تھا جس میں پمپ سے ہوا بھری جاتی تھی۔ کئی لوگ گیس کی لالٹین بھی لے آتے تھے۔ رات کو بہت دیر تک لوگ ٹھہرتے، کھاتے پیتے، موج مناتے اور موسم کا لطف لیتے۔ اچانک بارش ہو جانے کی صورت میں، کہاں پناہ لینی ہے اور کیا کرنا ہے، اس کے بارے میں سوچ کر رکھتے۔ دلّی والے ساون کے موسم میں، اگر کھلا ہو، تو گھر نہ ٹکتے۔ یہ اکثر سننے میں آتا۔
"بھلا اس چار دیواری میں کیا مزہ، سیر ہونی چاہیے۔"

مہرولی کے اردگرد امریاں بھی اس موسم میں جھولا جھولنے اور سیر تفریح کے لیے بڑی مقبول تھیں۔ کنبے کے کنبے کھانے پینے کا سامان لے کر وہاں پہنچ جاتے۔ جھولے پڑ جاتے، پینگیں بڑھائی جاتیں اور کڑاہیاں چڑھ جاتیں۔ دوسرے باغوں میں بھی یہی میلہ نظر آتا۔ لوگ آموں اور جامنوں کے درختوں پر ٹوٹ پڑتے۔ دونوں برسات کے میوے ہیں۔ ذرا پیڑ کو ہلایا اور جامنوں کا مینہہ برس گیا۔ کھا بھی رہے ہیں اور جھولی میں بھی بھر رہے ہیں۔ آموں کے درخت بھی دیکھتے ہی دیکھتے صاف ہو جاتے۔ چاروں طرف گٹھلیاں ہی گٹھلیاں پڑی نظر آتیں۔ تکّی باغ اپنے آموں کے جھنڈ کے لیے مشہور تھا۔ اس میں جامنوں کے بھی بہت پیڑ تھے اور جامنوں کے گچھے ہر وقت ہوا میں جھولتے رہتے۔ امریوں میں جھولے پڑے ہیں اور گیت گائے جا رہے ہیں۔

جھولا کن ڈارو رے امریاں　　جھولا کن ڈارو رے امریاں
رین اندھیری، تال کنارے، مُرلا جھنگارے، بادل کارے
بوندیاں پڑیں پُھیاں پھَیاں
جھولا کن ڈارو رے امریاں
چار مِل گیّاں بھول بھلیّاں
دو سکھی جھولیں، دو ہی جھلائیں، جھولا کن ڈارو رے امریاں

سنو سکھی سیاں جوگیا ہو گئے　　سُنو سکھی سیاں جوگیا ہو گئے
میں جوگن تیرے ساتھ
سنو سکھیا سیاں جوگیا ہو گئے

جوگیا بجائے بین بانسری　　جوگیا بجائے بین بانسری
جوگن گائے ہے ملہار
سُنو سکھی سیاں جوگیا ہو گئے

جوگیا نے چھائی جنگل جھونپڑی　　جوگیا نے چھائی جنگل جھونپڑی
جوگن نے چھایا ہے بدیس

جوگیا نے پہنے لال لال کپڑے　　جوگیا نے پہنے لال لال کپڑے
جوگیا کے لمبے لمبے کیس
سنو سکھی سیاں جوگیا ہو گئے

میرے دل کی کُنجی میری جان جھولا　　میری آرزو، میرے ارمان جھولا
کروں کیوں نہ آؤ بھگت اس کی دل سے　　برس دن میں آیا ہے مہمان جھولا
یہ پینگوں سے مری بہلاتا ہے مجھ کو　　بڑا مجھ پر کرتا ہے احسان جھولا
جو دیتی ہے جھونٹے کوئی لمبے لمبے　　اڑا تا ہے کیا میرے اوسان جھولا
بلایا ہے سمدھن کو جھولا جھلانے　　بنے گا نہ کیوں کر پرستان جھولا
ہوا ختم ساون لگا آج بھادوں　　جھلاؤ گی کب تک سکھی جان جھولا
ایک یہ ادا ہے ہندوستان کی　　نہ کیوں جھولیں ہندو مسلمان جھولا

ساون بھادوں کے موسم میں قلعے میں اور شہر میں خوب رنگ رلیاں منائی جاتیں۔ ریشمی رسیوں کے جھولے ڈلتے تھے اور ان میں گنگا جمنی پٹریاں پڑی ہوتی تھیں۔ گھٹائیں ابھر کر آتیں اور لوگوں کے دلوں میں نئی نئی امنگیں پیدا ہو جاتیں۔ ساون میں نئی بیاہی دلہن اپنے

میکے جاتی ہے۔ یہ رسم دلی کے مسلمانوں اور ہندوؤں میں مشترک تھی۔ امیر خسرو کا یہ گیت صدیوں سے گایا جا رہا ہے۔

اماں میرو بابا کو بھیجو ری کہ ساون آیا
بیٹی تیرا بابا تو بڈھا ری کہ ساون آیا
اماں میرے بھیا کو بھیجو ری۔ کہ ساون آیا
بیٹی تیرا بھیا تو بالا ری۔ کہ ساون آیا
اماں میرے ماموں کو بھیجو ری۔ کہ ساون آیا
بیٹی تیرا ماموں تو بانکا ری۔ کہ ساون آیا

ساون میں بہو کا سندھارا بھیجا جاتا ہے۔ اس میں ایک ریشم کا رسّہ اور دو چاند کی پٹڑیاں بہو کے جھولنے کے واسطے اور ایک پتلی رسی اور دو پٹڑیاں اس کی گڑیا کے لیے بھیجی جاتی تھیں۔

ساون بھادوں کے مہینے پکوانوں کے مہینے ہوتے تھے۔ گھر گھر پکوڑے، مال پوڑے اور دوسرا پکوان بنتا رہتا تھا۔ برسات میں ان چیزوں کے کھانے کا مزہ ہی کچھ اور ہوتا۔ بارش میں بھوک بھی اچھی لگتی اور کھانے کا بھی مزہ آتا۔ کھانے کی فرمائشیں عموماً گھر کے مرد اور بڑے بوڑھے کرتے۔ جہاں بارش کی بوندوں سے موسم ٹھنڈا ہوا تو صلاحیں دی جانے لگتیں "دیکھو جی پالک اور ہری مرچوں کے پکوڑے اور دھنیے کی چٹنی بنالو، مزا آجائے گا" "بہو آج تو مال پوڑے کا دن ہے وہ جو میرٹھ سے گھی آیا ہے، اسے استعمال کرونا؟ اور ہاں ذرا سی اجوائن بھی ڈال دینا۔"

تیج ہندو لڑکیوں کی اور سندھارے بہوؤں کے ہوتے ہیں۔ لڑکیوں اور بہوؤں کو اس موقعے پر تحفے تحائف اور ڈھیر سارے کپڑے زیور وغیرہ دئے جاتے ہیں۔ یہ بڑا مسرت بھرا تہوار ہے اور کنبے کی عورتوں کی فراخ دلی، وضعداری اور انصاف کی نشاندہی کرتا ہے۔

موسم برسات کے دو اور مشہور تہوار ہیں، سلونو یعنی رکشا بندھن اور جنم اشٹمی۔ سلونو کا تہوار دلی میں بڑی ہنسی خوشی سے منایا جاتا رہا ہے۔ قدیم دلی میں تو اس کی بہار ہی کچھ اور تھی اور عورتیں بڑے جوش و خروش سے اس کا انتظار کرتی تھیں۔ بہنوں کی اپنے بھائیوں کے لیے محبت مثالی ہے اور اس کا معصوم اور پر مسرت اظہار وہ سلونو کے دن اپنے بھائیوں کی

کلائی پر راکھی باندھ کر کرتی ہیں۔ بھائی اپنی بہنوں کو روپے اور تحفے دیتے ہیں اور بہنوں کی ہر طرح سے رکشا کرنے کا عہد اپنے دل میں کرتے ہیں۔ پرانے وقت میں تو عورتیں اور لڑکیاں گھروں کی زینت تھیں اور ان کی روزمرہ کی زندگی اپنے ماں باپ اور بھائی بہنوں اور رشتے داروں کے اٹوٹ پیار کے گرد گھومتی تھی۔ سلونو والے دن دلی کی گلیوں اور بازاروں میں ایک نئی رونق آجاتی تھی۔ ان دنوں جو راکھیاں ملتی تھیں وہ سفید اور سنہری نپی، سلمے، ستارے، ریشم، ابرق اور موتیوں سے بنتی تھیں۔ بہت امیر گھروں میں عورتیں سچے موتیوں کی راکھیاں بھی بنواتی تھیں مگر راکھی کا سستی یا قیمتی ہونا بے معنی تھا کیوں کہ بہنوں کا پیار تو پیسے دو پیسے کی راکھی میں بھی اتنا ہی گندھا ہوتا تھا۔ وہ دور مشترکہ کنبوں کا تھا اور عموماً چھوٹے بڑے بھائی ایک ہی گھر میں ہوتے تھے۔ بہنیں صبح سویرے ہی سج دھج کر بھائیوں کے راکھی باندھتیں۔ بھائی بہنوں کو نقدی اور تحفے دیتے اور دوپہر کا کھانا جس میں خاص چیزیں یعنی پوری کچوری، رائتہ اور کھیر وغیرہ ہوتی سب مل کر کھاتے۔ شادی شدہ بہنیں جو شہر کے ہی دوسرے حصوں میں ہوتیں بھائیوں کے یعنی اپنے مائکے جاتیں اور ان کے راکھی باندھتیں۔ دلی کے بازاروں اور سڑکوں پر ایسی سجی سجائی بہنیں مٹھائی کی تھالی یا ٹوکری ہاتھ میں لیے پیدل یا ڈولی یا تانگے میں بھائیوں کے گھر کی طرف جاتی نظر آتیں۔ اس روز بھی اور کئی دن پہلے سے راکھی بیچنے والوں کی دکانیں جگہ جگہ لگ جاتیں۔ ان دنوں پنڈت بھی رنگین دھاگوں (کلاوے) کی نئی راکھی لوگوں کے باندھتے اور لوگ انہیں پیسے دیتے تھے۔

ہندوؤں اور مسلمانوں میں اتنا میل جول تھا کہ بہت سی ہندو عورتیں اپنے مسلمان بھائیوں کے جن کا گھروں میں آنا جانا تھا راکھی باندھتیں اور ان کے مسلمان بھائی انھیں اسی طرح روپے دیتے۔ راکھی بندھے اور تِلک لگوائے یہ مسلمان بھائی اسی طرح بازار میں گھومتے اور اپنے گھر لوٹتے اور کسی کو خیال بھی نہ ہوتا بلکہ خوشی محسوس کرتے۔ راکھی ان کے ہاتھ پر بھی کئی کئی دن بندھی رہتی۔

ہفت تماشہ کے مصنف مرزا محمد حسن قتیل سلونو کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اس دن صاحب ثروت ہندو رقص و سرود سے لطف اندوز ہوتے ہیں

اور شام کے وقت شہر سے باہر جاکر میدان میں جمع ہوتے ہیں۔ بعض لوگ
کسی درخت کے سایے میں اور کچھ لوگ دریا کے کنارے فرش فروش بچھاکر
بیٹھتے ہیں اور خوب صورت لڑکوں کو نچاتے ہیں"۔

قلعے میں بھی یہ تہوار منایا جاتا تھا۔ اس کے آغاز کے لیے ایک واقعے کا ذکر کیا جاتا ہے جو تاریخی حقیقت ہے۔ جب عالم گیر ثانی کو ان کے وزیر نے قتل کرا کے ان کی لاش کو فیروز شاہ کوٹلے کے پیچھے پھنکوا دیا تھا تو ایک برہمن عورت رام جنی گوڑ جمنا کے اشنان سے واپس آرہی تھی۔ اس نے بادشاہ کی لاش کو پہچان کر ساری رات اس کی حفاظت کی تھی۔ بادشاہ شاہ عالم نے رام جنی گوڑ کو اس کی خیر خواہی کی بنا پر اپنی بہن بنالیا اور اسے بہت کچھ دیا۔ اس کے ساتھ بھی بہنوں والی ساری رسمیں برتتے رہے۔ وہ بھی سلونو کے دن بہت سی مٹھائی تھالوں میں لے کر قلعے میں آتی تھی اور بادشاہ کے ہاتھ میں سچے موتیوں کی راکھی باندھتی تھی۔ بادشاہ اس کو روپے اور اشرفیاں دیتے تھے۔

جنم اشٹمی کرشن کنہیا کے جنم دن کا تہوار ہے اور اس وقت بھی بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا تھا۔ اس روز ہندوؤں کے بازار اور دکانیں بند رہتی تھیں مگر حلوائیوں کی دکانیں کھلی رہتی تھیں۔ برلا مندر تو نئی دلّی کے ساتھ بہت بعد میں بنا ہے مگر پرانی دلّی کے سب ہی چھوٹے بڑے مندر اس موقعے پر خوب ہی سجائے جاتے تھے اور عمدہ عمدہ جھانکیاں بنائی جاتی تھیں جن میں کرشن جی کے بچپن کے مختلف منظر پیش کیے جاتے تھے۔ چاندنی چوک میں گوری شنکر کا مندر بہت سجتا تھا۔ دلّی میں ان دنوں ہر گلی بازار اور کوچے میں کوئی نہ کوئی چھوٹا بڑا مندر ہوتا تھا اور یہ مندر ایک سے ایک بڑھ کر سجائے جاتے تھے۔ اس سجاوٹ میں بستی اور محلے کے سب لڑکے بالے اور بڑے حصہ لیتے تھے اور سجاوٹ کی یہ تیاریاں ہفتوں پہلے شروع ہو جاتی تھیں۔ اس کے علاوہ جنم اشٹمی کے موقعے پر لوگ اپنے اپنے گھروں میں بھی ایک چھوٹا سا مندر بنالیتے اور لڑکے اپنی الگ سجاوٹ کر کے گھر کے اندر یا باہر اپنا مندر بنالیتے۔ لڑکوں کو یہ بھی لالچ ہوتا کہ جب گلی محلے کے لوگ دیکھنے آئیں گے تو ان کے مندر میں بھی ایک ایک دو دو پیسے چڑھائیں گے۔

جہاں شام ہوتی اور بتی جلتی، مندروں میں گھنٹے بجنے شروع ہو جاتے۔ مرد، عورتیں اور بچے جوق در جوق، لہروں کی طرح گلیوں اور بازاروں میں نکل آتے اور سب کا رخ مندروں کی طرف ہوتا۔ زیادہ تر آدمیوں اور عورتوں اور بڑی عمر کے لڑکوں نے بھی صبح سے برت رکھا ہوا ہوتا مگر سب کے چہرے کرشن بھگتی میں سرشار ہوتے۔ ایک مندر سے نکلتے، دوسرے میں جاتے اور سب کی سج دھج دیکھتے۔ جھانکیاں ایسی ایسی بنائی جاتیں کہ دیکھنے والے دنگ رہ جاتے۔ عموماً عورتیں اور بچے دس گیارہ بجے رات تک اپنے گھروں میں واپس لوٹ جاتے تھے مگر کرشن بھگت مرد اور بہت سی عورتیں بھی مندروں میں ہی بیٹھی رہتیں اور پوجا کرتیں۔ جب سری کرشن کے جنم کی گھڑی آتی یعنی کرشن جی کا جنم ہوتا تو لوگ خوشی کے مارے دیوانے ہو جاتے اور بھگوان کرشن جی کے نعروں سے مندر گونج اٹھتے۔ گھنٹے گھڑیال مسلسل بجتے اور لوگ مندر کے پرشاد سے ہی اپنا برت کھولتے اور گھر والوں کے لیے بھی پرشاد لے آتے۔ گھر میں عورتیں پوجا کرتیں اور پھر سب برت والے مل کر کھانا کھاتے۔ گھروں میں اس دن پوری کچوری اور طرح طرح کی پنجیری بنائی جاتی عموماً گوند، مکھانے اور خربوزے کے بیجوں کی بہت لذیذ پنجیری بنتی تھی۔

ہفت تماشہ کے مصنف کے مطابق بعض مسلمان بھی جنم اشٹمی کے دن کنس کا مجسمہ بنا کر اس کے پیٹ کو چاک کرتے تھے۔ اس میں شہد پہلے سے بھر دیتے تھے اور اسے اس کا خون سمجھ کر پیتے تھے۔ بہت سے مسلمان چلتی پھرتی جھانکیوں کو بھی بازاروں اور سڑکوں پر دیکھتے تھے اور کرشن جی اور رادھا کا ذکر بڑے احترام سے کرتے تھے۔

نائن ۔ دِلّی کی بولی ٹھولی

مہیشور دیال

ریت رسموں میں نائن اور مشاطہ کا بڑا دخل تھا۔ ان کے بنا سارے کام ادھورے تھے۔ ہندو گھرانوں میں تو بیاہ شادی، ریت رواج میں نائن کی بڑی پوچھ تھی۔ بیتے بیتے ذرا کر سیدھی کی ہوگی کہ دادی اماں نے نائن کو ڈیوڑھی میں آتے دیکھا۔ وہ ہاتھ میں سونٹا لیے، گلے میں پان دبائے ہانپتی چلی آرہی تھیں۔ اس کائستھ گھرانے کی یہ نائن اپنے نام کی ایک ہی تھیں۔ بہت چُھپے دار باتیں کرتی تھیں۔ جب بھی گھر میں آتیں، کسی کا ان کے پاس سے اُٹھنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ آتیں بھی ایسے ہی وقت تھیں جب گھر میں سوفتہ سا ہو۔ گھنٹوں بیٹھی بیٹھی دنیا جہاں کی باتیں کیا کرتیں۔ کوئی اپنے بیٹے بیٹی کو سات تالوں میں بند کرکے بھی رکھے تو بھی ان کا کچا چٹھا سنا جاتیں۔ پاتال تک کی خبر رکھتی تھیں۔ خوب بڑھا چڑھا کر باتیں کیا کرتیں۔ اور اچھے اچھے کو شیشے میں اتار لیتیں۔ مجال ہے کہ ان سے نک سک کا عیب چھپ جائے۔

ایک دفعہ کی بات ہے کہ لڑکے والوں کو کوئی لڑکی بہت پسند آئی۔ نائن کو رشتہ پکا کرنے کا کام سپرد ہوا۔ نائن نے لڑکی کے پیٹھ کے بالوں کا رُخ دیکھ کر کہہ دیا کہ لڑکی کی پیٹھ پر سانپن ہے،

رشتہ ٹھیک نہ بیٹھے گا۔ لڑکے والوں نے نائن کی بات آئی گئی کر دی اور بیاہ کر دیا۔ تھوڑے دنوں بعد لڑکے والوں کا نتیجہ بھگتنا پڑا۔ لڑکی بیمار پڑی اور لڑکا گبرا ہو کر مرا۔

نائن کا کام رشتے طے کرانا ہی نہیں تھا۔ وہ ساری ریت رسمیں پوری کرواتی تھیں اور سب ٹھک ٹھیلوں میں گیت گاتی تھیں۔ اِن نائن کی آواز تو بہت پاٹ دار اور لوچ والی تھی۔ پرکھوں کے نام لے لے کر ڈھولک پر گیت گاتیں اور شادی بیاہ میں مہندی، گھوڑی، بنّے، سہاگ، بدھاوے، کنگنا، منڈھا، بدائیگی اور ٹونے گاتیں۔

نائنوں کی بہت عزت کی جاتی تھی۔ گھر کی بڑی بوڑھیاں اُن کو نان بہو کہہ کر اور بہو بیٹیاں تائی، چاچی کہہ کر بلاتی تھیں۔ یہ نائن تو خوب موٹی تازہ تھیں اور پنڈا بہت بھاری تھا۔ بیٹھتیں تو بہت جگہ گھیرتیں۔ لڑکیوں نے نائن کا نام بارہ منی توپ رکھ رکھا تھا۔ لیکن ان کے پیٹھ پیچھے ہی باتیں بناتی تھیں۔ ان کے سامنے کسی کو کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔

جیسے ہی نائن نے آنگن میں پاؤں رکھا، ایک لڑکی نے دوسرے کے کان میں کہا۔ لے لو وہ آگئیں گھی کا کُپّہ، بارہ منی توپ۔ دوسری نے اس کے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر ڈانٹا چپ رہ' نائن تائی نے سن لیا تو تیرا بیاہ کسی نکھٹے سے کروادیں گی۔ ایک لڑکی دوڑ دوڑی گئی اور اس نے نائن تائی کے لیے کھٹیا لاکر ڈال دی۔ لیکن نائن زمین پر بچھی چاندنی پر دادی اماں کے سامنے پسر کر بیٹھ گئیں اور ہنس کر بولیں —— لے بیبو، پرے رکھ اپنی کھٹیا کو، میں نہیں بیٹھتی تیری کھٹملوں والی کھٹیا پر۔ لڑکی بولی۔ ہاں نائن تائی تم کاہے کو بیٹھوگی ہماری کھٹیا پر، تمہارے سیاں نے تو ہر دم تمہارے لیے چھپر کھٹ بچھایا، ہمیشہ تمہاری نازبرداری کی۔ نائن تڑپ کر بولیں —— سیاں جی نے اس دنیا میں لاکھوں روپے بنے، کبھو نہ لائے لڈو، ہم کو بیر کھلائے کھٹے۔ لے سیاں نے کمایا تو میں کیا کروں، میں تو تیری دادی کے ہی گن گاتی پھروں ہوں، سدا انھوں نے ہی مجھے پوچھا، میرے پاس تو جو کچھ جمع جتھا ہے، تیری دادی کا ہی دیا ہوا ہے۔ مجھے اور اور کوئی کیوں نہال کرنے لگا۔ لڑکی بولی۔ نائن تائی ہم تو سمجھے تھے، تمہاری دوہری کمائی ہے۔ پر تمہارے اُن کی تو وہی بات نکلی کہ ٹیم ٹام کی پگڑی وہ بھی صدقہ جورو کا۔ نائن کچھ کہنا چاہتی تھیں کہ دادی اماں نے لڑکیوں کو زور سے ڈانٹ کر کہا —— خبردار، بہت جیبھ چلانی اچھی نہیں۔ ٹرٹرکے چلی

جارہی ہیں۔ اِتنے دنوں بعد تو نائن بہو آئی ہیں، بات ہی نہیں کرنے دیتیں۔ زیادہ اوندھا پڑا بکوگی تو برادری میں نام نکل جائے گا۔

دادی اماں کی بات سن کر سب لڑکیاں خاموش ہو کر ایک طرف کو سرک کر بیٹھ گئیں۔

دادی اماں نائن سے بولیں ــــ اچھی نائن بہو تم نے بھی حد کردی۔ اِتنے دنوں سے یاد کرتی تھی تھیں۔ پر تمہیں یاد کرنے سے فائدہ بھی کیا۔ تمہیں تو بھلکی بھی نہیں آئی ہوگی۔ سچ پوچھو تو میرا کب سے تم میں دھیان لگا ہوا تھا۔ اچھا یہ بتاؤ آج کیسے رستہ بھولیں۔ نائن نے مٹک کر جواب دیا۔ لو اور سنو! یہ ایک ہی رہی۔ میں رستہ بھولی کہ آپ ہمیں بھولیں۔ کبھی تو یاد کیا ہوتا۔ نوکر چاکر ہی بھیج کر بھجوایا ہوتا کہ تمہاری نائن بہو مرے ہے یا جیے ہے۔ مریں تمہارے دشمن۔ دادی اماں بولیں، کیسی بات منھ سے نکالتی ہو تم بھی نائن بہو۔ خیر چھوڑو۔ ان باتوں کو، یہ بتاؤ کہاں سے چلی آرہی ہو؟ اے ماں جی نائن احسان جتلاتے ہوئے بولی۔ تمہارا ہی کام کرتی پھروں ہوں۔ دادی اماں یہ سن کر کچھ حیران ہوئیں اور بولیں۔ ہمارا کام؟ کون سا کام؟ نائن اپنا ماتھا پکڑ کر بیٹھ گئیں اور کہنے لگیں ــــ اے اماں جی ہم تو سویرے سے اپنی ٹانگیں توڑ رہے ہیں اور بڑی بہو کو پتہ بھی نہیں! آپ ہی کے کہنے سے میں دیوان جی صاحب کے یہاں گئی تھی۔ آج کل ان کے بڑے دور دورے ہیں۔ چاندی رُل رہی ہے اُن کے یہاں۔ لڑکیاں بھی بڑی ہونہار ہیں۔ بہت سیوا اور ٹہل کرتی ہیں اپنے پیارے ماں باپ کی۔ ایک بٹیا تو چاند سی ہے۔ آنکھوں میں موتی کوٹ کوٹ کر بھرے ہیں۔ آنکھیں ایسی کٹیلی ہیں کہ بھی کیا کہنے، مرمرا جڑا ہوا۔ اور بتیسی ایسی جیسے موتیوں کے دانے۔ آواز ایسی سریلی جیسے شہد کا ٹپکا۔ میں تو کہتی ہوں کہ اپنے پوتے کا بیاہ دیوان جی کی بٹیا سے رچادو۔ شبھ کام میں دیر کیسی؟

دادی اماں کو دیوان جی کے گھر کا حال چال پہلے ہی سے پتہ چل چکا تھا۔ بولیں۔ نائن بہو تم بھی کس کے یہاں کی بات لے بیٹھیں۔ نام بڑے درشن تھوڑے۔ دیوان جی کے یہاں کی بھلی چلائی۔ ارے اب وہاں دھرا ہی کیا ہے جہاں بہو کا پینا وہیں سسر کی کھاٹ پہلونٹی کی بیٹی کی شادی میں سارا روپیہ لنگری کردیا۔ سب بارہ باٹ ہوگیا۔ اب تو پھٹے حال ہیں ان کے۔ اور بڑی لڑکی تو آنکھ ناک کی کچھ اچھی بھی تھی پر چھوٹی کے کیا کہنے۔ آنکھ نہ ناک نبو چاند سی ــــ لیکن

ماں جی، نائن بولیں، گانا بجانا؟ ارے چھوڑو گانا بجانا۔ دادی اماں تنک کر بولیں، گانا بجانا وہ کیا جانے۔ بھانس نہ بھسکا۔ گانے کا چسکا۔ لے ہمارے یہاں اور نے آؤ۔ نہ بھئی نہ بیٹھی بیٹھی کیے گی سن رے ڈھول بہو کے بول۔ مجھے ان کے یہاں کا رتی رتی حال معلوم ہے تم کہاں کی بات لے بیٹھیں، وہی بات ہوئی۔ دلّی سے میں آؤں، خبر کہے میرا بھائی۔

نائن اپنی جھینپ مٹانے کے لیے بولیں۔ لے میں کیا جانوں۔ میں ان کے یہاں گئی تو دیکھا کیا لڑکی کی موسی بیٹھی بڑ بڑ ہانک رہی ہے لڑکی ایسی ہے، ویسی ہے، یوں کرے ہے، ووں کرے ہے۔ دادی نے نائن کی بات کاٹ کر کہا ــــ لے سنی سنائی بات کا کیا۔ اس کی موسی بڑ نہیں ہانکے گی تو اور کون ہانکے گا۔ گھٹنے نویں گے تو پیٹ ہی کو تو نویں گے ــــ

نائن کو جب اپنی دال گلتی نظر نہ آئی تو جھٹ بات پلٹ کر بولیں ــــ ماں جی آپ کا تو بیبو کا بیاہ کرنے کو جی ہی نہیں چاہتا۔ چھوری کو کب تک گھٹنے سے لگائے بیٹھی رہوگی۔ خیر سے بارہ برس کی ہونے آئی، سیانی ہو چلی۔ کوئی اچھا سا گھر بر ملے تو ٹھیک کردو۔ دادی بولیں لے نائن ابھی تو تم ہمارے پوتے کا بیاہ رچا رہی تھیں، اب بیبو کی بات کرنے لگیں۔ لے بیبو تو ابھی بہت بھولی ہے اس کی عمر ہی کیا ہے۔ اٹھان کی بڑی ہے۔ ایسی چھوٹی سی کو پرائے حوالے کیسے کردوں ــــ ماں جی، نائن بولیں، میں تو آپ کے بھلے کے لیے کہتی تھی۔ ایسا بڑھیا گھر چھانٹا ہے۔ بیبو کے لیے کہ آپ بھی کیا یاد کریں گی۔ چھورا سندر صورت، موہنی مورت ہے۔ کچھ بہت بڑا بھی نہیں۔ بس یہی کوئی پندرہ سولہ کا ہوگا۔ آدمی بھی ان کے یہاں گنتی کے ہیں۔ کچھ دھان نہیں۔ آنا پتا بتادوں۔ ارے وہی آپ کا جانا پہچانا گھر ریاست والے بخشی جی کا۔ نائن نے اپنی بات پوری بھی نہ کی تھی کہ دادی اماں بولیں ــــ ہاں ہاں بخشی جی کو کون نہیں جانتا۔ ایک وقت تھا کہ یہاں دولت رُلتی تھی۔ دروازے پر ہاتھی جھومتا تھا۔ پر اب وہاں کیا دھرا ہے ــــ بڑے باس کی کھرچن بھی بہت ہوتی ہے ماں جی، نائن بولیں، یہ بھی سوچا ہے آپ نے۔ اُن کے پاس سب کچھ ہے۔ بیبو کے بھاگ میں تو بخشی جی کا گھر ہی لکھا ہے۔

دادی جی بولیں ــــ یہ تو سچ ہے کہ جہاں جس کی لکھی ہے وہاں ہو کر رہے ہے۔ جڑیا سنجوگ کے ہاتھ میں ہے پر میرا تو جی ان کے یہاں کے لیے ٹھکتا نہیں۔ مجھے تو بھرا پرا کنبے کا

گھر اچھا لگے ہے۔ ایسے گھر کو کیا چاٹوں جہاں چوہی کا بچہ بھی نہیں۔ اور نائن بہو تمہارے کان میں ایک بات کہوں۔ ان کے یہاں تو یہ برائی ہے کہ بخشی جی کی دو دو بہویں ہیں۔ دونوں کی آپس میں بنتی نہیں۔ کسی نے ٹھیک کہا سوت چون کی بھی بُری۔ چھوٹی کے تو مزاج ہی نہیں ملتے، ہر وقت ناز نخرے، بناؤ سنگار میں لگی رہتی ہے۔ اور بڑی کا مزاج تو آگ ہے۔ اور ہاں ایک بات تو بتانا بھول ہی گئی۔ یوں تو بخشی جی دلّی والے ہیں، پر اب تو رجواڑوں میں چلے گئے ہیں۔ آیا بڑا کلیجہ کہاں سے لاؤں کہ اپنی بیبو کو کالے کوسوں بیاہ دوں۔ بڑوں نے ٹھیک ہی تو کہا ہے۔ دلی کی بیٹی، متھرا کی گائے، کرم پھوٹیں تو باہر جائے۔ یہ بات تو نائن کے دھیان سے بھی اتر گئی تھی۔ فوراً ایک اور تجویز پیش کر دی۔ ماں جی اب زیادہ کرید بینی مت کرو بیبو کو تو منشی جی کے یہاں بیاہ دو۔ جیسے تمہاری بیبو دو موتیوں میں ایک چُنی ہے، ایسے منشی جی کا لڑکا بھی لالوں میں لال ہے اور گھر بھی جیسا تم چاہو کنبے والا۔ سات مائیں سات دھائیں۔ ہاں البتہ لڑکے کا رنگ ذرا گیہواں ہے۔ سو کیا ہوا۔ ماں کا پیٹ کمہار کا آوا، کوئی گورا کوئی کالا۔ کہیوں ماں جی کہو کیسا بڑھیا گھر ڈھونڈ نکالا۔ کہو تو آج ہی بچی کروا دوں۔ سوچ لو، کبھی پھر ڈھسل جاؤ۔

دادی اماں نے اس بات کا تو کوئی جواب نہ دیا۔ سینے پرونے کی خلیلی لے کر کھڑی ہو گئیں اور نائن سے بولیں — اے نائن بہو پان کا ٹکڑا کھائے بنا نہ چلی جانا۔ ابھی آتی ہوں۔ اور دادی کے اٹھنے کی دیر تھی کہ سب لڑکیاں نائن کے پاس آ دھمکیں اور آتے ہی ریل گاڑی سی چھوڑ دی۔ ایک بولی۔ اچھی نائن تائی یہ بتاؤ تمہارا بیٹا تو موج میں ہے۔ رام جی رکھیں اب تو تمہارا لٹو سامرتھ ہو گیا ہوگا اور تمہاری بہو کیسی ہے۔ بھئی ہم تو کہتے ہیں نائن تائی کی آج کل پانچوں گھی میں ہیں کیوں نائن تائی؟

اپنی بہو بیٹے کی بات سن کر نائن طنزیہ لہجے میں بولیں — لے ہاں، ہاں کیوں نہیں، کیوں نہیں اور سر کڑھائی میں جو ہے۔ ہمارے بیٹے اور بہو کی سارس کی سی جوڑی ہے۔ اری بیٹی اپنے خصم سے تو سب لاڈ چاؤ کرے ہیں پر ایسی بے شرم کہیں نہیں دیکھی۔ نہ دیکھنا چاہوں ہوں، بیٹے پر تو ٹونا سا کر دیا ہے اور بیٹا کون سا اچھا ہے۔ جب سے بہو بیاہ کر لایا ہے۔ نکھٹو ہو گیا ہے۔

گھر میں پڑا پڑا اینڈتا رہتا ہے روٹیاں لگ گئی ہیں جورو کے گلام کو۔ مرد کی صورت ہو کر کمایا نہیں جاتا۔ پتی کے پینڈے بیٹھے بیٹھے روٹیاں توڑ رہے ہیں۔ دونوں کے دونوں کھا کر سنڈیا رہے ہیں۔ بیٹھا بیٹھا مٹھر مٹھر باتیں بناتا ہے۔ کام دھندا سب چھوڑ رکھا ہے۔ حرام خوری پر تُل گیا ہے۔ لوگ کہیں ہیں، بے پرماتما بیٹا دے، بیٹا دے۔ بیٹا ہوا تو اس نے کون سا نہال کر دیا اور اس بہو کے لچھن تو دیکھو۔ مری جوں سی ہے۔ کام کی نہ کاج کی، ڈھائی من اناج کی۔ ہوئی نجر چولہے پہ نجر۔ لاکھ سمجھاتی ہوں کسالے کی کمائی ہے، یوں نہ گنواؤ۔ لیکن دونوں کے دونوں چکنے گھڑے ہیں۔ بوند پڑی اور پھسلی۔ ٹھیک ہے بھئی۔ ابھی تو چار پیسے کی مایا ہے لیکن جب کوڑی پلے نہ رہے گی۔ ناوے کا اچھی طرح سلفہ ہو جائے گا، پھر کیا ہوگا۔ ہوگا کیا؟ وہی حال ہوگا چنے چبالو، شہنائی بجالو۔ اری بیٹیو کیا بتاؤں ان دونوں کو تو حرام مال کا چسکا پڑ گیا ہے خرچ گھنا اور پیدا تھوڑی کس پر باندھوں گھوڑا گھوڑی۔ نائن تائی، ایک لڑکی بولی، ہم نے تو سنا تھا کہ تمہاری بہو بڑا جہیز لے کر آئی ہے اور تمہارے سمدھی راجہ کی پکی حویلی ہے۔ حویلی کا نام سنتے ہی نائن کا پارہ آسمان پر چڑھ گیا، بولیں — حویلی، حویلی بڑا آیا حویلیوں والا۔ ارے تمہیں کیا معلوم ہماری بہو کا بیاہ سے پہلے کلیہا سا گھر تھا۔ اب اتنا بڑا ڈھنڈار مکان دیکھ کر اس کے دیدے پٹم ہو گئے ہیں۔ دھرا کیا تھا اس کے باوا کے پاس۔ یہاں آ کر جون پلٹ گئی۔ ورنہ تم جانو باپ بچارے کا تو مانگے تانگے سے کام چلتا ہو تو چلتا ہو۔ کبھی گڑیا نون کی کنکری مل گئی تو چولہا گرم نہیں تو کڑاکا۔ جہیز دے گا وہ، بڑا آیا جہیز دینے والا۔ جیسے اس کے باوا کے یہاں کوئی کھیتی اُگ رہی تھی۔ وہ کس پر اپنی بیکڑی جتاتا ہے۔ مجھ سے آنکھ ملا کر بات کرے سب کے بھرے بازار میں پگڑی اتار لوں۔ کہنے کو تو نام فتح چند ہے پر اس کی تو وہی بات، مرے نہ جو باپ پھاڑے خاں۔ بے بے بیٹی، اب کہاں تک اپنا جھینکنا جھینکوں۔ پرماتما کرے کسی کی بری گھڑی نہ آوے۔ سکھ سمپت کے سب کوئی ساتھی۔ دکھ میں کون کسی کی چنتا کرے۔ اپنی رام کہانی کہاں تک سناؤں۔ سچ پوچھو تو بیٹی میرا تو من ہی مر گیا ہے۔ ہر وقت کڑوی کسیلی باتیں ہوتی ہیں گھر میں۔ یہ دونوں کے دونوں منہ پر کلونس لگا کے چھوڑیں گے۔ اچھا بھئی کالکھ لگتی ہے تو لگ کر رہے گی۔ بڑھاپے میں مٹی پلید ہونی ہے تو ہو کر رہے گی۔ سچ پوچھو تو اب

سہار نہیں رہی۔ میں نے تو جو کچھ کیا تھا اچھے کے لیے کیا تھا مجھے کیا خبر تھی کہ بوؤں گی گیہوں، اُگیں گے جو۔ لڑکیاں بیچ میں ٹوک کر بولیں ـــ لے نائن تائی اپنا جی مت کھٹا کرو۔ ہمیں کیا پتہ تھا۔ تمہارے بیٹا بہو ایسے نکمے ہیں۔ ہم تو سمجھے تھے بڑی سکھی ہوں گی ہماری نائن تائی۔ بیٹے کے بیاہ کے بعد بیٹھی بیٹھی راج رچاتی ہوں گی۔ پر یہ دونوں تو بڑے بے ڈھنگے نکلے۔ تمہاری ساری جمع جکڑی مسوس کر رکھ دینا چاہتے ہیں۔ شکل صورت کی تو بڑی بھولی لگتی ہے تمہاری بہو۔ یہ سن کر نائن پھر بگڑ کر بولیں۔ بھولی بھولی مت سمجھنا اس کو۔ پوری ڈائن ہے۔ ابی وہ تو جیتے کو نگل لے۔ اس کا بس چلے تو میرا بدھنا، بوریا، انگر کھنگر، کھاٹ کھٹولا سڑک پر پھنکوا دے۔ نرک چودش سی کھڑی رہتی ہے۔ ایک چیز دیتی ہے اور بیس نہورے دیتی ہے۔ کسی کی کہاوت ہے، گھر کر، گھر کر شتر بلا سر دھر۔ اندر سے کڑھ کڑھ کر مر جاتی ہے اور اوپر سے جی سکھ جی سکھ کرتی رہتی ہے۔ بہو کے لیے ساس اس کی دوتی اور نند اس کی بیرن ہے کتنا ہی سر کھپاؤ پر اس کی سمجھ میں آئے تب نہ۔ خیر میں نے بھی اس سری کی بہت دیکھی ہیں۔ دھوپ میں چونڈا سفید نہیں کیا مجھ سے تُرش لائی تو منھ بگاڑ دوں گی۔ مجھ سے بہت لیپا پوتی اچھی نہیں، کیوں ٹھیک کہوں نہ؟ لے بولو نہ بولتی کیوں نہیں، ہونٹ سی کے کیا بیٹھی ہو؟

لڑکیاں خوب گردن ہلا ہلا کر نائن کی ہاں میں ہاں ملانے لگیں۔ ایک بولی۔ لے نائن تائی کمال کر دیا تمہاری بہو نے تو۔ بڑی بے ایمنتی نکلی وہ تو بجائے تمہارا ہاتھ بٹانے کے تمہیں ستاتی ہے۔ گلچھرے اڑاتی ہے۔ وقت برباد کرتی ہے۔ گھر میں جی نہیں لگتا۔ نائن بولیں لے ہاں اور کیا، بہو کا گھر میں تلوا نہیں ٹکتا۔ ہڑ دھڑ آئی اور پھر باہر جا دھمکی۔ میری تو صورت سے چڑتی ہے۔ بس کی گانٹھ ہے۔ یہی چاہتی ہوگی بڑھیا کو زہر دیدوں۔ پر اُسے کیا معلوم، لاکھ زہر ہتھیلی پر لیے پھرو بن کھائے کوئی مرتا ہے۔ اری بیٹی میں تو تقدیر کے لکھے کو پیٹ رہی ہوں۔ ایک تو اپنا مال لگا نا دوجے اپنا جوبن گنوانا ہے۔ ہے کیا کروں مجھے تو اب نہ کھانے کی سرت رہی، نہ پینے کی۔ بس اس سٹر پٹر میں دن نکل جاتا ہے۔ خیر آدمی ہے، جیسی پڑتی ہے سہہ لیتا ہے۔ ہم تو ساگ پات کھا کر گزارہ کر لیں ہیں لیکن سوچتی ہوں میرے بعد ان راجا رانی کا کیا ہوگا۔ دونوں اَین گین ہیں۔ ایک کو چھپاؤں، دوسرے کو نکالوں۔

نائن چنگی میں سے بُلّاس نکووں میں رکھ کر اور سر کو پیچھے جھٹک کر بولیں۔ کہے دیتی ہوں جو بچہ اپنی ماں کو ستائے گا تو پرماتما اس کے پیٹ سے نو مہینے مٹکا بندھوائے گا۔ جی چاہتا ہے، دھرتی پھٹ جائے اور اس میں سما جاؤں۔ اتنا کہہ کر نائن کا جی ململا سا ہونے لگا۔ وہ آنکھ میں آنسو بھر کر کچھ کہنا چاہتی تھیں لیکن دادی اماں کو آتے دیکھ کر جھٹ منھ موڑ کر پلّو سے آنکھیں پونچھنے لگیں۔ دادی اماں نے پوچھا ـــ یہ کیا بات ہے نائن بہو، جی تو اچھا ہے تمہارا، اے کچھ کہہ دیا کسی نے تم سے۔ لو یہ پان کا ٹکڑا تو کھالو۔ بولو تو سہی کیا ہوا ـــ نائن دادی کے ہاتھ سے پان کا ٹکڑا لے کر بولیں ـــ کچھ نہیں ماں جی، کچھ نہیں، کسی نے کچھ نہیں کہا۔ کوئی بات نہیں بس یونہی آنکھ میں کچھ رڑک رہا تھا۔

روزنِ در

جاوید وششٹ

"دیوار ہم گوش دارد" کی بات ہم سنتے آئے ہیں مگر روزنِ در ہمیں یہ ماننے پر بھی مجبور کرتا ہے کہ "دیوار ہم چشم دارد"

دیواروں میں در اور دروں میں روزن ہوتے تھے، آج بھی ہوتے ہیں۔ جدید ساخت کے در ہمارے موضوع بحث سے خارج ہیں۔ تاہم اس سے اتنا ضرور واضح ہوتا ہے کہ روزن در حفاظت صحت کے اصول و قواعد کے تحت نہیں ہوتے وہ بڑھئی کے فن کے ارتقا کی ایک منزل ضرور ہیں۔ عین ممکن ہے کوئی مصلحت بھی اس میں پوشیدہ ہو لیکن ہمارا خیال ہے کہ یہ در کی بے بضاعتی اور کم مائیگی کے سبب بھی ہو سکتا ہے اس کے برعکس روزنِ دیوار ہوا اور روشنی کے لیے ہی ہوتے ہیں۔

قلعوں کے دربانوں اور فصیل کے نگہبانوں کے لیے مصلحتاً دروں میں جھروکے اور روزن بنائے جاتے ہیں۔ تاکہ قلعوں کے دیدبان قلعے میں داخل ہونے والے ہر فرد پر کڑی نگاہ رکھ سکیں۔ اور یہ دیکھ سکیں کہ آنے والا دوست ہے یا دشمن؟ یہ بھی ہماری بحث کا

موضوع نہیں۔

"روزنِ زنداں" یا روزنِ دیوارِ زنداں کی ایک ادبی حیثیت ہے۔ زندان کی دنیا بہت تنگ اور محدود ہوتی ہے اس کی دیوار کے موکھے اور دروں کے روزن بھی زندانی کے لیے غنیمت ہوتے ہیں۔ وہ ان میں سے جھانک کر آسمان کو دیکھ سکتا ہے زنداں کے باہر کی آزاد صبح و شام کو تاک جھانک سکتا ہے۔ چکبست نے کہا تھا ؎

مجھے اسیر کرو یا مری زبان کاٹو
مرے خیال کو بیڑی پہنا نہیں سکتے

یا غالب کا یہ کہنا کہ ؏

زنداں میں بھی خیال بیاباں نورد تھا

گویا زندانی کا خیال روزنِ دیوارِ زنداں سے نہ صرف جھانکتا ہے بلکہ زندانی کو ذہنی اور روحانی طور پر ہر قید و بند سے آزاد کر کے بیاباں نورد بھی کر دیتا ہے فیضؔ "زنداں نامہ" میں روزنِ زنداں کے بجھنے اور جلنے سے اپنے آزاد وطن کی شام و سحر کو یاد کرتا ہے اور اس کے خیال میں کھو جاتا ہے ؎

بجھا جو روزنِ زنداں تو ہم نے سمجھا ہے کہ تیری مانگ ستاروں سے بھر گئی ہوگی
چمک اٹھے ہیں سلاسل تو ہم نے جانا ہے کہ اب سحر ترے رخ پر بکھر گئی ہوگی

جب یوسف، زلیخا کی قید میں تھے تو یعقوب، یوسف کی جدائی میں روتے روتے اندھے ہو گئے تھے۔ غالبؔ نے یعقوب کی آنکھوں کو "روزنِ دیوارِ زنداں" کا خطاب دیا ہے ؎

قید میں یعقوب نے لی گو نہ یوسف کی خبر
لیکن آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہو گئیں

ولیؔ کا دل نگہِ محبوب سے ہزاروں روزنوں کا گھر بن گیا۔ اگرچہ محبوب کی نظر نے دل کو چھلنی کر دیا۔ ہزار سوراخ دل میں ہو گئے جیسے شہد کا چھتہ۔ تاہم شیرینیٔ نگاہِ محبوب، کا بھی یہ عالم ہے کہ دل کو چھلنی بھی کر دیا اور اس میں شہد بھی بھر دیا۔ یہ تضاد محبت کی دنیا کا بہت بڑا حادثہ ہے غم و نشاط کا حسین سنگم ہے۔ ایک ایسا لطیف احساس ہے جس میں بیک وقت

چُبھن بھی ہے اور مٹھاس بھی ؎

تجھ بگیسوں بہ شکل شانِ غسل
دل ہوا گھر ہزار روزن کا

یہ ہزاروں روزن بھی ہماری بحث سے خارج ہیں۔

روزنِ در سے جھانکنے کی توجیہہ کچھ بھی ہو۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ ناظر کا کوئی جذبۂ تشنہ آسودگی کی تلاش میں سرِ اخلاقی اقدار سے بے نیاز ہو کر روزن در سے جھانکنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ جھانکنے میں ایک خاص قسم کی تھرتھراتی لذت کا احساس بھی ہوتا ہے اور اگر اس تاک جھانک کا محرک جنسی جذبہ ہو تو دل کی دھڑکنیں تیز تر ہو جائیں گی۔ سانس کی رفتار بڑھ جائے گی، پیشانی پر پسینے کے شبنمی قطرے چمک اُٹھیں گے، چہرہ تمتما اُٹھے گا، کان کی لویں سرخ ہو جائیں گی، اور ناظر پر ایک عجیب ارتعاشی کیفیت طاری ہو جائے گی۔ روزن در سے نظر آنے والے منظر کے مطابق ہی ناظر کے جذبات موج زن ہوں گے۔

اور اگر دروازہ بند کر کے خلوت میں بیٹھنے والوں کو یہ محسوس ہو جائے کہ روزن در سے انہیں کوئی دیکھ رہا ہے تو وہ یقیناً روزن در کو اندھا کر دیں گے۔ بھارت کے لوک گیتوں میں شبِ وصل کے حسین مناظر کی بھی عکاسی ملتی ہے ان گیتوں کا منتہا CLIMAX اس لمحہ آتا ہے جب گیت کا نایک، گیت کی نایکہ کو اپنی آغوش میں کھینچ لیتا ہے تو نایکہ فوراً دیا بُجھا دیتی ہے۔ دیئے کے بجھتے ہی روزنِ در اندھا ہو جاتا ہے۔ اب اگر کوئی ناظر روزن در سے جھانک بھی رہا ہو تو کیا دیکھے گا؟ لوک گیتوں کے سرسری مطالعے سے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ سہاگ رات کے "جھانکو" ع ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ! کے مصداق روزنِ در و دیوار سے چپک جاتے ہیں اسی لیے سجنی دیا بجھا دیتی ہے۔

جب لوگوں نے خانقاہ کے روزن در سے جھانک کر دیکھا کہ صوفی ایک "فتنہ" خانقاہ" کے ساتھ، جسے دیکھ کر ع اک شیخ کے تو ہاتھ سے تسبیح گر گئی۔ خلوت میں محوِ اختلاط ہے تو صوفی رسوا ہو گیا اور خانقاہ بدنام۔

جب محبت پر پہرے لگ جاتے ہیں تو روزنِ در کا استعمال کچھ اور بڑھ جاتا ہے۔

روزنِ در سے رقیب نے جھانکا تو دیا بجھا کر روزنِ در کو اندھا کر دیا گیا مگر دیوار کے کان تو بہرے نہیں تھے۔ آخر رقیب نے پازیب کے گھنگھرو کی جھنکار سن ہی لی۔ اب تو اس کا کلیجہ منہ کو آنے لگا اور لگا انگاروں پر لوٹنے اور آخر وہ جل بھن کر کباب ہو گیا ؎

جل گیا رشک کے مارے پسِ دیوار رقیب
وصل میں جب ترے پازیب کا گھنگھرو چھنکا

محتسب نے ایک زمانے میں روزن در سے جھانک کر رندوں کو بڑا پریشان کیا تھا۔ رند بیچارے رنگے ہاتھوں پکڑے جاتے تو کچھ دے دلا کر محتسب کا منہ جھلس دیتے تھے لیکن کبھی کبھی ایسا ہوتا تھا کہ محتسب ان کے شیشۂ دل کو توڑ کر چور چور کر دیتا تھا تو وہ بھی بگڑ بیٹھتے تھے اور اکڑ کر کہتے تھے کہ ؎

ہم نے اللہ کے کہنے سے تو چھوڑی یہ شراب
محتسب ہوش کی لے تیری حقیقت کیا ہے

لیکن آج کے جدید سائنسی دور میں محتسب روزنِ در سے خود جھانکنے کے علاوہ کچھ ماڈرن قسم کی مصنوعی اور خوشامدی آنکھوں سے بھی کام لیتا ہے وہ جس کا بھی احتساب کرنا چاہتا ہے ان آنکھوں کو اس کی جانب اشارہ کر کے، لگا دیتا ہے۔ اور وہ روزنِ در میں جا کر چھپ جاتی ہیں ان آنکھوں کی نظر عموماً سطحی اور مشکوک ہوتی ہے اور پھر روزنِ در سے جھانکتے جھانکتے وہ دھندلی پڑ جاتی ہے۔ اسی لیے وہ ٹھیک طور سے اتنا بھی نہیں دیکھ پاتی کہ دروازہ مقفل ہے یا محض کواڑ بھڑے ہوئے ہیں؟

غرض روزنِ در کی تاریخی، سیاسی، سماجی اور ادبی حیثیت اپنے ماحول اور اپنی فضا کے پس منظر میں بڑی متنوع نظر آتی ہے تاہم اگر کوئی ناظر کسی خلوت گاہ میں روزن در سے جھانکنا بھی چاہتا ہے تو اسے ہم یہ مشورہ دیں گے کہ وہ پہلے اپنے گریبان میں منہ ڈال کر اپنے اندر بھی جھانک کر دیکھ لے۔ اس طرح عین ممکن ہے کہ وہ روزن در کی نظر بازی سے باز رہ سکے جو بیک وقت نازک بھی ہے اور خطرناک بھی۔ اور اگر وہ اپنے گریبان میں منہ ڈال کر نہیں دیکھنا چاہتا تو پھر اُسے بقول حالیؔ یہی جواب ملے گا ؎

تعزیرِ جرمِ عشق ہے بے صرفہ محتسب
بڑھتا ہے اور ذوق گنہ یاں سزا کے بعد

جیم، ہے، یے، زے

جاوید وشسٹ

مس روزی اور مسٹر روزگار کی ابھی ڈیٹنگ ہی چل رہی تھی، کہ ایک حسین صبح انھوں نے ایک حیرت ناک منظر دیکھا کہ ایک نومولود بچہ انگوٹھا چوس رہا ہے، اور روزی کو ممی اور روزگار کو ڈیڈی کہہ کر پکار رہا ہے۔ وہ دونوں حیران! کہ ابھی شادی ہوئی نہیں، یا اللہ! یہ پری میرج شو PRE MARRIAGE ISSUE تولد قبل از نکاح چہ معنی؟ نہ روزی حاملہ ہوئی نہ دردِ زہ میں مبتلا ہوئی اور مفت میں ممی بن بیٹھی۔ کنوارے ماں باپ کی یہ اولاد کون ہے؟ نومولود ہو کر بھی بڑوں کی سی باتیں کرتا ہے۔ یہ کہاں سے ٹپک پڑا؟ کیا ہم کوئی خواب دیکھ رہے ہیں؟ روزی نے پوچھا، تم کون ہو؟ تمہارا نام کیا ہے؟ کہاں سے آئے ہو؟ ایک ہی سانس میں اس نے کئی سوال کر ڈالے۔ بچے نے جواب دیا: میں آپ کا بیٹا ہوں۔ میرا نام جیم ہے، یے، زے، ہے اور ارتھ شاستر سے آیا ہوں اس کی چرب زبانی پر دونوں ہکا بکا رہ گئے۔ روزگار نے قہقہہ لگا کر کہا کہ بڑا افلاطونی نام ہے؟ دیکھو میاں! اتنے بکھرے ہوئے نام کو ہم تو سمیٹ نہ سکیں گے۔ اس لیے ہم تمہیں ماسٹر جیم کہہ کر ہی پکاریں گے۔ مگر یہ ارتھ شاستر کیا بلا ہے؟ کون سا

ملک ہے؟" بچہ طعنہ دیتے ہوئے بولا کہ روزی اور روزگار ہوتے ہوئے بھی، آپ ارتھ شاستر کو نہیں جانتے؟ کتاب معیشت!

ارتھ یعنی معیشت، قصرِ حیاتِ انسانی کا بنیادی پتھر ہے۔ لیکن یہ بنیاد اکل حلال یعنی حلال روزی سے استوار ہوتی ہے۔ جب انسان اپنی فطری تلون مزاجی سے حلال سے انحراف کر کے حرام روزی کا لذت چش ہوتا ہے تو قبل از نکاح ولادت کا حادثہ پیش آتا ہے اس کا زندہ ثبوت یہ پُراسرار چار حرفی نام ہے جیم اور ہے۔ قبل از نکاح ولادت اور یے اور زے بعد از نکاح ولادت کے ضامن ہیں۔ جیم اور ہے، جمال اور ہلال، جہاں حسن و عشق کی علامتیں ہیں۔ یے اور زے، یرغمال و زوال، حرام روزی کی دین ہیں۔ اور بعد از نکاح ولادت اور بھی خطرناک ثابت ہوتی ہے۔ دونوں ماسٹر جیم کی باتوں پر انگشت بدنداں تھے۔

ازمنۂ تاریخ سے قبل جب اولادِ آدم نے درختوں اور غاروں سے نکل کر پتھر اور دھات کے زمانے کو خیرباد کہہ کے انسانی سماج کی بنیاد رکھی اور چھوٹی چھوٹی بستیوں میں رہنا شروع کیا تو ارتھ شاستر یعنی کتاب معیشت کا نزول ہوا وہ کتاب ابھی لکھی نہیں گئی تھی صرف سینہ بہ سینہ نسلاً بعد نسل زبانی منتقل ہوتی رہی اس طرح ذریعۂ معاش کی تگ و دو کا آغاز ہوا۔

جب مس روزی اور مسٹر روزگار کی شادی ہوئی تو راز کھلا کہ یہ چار حرفی نام والا ماسٹر جیم جہیز تھا جو روزگار کی طرف سے روزی کے باپ کو دیا گیا تھا۔ یہ بچہ اب جوان ہو چکا تھا۔ جہیز سماج کی ایک ریت، ایک رواج بن گیا۔ پہلے بیٹے والے دلہن کے باپ کو رقم دیتے تھے۔ اس کی لے جو ذرا تیز ہوئی تو بیٹیاں بکنے لگیں۔ رفارمروں نے اصلاح کر کے اس کا انسداد کیا تو جہیز بند تو نہ ہوا، وہ ریورس گیئر میں چل پڑا۔ وقت نے کروٹ بدلی، اب جہیز بیٹی والے کو دینا پڑا۔ سماج کے بیوپاری طبقے نے اسے باقاعدہ ایک دھندا بنا لیا۔ گویا اب لڑکے بکنے لگے۔ اس نے بھی رواج کی صورت اختیار کر لی۔

شادی اور جہیز میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ شادی شب برات ہے تو جہیز پٹاخہ۔ شادی پھلجھڑی ہے تو جہیز چنگاری۔ شادی دیوالی ہے تو جہیز جوا۔ شادی فصلِ گل ہے تو جہیز زنجیرِ جنوں۔ شادی گلاب ہے تو جہیز کانٹا۔ شادی انجبیں ہے تو جہیز نیش۔ شادی شراب

ہے تو جہیز خمار۔

معاشرے کے آغاز میں جہیز رس تھا لیکن آخر آخر بس بن گیا۔ کیوں کہ ابتدا میں جہیز کا رشتہ صرف پریم سے تھا، اس لیے وہ خلوص اور خیر سگالی کے جذبات کا آئینہ تھا۔ لیکن جب سے اس کا رشتہ اقتصادیات سے جڑا ہے۔ اس نے استحصالی شیطانی روپ دھار لیا ہے۔

جہیز کی دو صورتیں ہیں۔ ایک جہیز برضا و رغبت، دوسری جہیز بہ جبر۔ دوسری صورت سے پہلی صورت غنیمت ہے پہلی دوسری سے بہتر ہے۔ مگر پہلی قسم کا جہیز بھی جب دولت و امارت کے مظاہرہ اور نام و نمود سے وابستہ ہو جاتا ہے تو سماج کے کم بساط لوگ بھی اس کی نقل کرنے لگتے ہیں اور اس طرح یہ بھی ایک لعنت بن جاتا ہے۔ درمیانی طبقہ کے معاشی ڈھانچے کو توڑ کر رکھ دیتا ہے۔ اور وہ قرض کی دلدل میں پھنس کر رہ جاتا ہے۔

ہمارے دیہات میں جہیز لینے اور دینے میں زبردست مقابلہ ہوتا ہے۔ سب سے بڑھ کر جہیز دینے والے کی بابت کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص نے تو لکڑ ڈال دیا۔ گویا اب اس سے بڑھ کر جہیز دینے کی جسارت آسان نہیں۔

سماج سدھار کے لیے مختلف برادریوں کی پنچائتیں ہوتی ہیں تو وہ اپنی اپنی برادری میں جہیز کی سیلنگ کرتی ہیں بلکہ پوری شادی اور برات وغیرہ کی بھی حد بندی مقرر کرتی ہیں لیکن برادریوں کے نودولتیے بظاہر پنچایت کے فیصلے کے مطابق نمائش ضرور کرتے ہیں، مگر در پردہ اپنا کالا دھندہ جاری رکھتے ہیں۔ ایک پر لطف بات یہ ہے کہ براہمنوں کی پنچایت کبھی کامیاب نہیں ہوتی یہ شاید ان کی غیر معمولی ذہانت کا ثبوت ہے۔

جہیز بہ جبر، بڑا ظالم اور سفاک ہوتا ہے اس میں ایک طرف بیٹی والے کا اقتصادی طور پر کچومر نکل جاتا ہے تو دوسری طرف نو عروس کی زندگی خطرے میں پڑ جاتی ہے اگر حکمت عملی سے دلہن نے سسرال والوں کے مطالبات پورے بھی کر دیئے تو ذہنی طور پر سسرال اور مائکے میں ایک ایسی خلیج پیدا ہو جاتی ہے جو کبھی نہیں پاٹی جا سکتی۔ آنے والی نسلیں بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتیں۔

ماسٹر رحیم نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ بعد از نکاح جہیز کا مطالبہ زیادہ خطرناک ہوتا ہے وہ دلہن کی جان ہی لے لیتا ہے۔ آئے دن اخباروں میں نئی نویلی دلہنوں کے اسٹوو سے جلنے کی خبریں شائع ہوتی ہیں۔ سرکار اس کے انسداد کے لیے قانون بنانے کی فکر میں ہے۔ مگر کیا قانون اس لعنت کو روک سکتا ہے؟ قانون ہاتھی کے دکھانے کے دانت ہیں، کھانے کے نہیں۔

"جہیز ہٹاؤ! دیش بچاؤ سنستھا" کا ادگھاٹن کرتے ہوئے ایک منسٹر نے جہیز کے خلاف بڑا دھواں دھار بھاشن دیا۔ بڑی ولولہ انگیز تقریر کی۔ ہمارے ایک دوست ان کے بھاشن سے بڑے پربھاوت ہوئے ان کی تقریر سے بہت متاثر ہوئے تو وہ ایک دن اپنی بیٹی کا رشتہ ان کے لڑکے سے کرنے کی نیت سے منتری مہودے کے بنگلے پر پہنچے۔ منتری جی کے پرائیویٹ سکریٹری نے جہیز کی ایک طویل فہرست ان کے ہاتھ میں تھما دی جس میں زیورات و ملبوسات کی جزئیات اور سامان آرائش و تعیش کی تفصیل سے لے کر کلر ٹی وی تک شامل تھی۔ فہرست کے آخر میں 'الیکشن فنڈ' کے لیے ایک موٹی رقم کا بھی اندراج تھا۔ میرے دوست بڑے خفا ہوئے اور منتری مہودے سے الجھ گئے کہ آپ نے بھاشن میں جہیز کی زبردست مخالفت کی تھی۔ اس پر عمل کیوں نہیں کرتے؟ منتری مہودے نے انہیں ٹھنڈے پانی کا گلاس پیش کرتے ہوئے مسکرا کر کہا وہ بھاشن تو ہاتھی کے دانت تھے جو صرف جنتا کو دکھائے جاتے ہیں اور یہ معاملہ بالکل نجی ہے۔ جماعت اور فرد میں کچھ فرق تو ہونا ہی چاہیئے۔

مشہور کہاوت ہے کہ رشتہ ناتہ برابر والوں سے ہی اچھا رہتا ہے۔ یہاں برابری سے مراد اقتصادی برابری ہے۔ جب لوگ اس توازن سے تجاوز کرتے ہیں تو نئے نئے مسائل کھڑے ہو جاتے ہیں۔ گاؤں کی خوب صورت کہاوت ہے کہ "آپ سری کا ڈھونڈے اور ڈھولا دھرے نام" اگر اس توازن کو قائم رکھا جائے تو جہیز کبھی مسئلہ نہ بنے۔

آج ہمارا معاشرہ لگژریز یعنی سامان تعیش کے پیچھے پاگل ہو رہا ہے۔ خاص کر متوسط و ہائٹ کالر طبقہ۔ اس پاگل پن نے بھرشٹاچار اور کرپشن کو بہت فروغ دیا ہے۔ اسی کرپشن نے جہیز کی اور جہیز نے کرپشن کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ جہیز لگژری اور کرپشن کی تثلیث نے کتنی ہی

دوشیزاؤں کو دار پر چڑھا دیا۔ کتنے ہی بیٹی والوں کو دیوالیہ بنا کر بے گھر کر دیا اور اخباروں کو DOWRY DEATHS کی خوفی سُرخیاں دے دیں۔

آج اگر ہم اپنے سماج پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ پوری سوسائٹی بیک وقت تین بحرانوں کے بھنور میں پھنسی ہے۔ اخلاقی بحران، معاشی و اقتصادی بحران اور سب سے بڑھ کر سیاسی بحران۔ ہماری راج نیتی کالے دھن پر آدھارت ہے۔ کالا دھن سیاسی رتھ کے پہیوں کی دُھری ہے۔ زرِ سیاہ سیاسیات کا محور ہے۔

جہاں امن سبھا بنتی ہے، وہاں فساد ضرور ہوتا ہے۔ جہاں اتحاد و امن کا ادارہ قائم ہوتا ہے، وہیں فرقہ وارانہ فسادات بھڑک اُٹھتے ہیں۔ آخر کیوں؟ اس لیے کہ ہماری جملہ اعلیٰ قدریں، جن کا ہم ڈھنڈورا پیٹتے رہتے ہیں وہ بالکل کھوکھلی ہو چکی ہیں۔ بلکہ ان بلند آہنگ دعوؤں نے ہمیشہ کمزور طبقوں کا استحصال کیا ہے، ان کا شوشن کیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ محض جہیز کو ہی لعنت قرار دینا غلط ہے آج تو الف سے لے کر ی تک پورا معاشرہ ہی ایک لعنت ہے۔ آوے کا آوا خراب ہے۔ جہیز کو سماج کی لعنتوں کی گنتی کا ایک سرا ہی کہا جا سکتا ہے۔

شادی کی مدجب تک والدین کے اختیار میں رہے گی، جہیز کسی نہ کسی شکل میں جاری رہے گا۔ لاکھ قانون بنیں آوازیں اُٹھیں۔ کیوں کہ قانون بنانے والے اور نعرے لگانے والے ہی جب خلوت میں جاتے ہیں تو بڑے سلیقے سے جہیز کا مطالبہ کر دیتے ہیں۔ ریاکاری دورِ حاضر کا سکۂ رائج الوقت ہے۔ شادی کی مدجب پوری طرح بالغ لڑکے اور لڑکیوں کے اختیار میں آجائے گی تو یقیناً کچھ سُدھار ہونے کی سمبھاونا ہو سکتی ہے کیوں کہ ان کی شادی کا آدھار محبت ہوگی نہ کہ دولت، بوڑھے والدین محبت پر دولت کو ترجیح دیتے ہیں۔ اور اولاد کی شادی میں بھی کچھ نہ کچھ کمانے کی ہی سوچتے ہیں۔

"زندہ دلانِ کرنگ" بڑے اہتمام سے "پھلواری" کا جہیز نمبر نکالیں گے۔ جہیز کے خلاف مہم کا آغاز کریں گے۔ لیکن اس کے باوجود نئی نویلی دلہنیں جلتی رہیں گی گھر اُجڑتے رہیں گے۔ منسٹر الیکشن فنڈ کا مطالبہ جہیز کی فہرست میں شامل کرتے رہیں گے۔ "جہیز ایک لعنت ہے" کا نعرہ بھی بلند ہوتا رہے گا: "جہیز ہٹاؤ، دیش بچاؤ"! اشتہار

بھی بنتی رہیں گی۔

ہاں! اگر ملک کی یوتھ پاور YOUTH POWER زندہ دلانِ کرناٹک کا ساتھ دے، ماس میرج MASS MARRIACE کی ریت اپنائے تو جہیز کو پارہ پارہ کر کے جہیم سے بے نرے کیا جا سکتا ہے

"ہم بیچارے نوجوان!"

سید ضمیر حسن دہلوی

اللہ جانتا ہے ہمیں کسی سے بُغض و عناد نہیں۔ کینہ پروری ہمارا شعار نہیں اور خدانخواستہ بڑے بوڑھوں سے ہمیں عداوت بھی نہیں، پر کیا کریں طعن تشنیع سنتے سنتے کان پک گئے۔ کلیجہ چھلنی ہوگیا۔ آخر ہم بھی تو انسان ہیں۔ ایک دن کی بات ہو، دو دن کی بات ہو، یہ تو عمر بھر کا رونا ہوگیا۔ اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، کھاتے پیتے ہر وقت کی کِل کِل بھلا کون برداشت کرسکتا ہے۔ جب دیکھیے ہماری نحوست کا ذکر، ہمارے نصیبوں پر پھٹکار، ہماری بداعمالیوں کے تذکرے، ہماری بے حیائی اور بے غیرتی کے شکوے، بڑوں کی محبت، بوڑھوں کی دعائیں، بزرگوں کی شفقت تو دنیا سے اٹھ گئی۔ اُن کی نصیحت آمیز کہانیوں، ہمدردانہ سلوک اور محبت بھرے رویے سے تو ہم محروم ہوئے، البتہ کلیجے کو مسوس لینے والی باتیں ہر وقت سنا کرتے ہیں۔ اور کبھی قسمت کی مار چتون پر بل آگیا تو سمجھ لیجئے قیامت آگئی۔ بڑے میاں نے ایک سرے سے قوم کے نوجوانوں کو تاڑ ڈالا۔ ان کی علمیت، ان کی شرافت، ان کا اخلاق ان کی سعادت مندی سب زیر بحث آگئی۔ جب لعنت وملامت کرتے تھک گئے تو پینترا بدل اپنے زمانے میں جا پہنچے۔ بس پھر کیا تھا خلوص ایثار

محبت ہمدردی، آداب اخلاق، شرافت نیک نفسی اور نہ جانے کن کن باتوں کی ایک طویل داستان سنائی گئی۔ اس کے بعد توبہ استغفار، الحفیظ والاماں کے وظیفے ہوئے۔ جب کہیں جا کر طبیعت اعتدال پر آئی۔

ہم لوگ آواگون کے قائل نہیں لیکن پھر بھی اکثر یہ خیال ضرور آتا ہے کہ شاید یہ زندگی ہمارے کسی گناہ کی پاداش ہے۔ بیسویں صدی میں پیدا ہوئے جب قیامت کے آثار نمودار ہونے لگے۔ گویا اپنی موت بھی ساتھ لے کر آئے۔ بچپن تو خیر جیسے کٹا کٹ گیا اور سچ پوچھو تو اس میں بھی ہزار ہا دُکھ جھیلے، سینکڑوں مصیبتوں سے گزرے۔ وہ تو یہ کہو کہ سخت جان ہیں بے غیرتی کا آسرا لے کر جیے جاتے ہیں۔ ورنہ زمانے کے ظالم ہاتھوں نے تو ہمیں مٹانے میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑی تھی۔ دوسری جنگِ عظیم ہوئی۔ اس کے بعد قحط پڑا۔ پھر بیماری پھیلی۔ بٹوارہ ہوا۔ فسادات دیکھے جلاوطن ہوئے سفرِ بہ صورت سقر کی منزلیں طے کیں اور دیارِ غریب میں مہاجر بیکس بن کر رہے مگر پھر بھی ہیں کہ جیے جاتے ہیں۔ صابر اور شاکر ایسے کہ مشیت کے خلاف حرفِ شکایت تک زبان پر لانا حرام سمجھتے ہیں۔ اس پر بھی اگر کوئی ہمیں برا کہتا ہے تو قسم ہے خدا کی ہمارا خون کھولنے لگتا ہے، تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے۔

خدا سلامت رکھے ہمارے بزرگوں کو اور رہتی دنیا تک ان کا سایہ ہمارے سروں پر قائم رہے۔ ہمیں ان سے بے پناہ محبت ہے۔ ہم ان کا ادب و احترام بے حد کرتے ہیں۔ مگر اللہ جانتا ہے وہ ہمیں کچوکے دینے سے باز نہیں آتے۔ ایسی چٹکیاں لیتے ہیں کہ جی جل کے خاک ہوجاتا ہے۔ ذرا کوئی مصیبت آئی اور انھوں نے ہمارے سر ڈالی۔ "میاں قحط کیوں نہ پڑے۔ آج کل کے نوجوانوں کا عمل تو دیکھو، خدا رسول کو تو بالکل ہی بھلا دیا ان فرنگی کے چیلوں نے۔ ہاں صاحب بیسویں صدی ہے، اس میں جو کچھ ہو سو کم ہے؛ جنگ ہو تو اس کی وجہ ہم۔ بیماری پھیلی تو ہماری بداعمالیوں سے، اناج مہنگا ہوا تو ہم ذمہ دار، زلزلے آئے تو ہم پر چار حرف۔ غرض ان کے خیال میں ہمارا وجود آفات و بلیات کا سبب اور ہماری زندگی فتنہ سامانیوں کا باعث ہے۔

بزرگوں کا کہنا ہمیں برا تو لگتا ہے مگر ایمان کی بات یہ ہے کہ وہ بھی جھوٹ نہیں کہتے۔ بے چاروں نے ایسے دن کاہے کو دیکھے ہوں گے۔ پرانی آنکھیں نیا زمانہ اور وہ بھی پُرآشوب۔ شور و شر

ہماہمی اور نفسانفسی دیکھ کر ان کا دل اُلٹ جاتا ہے اور وہ ایک ہذیانی کیفیت کے تحت ہم غریبوں کو نشانہ بنا کر فلک کی کجروی کا ماتم کرتے ہیں۔ وہ یہ ماتم کیے جائیں ہم خوش ہمارا خدا خوش مگر انصاف سے کہیئے کہ اس تناظر میں ہمارا ذکر آنا یا ہمیں بھی لپیٹ لینا کہاں تک صحیح ہے لیجیے آج بات نکلی ہے تو ہمیں بھی دل ہلکا کر لینے دیجئے۔ اپنی دکھ بھری داستان آپ کو سنا لیں تو ذرا آنسو پُنچھ جائیں گے غم غلط ہو جائے گا ہماری اس جانِ حزیں پر کیا کیا گذرتی ہے ہم کیا کھاتے ہیں کیا پیتے ہیں کس طرح جیتے ہیں۔ سب کچھ سنیئے اور پھر انصاف کیجیے کہ یہ بزرگ لوگ حق بہ جانب ہیں یا ہم معصوم اور مظلوم نوجوان۔

پیدا ہوتے ہی ہمیں جو شہد چٹایا گیا وہ خالص چینی اور سکرین کا مرکب تھا بس اسی وقت سے ہماری غذا میں ملاوٹ کا رواج ہو گیا آج ہماری عمر بائیس سال کی ہے اور خدا جھوٹ نہ بلوائے تو منوں دودھ پیا ہوگا، منوں گھی کھایا ہوگا۔ البتہ جس اصلی گھی اور دودھ کی باتیں بزرگ لوگ چٹخارے لے کر سناتے ہیں اس سے نہ ہم آشنا نہ ہماری زبان ہمیشہ گریس کا بنا سو فی صدی خالص گھی کھایا اور مشین سے بنا تازہ دودھ پیا۔ اس پر بھی خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا، جب بھوک لگتی ہے، ہم روٹی کھاتے ہیں۔ یہ روٹی کہاں سے آئی۔ امریکہ نے بھجوائی، یقین کیجئے۔ جس وقت یہ خیال آتا ہے، نوالہ حلق میں پھنسنے لگتا ہے۔ ہماری غیرت، حمیت، خودداری سب کچھ۔ سفید گیہوں کی خشک روٹی میں اُلجھ کر رہ جاتی ہے جسے ہم پانی کے ایک گلاس سے بمشکل نگل جاتے ہیں۔

ہماری سیر تفریح کیا ہے۔ ایک قسم کا فریب ہے جو ہم کھاتے آئے ہیں اور مسلسل کھاتے رہیں گے، نہ کوئی میلا، نہ ٹھیلا، نہ رنگین اور پُر لطف محفلیں، نہ چاندنی رات میں شغل نائو نوش۔ ایک لے دے کر سینما ہے جہاں دو گھڑی بیٹھ کر ہم اپنے مردہ قلب پر زندگی کے چھینٹے دے لیتے ہیں۔ سالہا سال کی دہرائی ہوئی کہانیاں پھر دہراتے ہیں۔ اور کسی حسین تصور کے ساتھ تیرہ و تاریک ہال سے نکل کر زندگی کی ظلمت اور تیرگی میں تیرنے لگتے ہیں۔ ہمارا حلیہ دیکھیے۔ آپ خود کہہ دیں گے کہ ہم پر ضرور کچھ بیتا پڑی ہے۔

منحنی سے لاغر جسم گوشت پوست سے بے نیاز، فاقہ فق چہرے، جن پر مستقل خوف و ہراس طاری، دھنسی ہوئی بے نور آنکھیں جن میں ناامیدی اور مایوسی موجیں مارتی صاف نظر آتی ہے۔

سر بالوں سے بے نیاز مگر اُسترے اور آم کی گٹھلی کی بدولت نہیں جس سے گردن فربہ اور دماغ تازہ ہوتا ہے بلکہ کثرتِ آلام اور شدت فکر کے باعث جھکے ہوئے کمزور کاندھے جن پر ہم نے نہ جانے کتنا بوجھ اٹھا رکھا ہے۔ تنگ اور کبوتر چھاپ سینہ جو تنفس کی آمد و رفت پر بس واجبی سی حرکت کرتا ہے۔ پچی پچی تیلی تیلی ٹانگیں جنھیں ہم امریکن ٹیڈی پینٹ میں چھپا کر مطمئن ہیں ورنہ شاید مور کی طرح انھیں دیکھ کر ہماری آنکھیں بھی ڈبڈبا جائیں غرض ہماری جسامت، ہمارا رنگ روپ ہماری چال ڈھال اور ہماری وضع قطع زبانِ حال سے پکار پکار کے کہتی ہے کہ گھنٹی کا پیرا ہے ہر فرد پر اضمحلال ہے۔ زمانہ مائل بہ زوال ہے۔

اب ذرا ہماری زندگی کی ورق گردانی کیجیے ہمارے روزمرہ کے معمولات پر نظر ڈالیے اور ہماری مصروفیات کی کہانی سنئے: صبح ہوئی اور مرغا بولا: مگر ہم نے کچھ نہیں سنا سورج کی ایک کرن نے زمین کو زرنگار بنا دیا مگر ہم آنکھیں موندے پڑے رہے۔ کئی بار اماں نے جھنجھوڑا لیکن ہم پر اثر نہ ہوا۔ آخر جب گھر میں کھلبلی مچی اور بہن بھائیوں کے اسکول جانے کی تیاری میں تو چل میں آیا کا منظر ہوا تو ہمیں بھی اُٹھتے ہی بن پڑی۔ آپ سوچتے ہوں گے کہ ہم بھی کیسے بے فکر ہیں، خوب گھوڑے بیچ کر سوتے ہیں مگر دیکھیے یہ بدگمانی ہے۔ اور بدگمانی کو ہم سب سے بڑا گناہ سمجھتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ دن بھر کی پے در پے ناکامیوں اور پسپائی سے ایسے نڈھال ہو کر بستر پر لیٹتے ہیں کہ پھر اس سے اُٹھنے کو جی نہیں چاہتا۔ ہمارا کام صرف پڑھنا ہے مگر باپ کی قلیل آمدنی، بڑھتی ہوئی منہگائی اور نہ جانے کن کن مصیبتوں نے اس کام میں جو جو روڑے اٹکائے ہیں وہ کچھ ہمارا ہی دل جانتا ہے۔ معاش کی بھی ہمیں کچھ کچھ فکر ہے۔ اکثر دفاتر ملازمت میں جا کر بیگار کر آتے ہیں۔ سوچ رکھا ہے کہ کلرکی بھی ملی تو انکار نہیں کریں گے۔ بد قسمت ہے کہ کبھی یاوری نہیں کرتی۔

کچھ اُمیدِ کرم میں گذری عمر کچھ اُمید کرم میں گذرے گی

آخر مایوس اور نا امید ہو کر بے غیرتی کا لبادہ اوڑھنا پڑتا ہے۔ اُجلے ورق دم کپڑے پہن کر بازاروں میں نکل جاتے ہیں۔ دو چار آنے کے سگریٹ پیے اور سینہ کو داغنا شروع کیا بخدا ہم سگریٹ اس لیے نہیں پیتے کہ ہمیں عادت ہے یا اس میں کچھ مزا آتا ہے۔ بس یونہی پی لیتے

ہیں۔ کچھ اچھا معلوم ہوتا ہے۔ ہر بات کی کوئی وجہ نہیں ہوتی اور نہ ہی ہونی چاہیے۔ آپ بتائیے۔ اگر ہم سگریٹ نہ پئیں تو کیا پئیں۔ چائے، کافی، پھلوں کا رس، دودھ، لسی، شراب مگر اتنے پیسے ہماری جیب میں کہاں ہوتے ہیں۔ اِن بازاروں میں ہم سب ظاہر دار بیگ، نہ جانے کیوں اِدھر سے اُدھر گھومتے پھرتے ہیں اور اُس وقت تک گھر نہیں لوٹتے جب تک ہماری گھا نسلیٹی ٹانگیں پوری طرح اینٹھ نہیں جاتیں۔ سنا ہے کہ ہمارے اجداد طوائفیں نچاتے تھے۔ مگر ہم میں بھلا یہ استطاعت کہاں ہم تو خود ہی کسی ڈانسنگ اسکول میں جا کر سگریٹ پیتی، انگریزی بولتی عیسائی نام کی ہندوستانی لڑکی کے اشاروں پر ناچ آتے ہیں۔

حضرت آدم کو حوا سے محبت تھی اور اسی محبت نے انسان کو جنت سے نکلوا کر دنیا کی سیر کرائی۔ ہمیں بھی یہ صفت ورثے میں ملی ہے۔ ہمارا بھی جی چاہتا ہے کہ کسی سے محبت کریں۔ شاید اسی کی بدولت دنیا سے نکال کر پھر جنت میں بھیج دیے جائیں۔ آپ حقارت سے نہ دیکھیں تو ایک بات کہیں۔ ہماری محبت کسی ایک جگہ مرکوز نہیں ہوئی۔ ہماری نگاہ تو بس ہمارے ذہن کی طرح پراگندہ اور ہماری طرح آوارہ ہے۔ ہم تو ہر چست لباس والی شوخ اور چنچل لڑکی کو ندیدوں کی طرح گھورتے ہیں۔ لیکن ہماری زندگی بڑی تیز گام ہے وہ انھیں چھوڑ کر رواں دواں آگے بڑھ جاتی ہے۔ ہمارا ماضی حال اور مستقبل سب تاریک ہے۔ اسی لیے جب کوئی جگنو صفت رنگین تتلی ہمارے سامنے آتی ہے تو ہم بیقرار ہو کر رنگ و روشنی کا اکتساب کرنا چاہتے ہیں مگر یہ اکتساب ہمارے مقدر میں کہاں۔

بس جی اب ہمارا کلیجہ پھٹنے لگا۔ آپ بیتی سنانے کی اس سے زیادہ ہم میں تاب نہیں۔ اپنی زندگی کا ایک ایک نقش ہمیں کاٹنے کھاتا ہے ہم مایوس ہیں، ناامید ہیں۔ ہماری راہیں مسدود ہیں مگر پھر بھی ہمیں جینا ہے اور جینے کے لیے ہم فریب کھاتے ہیں اور کھاتے رہیں گے۔ اسی سے ہمیں تسکین ہوتی ہے۔ پچکے ہوئے گالوں کو پچکا کر ہم کسی منچلے بے فکر نوجوان کی طرح انڈیا گیٹ کے قریب ہری ہری گھاس پر چابیوں کا گچھا ہلاتے ہوئے سیٹی بجاتے رہیں گے۔ اگر کسی نے ہمیں روکا تو روک اینڈ رول کی دھن پر گانے بھی لگیں گے۔

"لاؤ روٹی لاؤ دال....."

لیجیے جناب آپ لوگوں نے ہماری روداد تو سن لی۔ اب ذرا اُن کی سنیے جو بڑے اللہ والے، صوفی صافی بن کر ہمارے ہر فعل پر کفر کا فتوی صادر فرماتے ہیں۔ بزرگوں کی جوانی ہم نے اپنی آنکھوں سے تو دیکھی نہیں البتہ جو کچھ سنی سنائی ہے آپ کو بھی سنا دیتے ہیں۔ کالن گناہ گار ہیں عذاب ثواب راوی کے سر دیجیے ہمیں الزام نہ دیجیے گا۔ ہاں اگر ہم جھوٹ بولیں تو ہم جانیں اور ہمارا خدا۔

بچپن بڑی بڑی حویلیوں میں گذرا۔ دروازے پر بندھی گائے بھینس کا دودھ پیا گھر کا بلویا گھی اور مکھن کھایا۔ پھل پھول اور میوہ جات کی کبھی کمی نہ ہوئی۔ ہم عمر دوستوں کے ساتھ کھیل کھیل کر دن بدن فربہ ہوتے گئے۔ پندرہ سال تک تو خیر بچے ہی رہے۔ اس کے بعد جوانی دیوانی نے رانڈ کا سانڈ بنا دیا۔ بڑا سا کلّہ جبڑا۔ گرج دار آواز۔ گینڈے کی سی گردن سڈول اور بھرا بھرا جسم، فراخ اور کشادہ سینہ، چمک دار نشیلی آنکھیں بھرا بھرا یا ہوا سرخ چہرہ۔ جدھر سے گزرے زبانِ حال سے جسم کے ہر ہر عضو نے شباب مست شراب کا اعلان کیا۔ سال دو سال یونہی اینٹھتے پھرے کسی مکتب میں استاد سے تعلیم پائی اور بیس سال کے اندر اندر ایک حسین دوشیزہ کے شوہر نامدار ہو گئے۔

اول اول تو بیوی کے گرد بھونرے کی طرح منڈلاتے رہے۔ بعد میں گھر آئے تو شوہر ہو گئے اور باہر نکلے تو دنیا بھر میں نظر بازی اور حسن نوازی کرتے پھرے۔ جامدانی کی شیروانی اور لٹھے کا چست پاجامہ پہن کر ہمیشہ ہی نوشہ نظر آئے۔ شام ہوئی اور انھوں نے نیم گرم پانی سے غسل کر ایک عمدہ سا دیدہ زیب جوڑا زیب تن کیا قنوج سے منگایا ہوا عطر بغلوں اور سینے پر ملا۔ ایک پھویا بنا کان میں اُڑسا چوں چوں کرتا منڈا پہن، سلمے ستارے کی ٹوپی اوڑھ زمردی دستے کی چھڑی ہاتھوں میں لی۔ ذرا جسم کو تولا۔ بیوی نے جو دھوری بٹوہ اور مراد آبادی ڈبیہ پانوں سے ٹھسا ٹھس بھری لا حاضر کی اور میاں صاحب اِسے لے اٹھلاتے ہوئے چلتے بنے۔

چوک پر پہنچے، ساقنوں سے چہلیں کیں شوق ہوا تو سفید سفید چینی کی پیالیوں میں گھلی چنیا بیگم، کی ایک آدھ چسکی لی۔ آنکھوں میں اور زیادہ کیفیت چھا گئی ورنہ صرف نورنگے حقے کے دو چار کشوں پر اکتفا کیا موتیوں یا پھولوں کا گجرا لے کر ہاتھ میں لپیٹا اور قلفی یا فالودے

والے کی دکان پر جا بیٹھے۔ یہاں پہلے سے بے فکرے خاصی تعداد میں موجود تھے سب نے مل کر فالودے اور ملائی کی برف کا ذائقہ لوٹا۔ یہاں سے اُٹھ کر کوئی کسی یار دوست کے گھر کی طرف چلا۔ کسی نے خانقاہ کا رُخ کیا اور کوئی پرانی چاوڑی کی جانب مڑ گیا۔

اللہ اللہ اس زمانے کی طوائفیں تھیں۔ جنت کی حوروں سے سوا خوب صورت نواب زادیوں سے زیادہ شائستہ اور مصاحبین سے زیادہ بذلہ سنج، حاضر جواب اور نکتہ آفریں، سُر اور تال سے پوری طرح واقف، گانا؛ ان کا روح پرور کیف آگیں۔ نقرئی ورق میں لپٹی گلوریاں پیش ہوئیں۔ وکٹوریہ کی موتی بنے سکے کھنکھائے گئے۔ رات گئے تک یہ شغل چلتا رہا۔ جب آدھی رات بیت گئی تو وہاں سے اُٹھے، گھر آئے اور مخملی بستر پر خواب کیا۔ رات بھر اُنڈے جنتی غزال آنکھیں تنگ دہانہ، سُرخ گلاب صفت لب، لمبی ستواں ناک، کشادہ اور تابناک پیشانی، افشاں بھری مانگ اور نازک دھان پان سا جسم، آنکھوں کے سامنے رقص کرتا رہا۔ تھکن تو خیر تھی ہی کب جو اترتی۔ علی الصبح آنکھ کھولی، موذن کی آواز پر لبیک کہا۔ خدا کی بخشی ہوئی نعمتوں اور عیش و عشرت کی زندگی کا شکر ادا کیا۔ تسبیح پر استغفار پڑھ پڑھ کے رات بھر کے گناہ معاف کرائے اور دن چڑھے اپنے کام میں معروف ہو گئے۔

مومن کو سچ ہے دولتِ دُنیا و دیں نصیب
شب بتکدے میں گذرے ہے دن خانقاہ میں

ذرا عمرِ عزیز کو زوال ہوا اور ان تفریحات سے طبیعت سیر ہوئی تو لگام دوسری سمت موڑ لی۔ طوائفوں کے کوٹھے چھوڑے۔ کسی خانقاہ میں قوالی کی مست کُن دھنوں پر جھومنا شروع کیا۔ آٹھویں دسویں گھر پر بزمِ غزل کی محفل جمائی۔ شعر و شاعری سے شغف ہوا اور ایک نئی زندگی کی تلاش کر لی۔ گرمی کی چاندنی راتوں میں مہتابی پر دو گھڑی دن رہے۔ چھڑکاؤ ہوا۔ اس پر دری بچھا کر اجلی چاندنی کا فرش کیا گیا۔ کوری کوری صراحیاں بھر کیوڑہ ڈال منڈیروں پر چنی گئیں۔ ان پر بانو کے آبخورے ڈھکے گئے۔ دیسی پانوں کی گلوریاں سرخ سرخ صافیوں میں لپیٹ کر کیوڑے اور بید مشک میں بسائی گئیں۔ ڈیڑھ خمے حقوں کے نیچوں میں پانی چھڑک مار لمٹ دیے گئے۔ ادیب لوگوں نے جمع ہو غپ شپ شروع کی۔ جب دیکھا دو چار جھومنے

لگے تو اٹھ اٹھ کر اپنے گھروں کو سدھارے۔

میلے ٹھیلوں اور عرس تماشوں کا تو خیر ذکر ہی کیا۔ آٹھ دن نو میلے۔ سلطان جی کی سترھویں شریف، خواجہ صاحب کی چھڑیاں، مٹکے شاہ کا عرس، میرٹھ کی نوچندی، کلیر شریف کا میلہ، مُلدار خاں کی تر، سب اسی زمانے کی یادگار ہیں۔ اس کے علاوہ ساون کی بوند پڑی اور ان کو ہوا لگی۔ بھر بھر کے رتھیاں اور تلنگے قطب روانہ ہوئے۔ عورتوں نے امریوں میں جھولے ڈالے اور گانا شروع کیا "جھولا کن ڈارو رے امریاں اماں آڑو جامن گھلے دھرے" اور مردوں نے جھرنے کنارے بیٹھ کر لہکنا شروع کیا۔ کبھی شمسی تالاب میں غوطے کھائے اور کبھی چھلتا چھیلس پر آبیٹھے۔ آنکھیں سینکیں کلیجہ ٹھنڈا کیا۔

اب اگر آپ، سننے والوں کے منہ میں زبان اور دل میں ایمان ہے تو خدا لگتی کہیے کہ ان سفید ریش بزرگوں کا ہماری زندگی پر لعنت ملامت کرنا کہاں تک دُرست ہے۔ انھیں چاہیے کہ ہمیں بُرا بھلا کہنے سے پہلے ذرا اپنے گریبان میں بھی جھانک کر دیکھ لیں۔ تعیش اور لذت پرستی کی جو مثال اگلے قائم کر گئے اسے دیکھ دیکھ کر ہماری آنکھیں پھٹتی ہیں۔ زندگی کے جو مزے انھوں نے لیے ہمیں مر کر بھی نصیب نہ ہوں گے البتہ خدا کے ہاں ضرور انصاف ہوگا۔ جب حساب کتاب لیا جائے گا تو ان سے پرسش ہوگی اور ہم پر بخششیں۔ زمردی محل، پری، حوریں، غلماں سب ہم ہی کو عطا کیے جائیں گے۔ ہمارا تو اپنے خدا پر ایمان ہے اور اس پر بھروسہ بھی کہ حشر میں ہماری زندگی کی تشنہ کامی اور حسرتوں کی تلافی ضرور کی جائے گی۔ اللہ بڑا انصاف والا ہے۔ انھوں نے دنیا میں بہشت کے مزے لوٹے ہم مر کے ملہار گا لیں گے ؎

اے حشر جلد کر تہہ و بالا زمین کو
یوں کچھ نہ ہو اُمید تو ہے انقلاب میں

گالیاں

سید ضمیر حسن دہلوی

سُنا ہے کوئی جاٹ ایک دن کسی کام سے کہیں جا رہا تھا۔ راستے میں ایک تیلی ملا۔ تیلی کو مذاق کی سوجھی، جھٹ فقرہ کَس دیا: "جاٹ رے جاٹ تیرے سر پہ کھاٹ" جاٹ کو غصّہ تو بہت آیا پر کچھ سوچ کر خاموش ہوگیا۔ ایک دن جاٹ نے دیکھا کہ تیلی بھی گھبرایا ہوا اس کے آگے آگے چلا جاتا ہے۔ بس انتقام کی آگ بھی کہ بھڑک اٹھی۔ جاٹ نے کہا: "تیلی رے تیلی تیرے سر پہ کولھو" تیلی نے مسکرا کے جواب دیا: "بھائی یہ تو کچھ جچی نہیں" جاٹ نے کہا: "جچے یا نہ جچے تو بوجھوں تو مرے گا" کچھ یہی بات گالیوں کی ہے۔ کبھی کبھی اگر کوئی موزوں طبیعت موقع محل کی مناسبت سے لطیف شیریں اور سُبک سی گالی دیتا ہے تو سُننے والا بے اختیار پھڑک اٹھتا ہے۔ دل سے واہ بھی نکلتی ہے اور آہ بھی۔ آہ اس وقت جب یہ نزول ہماری ذات پر ہوا ہو اور واہ اس وقت جب ہم محض تماشائی ہوں۔ عام مشاہدہ تو یہ ہے کہ گالی کا ترنم، موسیقی نشتریت اور دلپذیری کچھ اسی وقت واضح ہوتی ہے۔ جب تختہ مشق کوئی دوسرا ہو۔ البتہ دنیا سراسر ایسے لوگوں سے بھی خالی نہیں جو گالیاں کھا کے بے مزا ہونے کے بجائے مسکرا کے فرماتے

ہیں۔ ع

اللہ کرے زورِ سخن اور زیادہ

گالی کوئی حقیر ذلیل اور بازاری شے نہیں ہے۔ اس کا درجہ اتنا ہی بلند ہے جتنا کسی دلنواز نغمے یا دل سوز لینے والے شعر کا۔ گالیاں عظیم شعراء کے وہ جاوداں ارشادات ہیں جو ایک زمانے سے گنگنائے جا رہے ہیں اور ابھی تک اُن کے نغمہ و آہنگ میں ذرہ برابر کمی نہیں آئی ہے۔ صبح سے شام تک دن میں سینکڑوں بار ہم ایک ہی گالی مختلف افراد کی زبانی سنتے ہیں اور ہر بار ایک نیا کیف، ایک نئی لذّت اس میں پاتے ہیں۔ میں گالیوں کو ادبِ لطیف کا وہ گرانقدر سرمایہ جانتا ہوں جو لازوال ہے جس کی مقبولیت کلاسکیت اور دلکشی نہ کسی زمانے میں کم ہوئی ہے اور نہ خدا ناکردہ آئندہ ہوگی۔ میر کے اشعار میں نشتریت سہی، مرزا کے شعر میں حقیقت اور واقعیت سہی، حسرت کے کلام میں ترنم اور تعشق سہی لیکن ذرا انصاف سے کہیے کیا وہ بات بھی ہے جو ان نامعلوم حضرات کی برجستہ اور سہل ممتنع گالیوں میں کسی اچھے شعر کو دس بار پڑھ لیجیے جب آپ گیارہویں بار اسے پڑھیں گے تو بات کچھ بے اثر سی معلوم ہوگی لیکن کسی اچھی گالی پر سال دو سال ریاض کیجیے اور توفیق ایزدی سے اس قابل ہوجایئے کہ الفاظ اپنے صحیح مخرج سے ادا ہوں۔ پھر دیکھیے اگر آپ اسے تکیہ کلام بھی بنالیں گے تو نہ صرف آپ کو بلکہ دوسروں کو بھی اس کی تکرار کا احساس تک نہ ہوگا۔

ع جس طرح کا بھی کسی میں ہو کمال اچھا ہے

کہتے ہیں مرد کی موت نامرد کے ہاتھوں اور فن کی بے قدری اناڑی کے ہاتھوں ہوتی ہے جس طرح مذہب کو نقصان پہنچانے میں مخالفین سے زیادہ خود اس کے ماننے والوں کا ہاتھ رہا ہے۔ اسی طرح گالیوں کی بے توقیری کے ذمّے دار بھی وہی لوگ ہیں جو اس فن میں خاطر خواہ محنت اور جگر کاوی کئے بغیر سخن سرائی کر بیٹھے اور دانستہ اس کی آبرو کو بٹہ لگایا۔ ع

اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

میں قسم نہیں کھاتا لیکن یہ بات قسم کھا کے کہنے میں بھی مجھے باک نہیں کہ اگر دشنام طرازی محض اعلیٰ ظرف اور پختہ طبیعت حضرات کا شیوہ رہتا تو آج یہ ادارہ ادب کے برادارے پر

غالب آتا۔ اسے گالی کی بدنصیبی سمجھئے یا میری اور اپنی شومئ قسمت کہ ہر کس وناکس، للو پنجو ایرے غیرے، نتھو خیرے نے گالی کو اپنے باپ کی میراث سمجھ کر غلط سلط جا و بے جا استعمال کیا ہے۔ کثرت ہر چیز کی بری ہوتی ہے۔ گالیاں بھی کثرت استعمال سے اپنی آب وتاب، چمک دمک، اور عزت وحرمت کھو بیٹھیں سہ

ے کہ بدنام کند اہل خرد را غلط است
بلکہ ے می شود از صحبت ناداں بدنام

غالب نے اپنے ایک دوست کو لکھا تھا: حضرت میں شکوے کا برا نہیں مانتا مگر شکوے کے فن کو میرے سوا کوئی نہیں جانتا۔ یہی بات میں گالی کے لیے کہنا چاہتا ہوں۔ شکوے کا کمال یہ ہے کہ جس شخص سے کیا جائے وہ لاجواب ہو جائے۔ گالی کا کمال یہ ہے کہ جسے پیش کی جائے اس پر سحر ہو جائے حیرت سے منہ تکے اور بے ساختہ کہہ اُٹھے۔

ع ، اے ہم نفس نزاکتِ آواز دیکھنا

میں جب دہلی کی بربادیوں کا رونا روتا ہوں تو یہ بات بھی ضرور کہتا ہوں کہ ہائے ہائے اب تو وہ لوگ بھی دِلّی سے مٹتے جا رہے ہیں جن کی گالیاں کھا کے انسان سر دھنتا پھرے۔ میں دروغ گو نہیں، مبالغہ پری خو نہیں۔ میں نے ان لوگوں کی صحبت اٹھائی ہے جو آپ کو بے نقط سنائیں گے اور آپ وجد کے عالم میں آنکھیں پھاڑے منہ کھولے انھیں تکے جائیں گے۔ گرانباری کیسی، خدا کی قسم یہ بھی احساس نہ ہوگا کہ انھوں نے جو کچھ کہا سب آپ کے پلے سے بندھ گیا۔ اللہ کا فضل ہے ایسے کچھ لوگ آج بھی حیات ہیں۔ خدا انھیں ہمیشہ زندہ رکھے۔ مگر میں نام یوں نہیں لیتا کہ ناحق پردہ فاش ہوگا۔ لوگ ان کی سحر بیانی پر تو کیا توجہ کریں گے البتہ اپنی عقل ناقص کی بدولت توبہ، توبہ، اسے اخلاقی کمزوری پر محمول کر لیں گے۔ پھر بھلا میں کس کس کا حلق پکڑتا پھروں گا۔

ع ، عیب ہیں عیب ہنر مند ہنر دیکھتے ہیں

میں خود کو دہلی والا تو نہیں کہتا کیوں کہ جب میں پیدا ہوا تو دہلی مر چکی تھی۔ البتہ دِلّی والوں کی جوتیاں میں نے ضرور سیدھی کی ہیں اور یہ سعادت غالباً اسی سعادت مندی کی بدولت ہے

کہ چند مخصوص گالیوں کی ادائیگی پر میں بھی کمال رکھتا ہوں۔ کسی ماہر گلوکار کے سامنے کوئی نغمہ الاپا جائے اور سُر تال پر چنداں توجہ نہ ہو تو فن کار اسے سننے پر بھی آمادہ نہ ہوگا اور اگر آپ زبردستی سنائیں گے تو ناحق اس کی طبیعت مکدر ہوگی۔ بالکل یہی حال میرا بھی اس وقت ہوتا ہے جب میں اپنی پسندیدہ گالی کسی نااہل کی زبان پر رقصاں دیکھتا ہوں۔ آپ کہیں گے کہ گالی بھی کیا موسیقی کی دھن ہے کہ اس کے لیے ورد اور مشق تک ضروری ہے تو حضرت میں اس سلسلے میں آپ کے گوش گزار کر دینا چاہتا ہوں کہ اول تو گالی دینا اتنا آسان نہیں جتنا آپ نے سمجھ لیا ہے اور اگر ہے بھی تو صرف اہل زبان کے جن کی ہر بات میں لہجے کی چاشنی گھل جاتی ہے۔ لیجیے بات پھر اس مقام پر آ گئی جہاں پہنچ کر میں اپنے تئیں گومگو کی کشمکش میں اُلجھا لیتا ہوں اب کچھ کہوں گا تو خود ستائی ہوگی اور اگر خاموش رہتا ہوں تو حق گوئی پر دھبا آتا ہے۔

اسی لیے میں اُن تمام مواقع سے کتراتا ہوں جہاں دہلی کا ذکر نکلنے کا امکان ہو۔ خیر اب بات نکلی ہے تو کہنا ہی پڑے گا۔ سر جائے یا رہے کہ دِلّی والوں کی زبان کا لوچ شیرینی اور سبک روی کسی کو کب میسر آ سکتی ہے۔ ایک بات جو دِلّی والے کہیں باہر والا کہہ تو سکتا ہے پر اس میں اثر کہاں سے لائے گا۔ ہم نے سات پشتوں کا ورثہ پایا ہے جب یہ فن زبان میں آیا ہے۔

خیر یہ تو ایک جملۂ معترضہ تھا اور محل اس کا یہ ہے کہ ایک روز شام کے وقت سر بازار چہل قدمی کو چلا جاتا تھا کہ ناگاہ کانوں میں ایسی آوازیں آئیں جیسے کہیں لڑائی ہوتی ہو۔ میں نے جو مڑ کے دیکھا تو ایک صاحب جو غیر دیار کے معلوم ہوتے تھے کسی غریب کو مادر زاد مغلظات سنا رہے تھے۔ گالیاں تو البتہ وہی تھیں جن کی میری زبان ہمیشہ مصروف نغمہ سرائی رہی ہے مگر ادائیگی اس قدر مذموم تھی کہ اچھی خاصی گالی، دس بیس کے مجمع پر بھاری پڑنے والی، ان میاں صاحب کی رال کے ساتھ چپک کے رہ جاتی۔ صاحبِ گفتار کی وطنیت کا اندازہ مجھے اس وجہ سے ہو گیا کہ ایک تو وہ اپنی وضع قطع سے ہی باہر والے معلوم ہوتے تھے دوسرے ان کی مادری بولی بھی اس پر صاد کرتی تھی۔ اللہ مجھے معاف کرے ہنسی کا مقام نہیں۔ جائے ماتم وعبرت ہے۔ جب میں کسی ایسے شخص کے منہ سے گالیاں سنتا ہوں تو یوں لگتا ہے جیسے لکھنوی خواجہ سرا میدان جنگ میں بنیٹی گھماتا ہو یا جیسے کریلا بھانڈ نے پانی پت کے

معرکے کی نقل اتاری۔ باہر والے میری یہ بات سن کر کہہ سکتے ہیں، کہ میاں گالیاں اللہ دہلی والوں ہی کو مبارک کرے، ہم دیں نہ جانیں ہیں۔ میں اس کا لمبا چوڑا جواب تو دیتا نہیں بس اتنا کہوں گا کہ ساتھ ساتھ اللہ آپ کو سننے کی توفیق اور تحمل بھی عطا کرے، رہا آپ کا پیروی کرنا تو اس میں وہی ندامت ہوگی جو کوّے کو ہنس کی چال چل کر ہوتی ہے

ع   عیب کرنے کو ہنر درکار ہے

خدا نے انگور پیدا کئے۔ بدخصلتوں نے انھیں سڑا کر شراب بنالیا خیر یہاں تک بھی کچھ برا نہ تھا۔ لیکن ستم بالائے ستم بدطینتوں نے اسے پی کر وہ طوفان بدتمیزی بپا کئے کہ الامان و الحفیظ۔ اب شراب کے نام کے ساتھ کم ظرفوں کی نازیبا حرکتیں اس طرح وابستہ ہیں جیسے گوشت سے ناخن چسپاں ہوتا ہے۔ قدرت نے لوہا دیا کہ انسان ہتھیار بنا کر خود کو جنگلی جانوروں اور درندوں سے محفوظ رکھ سکے۔ انسان نے ہتھیار بنائے اور ساتھ ہی کمزوروں اور ناتوانوں کو تختۂ مشق بھی بنالیا۔ عورتوں، بچوں، بوڑھوں اور اپاہجوں کے سر کاٹے کھوپڑیوں کے مینار بنائے اور اپنے نفس بد کو سامان عیش فراہم کیا۔ اپنی درندگی کو تسکین پہنچائی۔ گالیاں بھی پختہ مشق اور پختہ طبیعت سخن سنجوں کی الہامی کیفیات کا نتیجہ تھیں لیکن جب نااہل بوالہوس کے ہاتھوں پڑیں تو ان کی وہ حالت خراب ہوئی کہ آج کوئی صورت دیکھنے کا روادار نہیں۔

غالب کو ان کی بزرگی میں کسی ناسمجھ نے ماں کی گالی دے دی۔ مرزا سُن کر تلملا اٹھے۔ اس لیے نہیں کہ انھیں گالی کیوں دی گئی بلکہ اس لیے کہ اس نامراد نابکار کو گالی دینے کا بھی سلیقہ نہ تھا۔ مرزا نے اسے مخاطب کیا اور سمجھایا کہ میاں اگر گالی دینے کا شوق ہے تو کم از کم اس فن کے آداب بھی سیکھو صاحب! بچے کو ماں کی، جوان کو بیوی یا بہن کی اور بوڑھوں کو بیٹی کی گالی دی جاتی ہے۔

ع   سلیقہ شرط ہے ہر ایک امر میں

گالی کی ادبیت، عظمت اور حرمت کے آپ قائل ہوں یا نہ ہوں لیکن گالی کی افادیت سے آپ کس طرح انکار کرسکتے ہیں۔ گالی تو بے سہاروں کا سہارا ہے۔ گالی محمود و ایاز کو ایک سطح پر لے آتی ہے گالی دل کی بھڑاس نکالنے کا واحد ذریعہ ہے۔ طاقت اور دولت کا اگر کوئی منہ توڑ

جواب ہے تو صرف ایک عمدہ سی گالی۔ تشنہ جذبات اور ناکام حسرتوں کی اگر تلافی ممکن ہے تو گالیوں کی بدولت۔ غرض گالیاں بے زروں کو زردار، بے طاقتوں کو طاقتور، اور نہتوں کو مسلح کردیتی ہے۔ اگر آپ انسان کے سماجی حالات اور ارتقار کا بغور مطالعہ کریں تو آپ پر بھی یہ انکشاف ہوسکتا ہے کہ گالی نے ہمیشہ دلدہی، دلداری اور پشت پناہی کی ہے۔ کسی مغرور پہلوان نے کسی نحیف پر ہاتھ اٹھایا ہے تو اس کی تلافی گالی نے کی ہے۔ کسی دولت مند نے کسی غریب کو جیل بھجوایا ہے تو گالی ہی نے اس کا بھی بدلہ چکایا ہے۔ ظالم بادشاہ نے کسی بے گناہ معصوم کو سزائے سخت دی ہے تو گالی ہی اس معصوم کی دل بستگی کو آئی ہے۔

بیوی نے لونڈی کو چار چوٹ کی مار دی۔ لونڈی غریب نے اس وقت تو منہ سے ایک حرف نہ نکالا البتہ اپنی جلیسوں، اور ہم جنسوں میں بیٹھ کر بیگم کی سات پشتوں کو پناہے ہوتے سوتوں کو گالیاں پہنچائی ہیں۔ ذرا تعصب کی ڈگر سے ہٹ کر سوچئے کہ گالی کے انسانیت اور انسانی معاشرے پر کیا کیا احسانات ہیں۔ میں تو کہتا ہوں اگر خدانخواستہ گالی جیسی چیز سے نوع بشر محروم رہ جاتی تو شاید ہر سینہ فگار اور ہر دل پارہ پارہ ہوتا۔ انسان گھُٹ گھُٹ کر گنجۂ الم بن جاتا اور نہ جانے کتنے بے چارے دق اور دیوانگی میں مبتلا ہوکر جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے۔

گالی کے کچھ اور فیوض و برکات بھی ہیں، گالی انسان میں عملی قوت چستی اور تحریک پیدا کرتی ہے۔ مزدوروں کو دیکھئے دس بیس ہوائی گالیاں دیں، "ہئی شا" کا نعرہ لگایا اور مشکل سے مشکل کام آسان کرلیا ہماری روزمرہ کی زندگی میں ان تجربوں کی کمی نہیں۔ نوکر ست اہل ہو۔ کام کاج میں آل کسی برتتا ہو۔ ذرا گونجتی آواز میں ایک دو پھڑکتی ہوئی سنا دیجئے۔ گھنٹوں کا کام منٹوں میں ہوجائے گا۔ ہلدی لگے نہ پھٹکری اور رنگ چوکھا آئے۔ گھر کی نوکرانیوں کو عادت ہوتی ہے کہ چپ سادھے۔ کانوں میں روئی ٹھونسے آرام سے بیٹھی رہتی ہیں۔ آپ حکم دئے جایئے مجال ہے کہ ان کے کان پر جوں بھی رینگے، ایک چپ سو کو ہرائے۔ اب یا تو اپنا خون جلائیے۔ بات بات پر غصہ کھائیے یا پھر زبان کو دشنام آشنا کیجیے۔ میں سمجھتا ہوں جلنے اور کڑھنے سے بہتر یہی ہے کہ آگے پیچھے گالی لگا کے اپنی بات میں وزن پیدا کردیجے۔ پھر دیکھئے ایک بولی تین کام۔ اور لطف یہ کہ ہاتھوں ہاتھ ادھر آپ کے منہ سے بات

نکلی اور اُدھر پوری ہوئی۔

پرانے زمانے کی بیگمیں غالباً اس نکتہ کو خوب سمجھتی تھیں۔ جب کوئی حکم دیا تو اس کے ساتھ دو چار گالیاں بھی چپکادیں۔ "اری او نصیبن کمبخت مُردار، خصموں کھائی، حرّافہ تجھے آئے موت اللہ کرے کیا چبوترہ خانم بنی بیٹھی ہے۔ دیکھتی نہیں میرے بچے کا دم لبوں پہ آ گیا ہے۔ جا دوڑ کے حکیم صاحب کو تو بلا لا اور ہاں دیکھیو ایسے آئیو جیسے یہیں کھڑی تھی۔ ذرا دیر کی اور میرے بچے کو کچھ ہو گیا تو تیری بوٹیاں کرکے چیل کوؤں کو دوں گی۔" اتنا سننا تھا کہ نصیبن یوں گئی جیسے کمان سے تیر۔ آندھی طوفان میں حکیم صاحب کے مطب پہنچی اور آن کی آن میں انھیں لا موجود کیا۔ میں گالیوں کے مخالفین سے پوچھتا ہوں کیا اس سے بہتر بھی کوئی صورت ایسی ہو سکتی تھی جو نصیبن کے تھوا سے جسم میں ایٹمی توانائی پیدا کر دیتی اور جس کی بدولت طبّی امداد کا یوں پلک جھپکتے انتظام ہو جاتا۔ یہ تو ادنیٰ سا کرشمہ ان گالیوں کا ہے جو صحبتِ نسواں میں رہتے اپنا اصل رنگ روپ کھو چکی ہیں۔ اب ذرا تصوّر کیجیے ان بھاری بھرکم اور باوقار گالیوں کا جو ایک مردِ بچے کے منہ سے نکلتی ہیں اور جن کے اثر سے سننے والے کے اعصاب کا ایک ایک تار جھنجھنا اٹھتا ہے جو مرد اور عورت کے باہمی تعلقات کو بے نقاب کر دیتی ہیں جن کی لذّت سے انسانی ذہن خوب آشنا ہے۔

خدا جھوٹ نہ بلوائے میں نے ایسے بیسیوں جھگڑے دیکھے ہیں جن میں سوکھے سہمے آدمی اپنی زبان زوریوں کی بدولت بڑے بڑے لحیم شحیم لوگوں پر غالب آئے ہیں، ان کی گرجدار آوازسے غنیم کا زہرہ آب ہوتا ہے۔ جب وہ بنکارتے ہیں تو اچھے اچھے اُن کے آگے نہیں ٹکتے۔ ان کی فلک شگاف گالیاں ساری فضا کو اسی طرح مکدّر کر دیتی ہیں جیسے ہوائی فوج کسی بستی پر دو چار بم گرا دے۔ ان کا جوش و خروش دیکھ کر دشمنوں کے کلیجے دہل جاتے ہیں۔ کہتے ہیں جو گرجتے ہیں وہ برستے نہیں لیکن گرج سن کے ڈٹے رہنا بھی تو ہر ایک کا کام نہیں۔

ع

دھمکی میں مر گیا جو نہ بابِ نبرد تھا

گالیوں کا ہمارے اعصاب پر ایک غیر معمولی اثر ہوتا ہے۔ روح کے انقباض اور انبساط میں

گالیوں کے تاثر کو بڑا دخل ہے جس طرح جسم سے فاسد مادّے کا اخراج لازمی ہے اسی طرح صحتِ روحانی کے لیے فاسد خیالات کا وقتاً فوقتاً نکالا جانا بھی انتہائی ضروری ہے۔ سُنا ہے۔ اگلے لوگ گالیوں ہی کو اس مقصد کے حصول کا ذریعہ بناتے تھے۔ دروغ برگردن راوی۔ البتہ ہجویات اور فحشیات کی موجودگی اس بات کو پایۂ ثبوت تک پہنچاتی ہے۔

کسی کا مقولہ ہے کہ بیوی بغیر سالی کے، اور جھگڑا بغیر گالی کے بے مزا سا رہتا ہے۔ اس قول کے پہلے حصّے سے تو مجھے سروکار نہیں یہ تو وہی لوگ بتا سکیں گے جو خوش قسمتی سے شادی شدہ ہیں۔ البتہ دوسرے حصّے سے مجھے بھی بال برابر اختلاف نہیں ہے۔ آپ نے سنا ہوگا کہ مشاق پہ سالار اپنی فوج میں جوانمردی اور بہادری کے جوہر ابھارنے کے لیے دھواں دھار تقریریں کرتے تھے۔ اپنے سپاہیوں میں جوش و خروش پیدا کرنے کے لیے بزرگوں کی سر فروشی، شجاعت اور جانبازی کے افسانے سناتے تھے رجز اور رزمیہ اشعار پڑھتے تھے بالکل اسی طرح مشاق مفسد اور شرپسند اپنے قویٰ کو یکجا و مستعد کرنے کے لیے گالیوں کا سہارا لیتے ہیں۔ گالیوں سے وہ اپنی سوئی ہوئی قوتوں کو بیدار کرکے برسرِ پیکار لاتے ہیں اور اس طرح کامیابی و کامرانی ہی ان کا مقدر ہو جاتی ہے۔ ع

توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے

پُرانے وقتوں کی شادیوں میں حاجی شہدے "اور بی ڈومنیوں" کا ذکر تو آپ نے سُنا ہی ہوگا۔ یہ شہدے مردانے میں گالیاں دے کر بیلیں طلب کرتے تھے اور ڈومنیاں عورتوں میں فحش نقلیں اور چٹپٹی گالیاں سناتی تھیں۔ بڑھیاں بڈھے، اُدھیڑ جوان سب ہی اُن سے برابر کے لطف اندوز ہوتے تھے۔ ڈومنیوں نے نقل آتاری، سخن سنائے شہدوں نے مَن مَن بھر کی گالیاں دیں اور ساری محفل پر ایک انبساطی کیفیت طاری ہوگئی۔ سرور اور شادمانی کی لہر سی دوڑ گئی۔ کسی نے بیلیں دیں کسی نے محض واہ واہ اور داد پر ٹال دیا۔ بڈھے بڑھیاں جن کی یہ حالت ہے کہ

مضمحل ہو گئے قویٰ غالب

اب عناصر میں اعتدال کہاں

گالیاں سنتے جاتے ہیں اور تخیل میں جوانی سامنے کھڑی پاتے ہیں۔ گو اب کسی قابل نہیں پران شباب اور گالیوں کے طفیل وہ بھی خیالی طوطی مینا اڑا لیتے ہیں اور تھوڑی دیر کے لیے عہد شباب میں لوٹ جاتے ہیں اب بتائیے یہ مسرت یہ سرور یہ لذت کیا کسی اور شے میں بھی پائی جاتی ہے پھر بھلا انسان اس سے پرہیز کیوں کرے۔ دشنام بے نیام کی بدولت اگر آدمی کو ایک لمحۂ خوشگوار مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے۔

کہتے ہیں عقل مندوں کو اشارہ کافی ہوتا ہے۔ گالیوں کی اہمیت مقصدیت اور ادبیت کا اگر آپ کو پہلے احساس نہ ہوگا تو اب ضرور ہوگیا۔ البتہ اگر اب بھی کسی کج فہم کو اختلاف ہے تو اس کے لیے مجھے دوسرا راستہ اختیار کرنا پڑے گا۔ جادو وہ جو سر چڑھ کے بولے گالیوں کی یہ مدح و ستائش کچھ بے بنیاد نہیں ہے۔ مخالف سامنے آئے ابھی دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہوا جاتا ہے۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے۔

جانوروں کی مذہب پرستی

خواجہ حسن ثانی نظامی

مرغی نے پانی کا گھونٹ بھرا اور منہ کو ذرا سا اونچا کر کے اسے حلق سے نیچے اتارا۔ حضرت امیر خسرو پکار اٹھے۔ دیکھو! مرغی آسمان کی طرف منہ کر کے پانی کی نعمت پر خدا کا شکر ادا کر رہی ہے بیسویں صدی آئی تو اس بات پر کسی نے ناک بھوں چڑھائی اور کہا کہ یہ تو نری خوش اعتقادی ہے۔ شاعری ہے۔ تاہم بیسویں صدی والوں کو اتنا تو ماننا ہی پڑا کہ مرغی نہ سہی مرغا ضرور اپنی بانگ سے ملاجی کو روز صبح جگاتا ہے۔ اور وہ اس کے سُر میں سُر ملا کر اپنی برادری کو نماز کے لیے پکارتے ہیں۔

لغوی اور اصطلاحی معنی چھوڑیئے۔ سامنے کی عام بات دیکھئے کہ آدمی جس چیز کو مذہب اور دھرم کہتا ہے وہ کیسی رنگا رنگ چیز ہے۔ خدا کو مانیے تو مذہب! نہ مانیے تو مذہب! پوجا پاٹھ تک محدود رکھئے تو مذہب! کھانے چھینکنے کو بھی اس کے دائرے میں لائیے تو مذہب! ایک خدا کو مانیے تو مذہب۔ کئی کئی پر ایمان رکھیے تو مذہب! لڑنا مذہب! صلح کرنا مذہب! کپڑے پہننا مذہب! ننگے رہنا مذہب! جنسی ذوق مذہب! جنس بیزاری مذہب! ایک بیوی

مذہب! چار بیویاں مذہب! جانور کاٹیے تو مذہب جانور پوجیے تو مذہب۔ گھر گرہستی مذہب! آدم بیزاری مذہب! ایک چیز ہو تو گنوائی جائیے۔ یہاں تو ہر چیز مذہب ہے۔ سوتے جاگتے اٹھتے بیٹھتے۔ اوپر نیچے دائیں بائیں۔ جدھر دیکھیے مذہب ہی مذہب ہے اور مذہب کے سوا کچھ بھی نہیں ہے!

اللہ بھلا کرے ہمارے دہریے بھائیوں کا! انھوں نے اس دلدل سے نکلنے کی کوشش کی مگر نکلتے نکلتے پھر پھنس گئے۔ جہاں ان کا کوئی ساتھی بیمار پڑا۔ ہم جولیوں نے نیک تمناؤں کے پیغام بھیجنے شروع کیے کہ تم جلدی اچھے ہو جاؤ! اور مذہب نے کواڑ کی اوٹ سے جھانک کر کہا۔ بندہ حاضر ہے! بات تو جب تھی کہ بیمار کی دوا دارو کرتے۔ ڈاکٹر حکیم کی کنڈی کھٹکھٹاتے! یہ نیک تمنا کیا بلا ہے؟ یہ بھی تو مذہب ہی ہے!

ایک صاحب تندرست کرے، قدرت کرے کا وظیفہ پڑھتے رہتے ہیں تو یہ بھی مذہب ہی ہے۔ اگر وہ نہیں مانتے تو یہ ان کی ہٹ دھرمی ہے اور ہٹ دھرمی خود ایک مذہب ہے!

مذہب کے دائرے کی وسعت کا جب یہ عالم ہے تو بیچارے جانور اس سے بچ کر کہاں جا سکتے تھے۔ وہ بھی گرفتار ہوئے اور خوب گرفتار ہوئے۔ زبان اور بولی کی دشواری نہ ہوتی تو میں کسی غزال ہندی سے پوچھ ہی لیتا کہ پیاری پڑوسن! تمہاری اصلاح اور رہنمائی کے لیے کب کب اور کون کون آیا؟ لیکن قرینہ کہتا ہے کہ جانوروں کو رشی منیوں اور پیغمبروں کی ضرورت کبھی پڑی نہیں۔ کیونکہ عام معاملوں میں وہ اپنے پڑوسی انسانوں سے کتنے ہی مشابہ کیوں نہ ہوں۔ اس لحاظ سے بالکل الگ ہیں کہ ان میں آدمیوں کا سا تلوّن نہیں پایا جاتا کہ ہر وقت تبدیلی اور انقلاب کے درپے رہیں۔ انسانوں میں تو ہر چیز کو بدل ڈالنے کا ایسا ہوکا ہے کہ اچھی سے اچھی تعلیمات اس کا شکار ہو کر رہ جاتی ہے جس کو دیکھیے ایک نئی عمارت بنانے کے درپے ہے جانور تو بس ایک بات ہی جانتے ہیں کہ بندہ کس کا؟ کہ بندہ تیرا! قدرت نے جو ڈگر جس کے لیے مقرر کر دی اور جس طریقے کا جس گروہ کو پابند کر دیا وہ آنکھ میچ اس پر چلنے سے دھیان رکھتا ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ سبزی خوروں نے ذرا اودھم مچایا تو شیر صاحبان ان کی کثرت سے مرغوب ہو کر گھاس پات پر اتر آئے اور گوشت

کھانا چھوڑ دیا یا ہرنوں کے بچے شیر بھیڑیوں کے فیشن سے متاثر ہو کر ہڈی بوٹی سے شوق کرنے لگے۔ یا کاکڑ BARKING DEER بیچارا ایک بیوی پر قناعت کرنے کی بجائے سانبھر کی طرح مسلمانوں کی ریس کرنے لگا اور چار چار بیویاں جائز سمجھیں۔

میرا خیال ہے کہ جانوروں کے مذہب کی بات آئی ہے۔ تو پہلے ان کی سب سے سمجھ دار ذات ہاتھی کے مذہب کا مشاہدہ کرنا چاہیے چنانچہ کبھی ان کی سونڈ سے مٹی بدن پر اڑاتے دیکھ کر تیمم کا گمان گزرتا ہے کبھی پانی کی پچکاریاں ہاتھ پاؤں اور منہ پر چھوٹتی نظر آتی ہیں تو خیال ہوتا ہے کہ یہ کہیں وضو تو نہیں ہے اور کسی گہرے ندی نالے میں ہاتھی کو دیکھتے ہیں تو سوچنا پڑتا ہے کہ ہو نہ ہو یہ پورا شرعی غسل ہے!

ہاتھی انسانوں کی طرح مل جل کر رہنے کے عادی ہیں۔ کھانا پینا روزہ نماز سب اجتماعی حیثیت سے ہوتا ہے۔ لیکن ایک عجیب رسم ان کے ہاں یہ ہے کہ طلاق خلع فارغ خطی میاں بیوی کے قول فعل سے نہیں ہوتی۔ بلکہ ادھر میاں پر بڑھاپا آیا ادھر نکاح ٹوٹا۔ بوڑھے نر ہاتھی کو برادری باہر کرنے میں دیر نہیں لگائی جاتی۔ سارا خاندان مل کر اسے گویا پردے بٹھا دیتا ہے۔ بڑھاپے میں وہ بوڑھی یا جوان کسی بھی ہتھنی کو اچھی یا بری نظر سے نہیں دیکھ سکتا جنگل کے کسی ویران کونے میں (ویران سے مراد ایسا کونا جہاں اور ہاتھی نہ ہوں!)، یہ برادری باہر کیا ہوا ہاتھی اپنا سارا وقت قیام و قعود اور گیان دھیان میں بتاتا ہے ــ وہ پہلا آدمی جس نے بستی چھوڑ جنگل پہاڑ کا راستہ لیا، خدا معلوم اس غریب پر بھی کیا بپتا پڑی ہوگی جو یوں ہاتھی آسا گیان دھیان اور تپسیا پر مجبور ہوا!

شیر جنگل کا بدمذہب جانور ہے لیکن سب بدمذہبوں کی طرح شیر تیر دوست ہوتا ہے ایک شیر کو دوسرے شیر سے تکلیف کم ہی پہنچتی ہے۔ دوسری نسل کے جانوروں کو شیر ضرور چیرتا پھاڑتا اور کھاتا ہے۔ لیکن پیٹ بھرنے کی حد تک۔ آدمی کی طرح شیر کسی اور شیر سے اللہ واسطے کا بیر نہیں رکھتا۔ خواہ مخواہ کے جہاد کا سودا بھی اس کے دماغ میں نہیں ہے۔ حالانکہ جہاد کے تھیار اور بڑا بھائی بن جانے کی علمی صلاحیت قدرت نے شیر کو دی ہے کسی اور کو نہیں دی۔ لیکن شیر نے اپنی قلم رو میں نہ تو کبھی کوئی مذہبی یا غیر مذہبی ٹیکس عاید کیا نہ کبھی

طرح کے فارم کبھی بھروائے اور پیٹ بھرنے کے لیے بھی جو تھوڑا سا تشدد جائز رکھا اس
میں بڑے اسپورٹنگ انداز میں کہہ دیا کہ تم بچو! بھاگو! ہم پکڑیں گے اور جس کو پکڑ لیں گے
اس کو اپنے انسان پڑوسیوں کی طرح کبھی نہیں چھوڑیں گے فوراً ہڑپ کر جائیں گے۔

شیر بہت سے معاملوں میں مادر پدر آزاد ہے۔ شادی بیاہ کو جی چاہتا ہے تو شیر
شیرنی کسی قاضی پنڈت رجسٹرار یا برادری کے رواج کے چکر میں نہیں پڑتے کہ چوڑیاں
پہنائیں اور گھر میں ڈال لیا۔ بلکہ دونوں فریق جنگل جنگل وادی وادی ہانک لگائے
پھرتے ہیں کہ:

کون ہوتا ہے حریف مئے مرد افگن عشق!

اگر کوئی حریف مل گیا۔ اور مل ہی جاتا ہے۔ کیونکہ راگ رنگ کی اہر۔ دنیا میں اچھی
صورت ہی نہیں۔ پیاری آواز بھی غضب ڈھاتی ہے

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد
بسا کیں دولت از گفتار خیزد

پھر چند دن داد عیش دینے کے بعد تم کون؟ اور ہم کون؟ کی کہاوت سچ کر دکھاتے
ہیں۔ شیرنی بے چاری دکھ پر دکھ جھیلتی ہے۔ بڑے جتن سے بچے پالتی ہے۔ کوئی بے بی
سیٹر BABY SEATER تو میسر ہوتا نہیں۔ شکار کی تلاش کے دوران بچوں کو کس پر چھوڑے؟
زندگی عذاب ہو جاتی ہے۔ شوہر نامدار بانکے چھیلے۔ جو دو بچوں کے نان نفقے روٹی کپڑے
سے بے نیاز کھاتے پیتے موج اڑاتے پھرتے ہیں! یہ مذہب بیزاری اگر انسانوں میں بھی آ جائے
تو کیا ہو؟ پناہ بہ خدا!

سانبھر جو گھوڑے کے قد قوارے کا جانور ہے اور چھ سینگ کا صافہ باندھتا ہے
اس کے مسلمان ہونے کا تذکرہ اوپر آ چکا ہے اور یوں آ چکا ہے کہ جس جانکار سے پوچھا اس نے
یہی کہا کہ ہم نے جنگل میں کبھی کسی نر سانبھر کو چار سے زیادہ مادئیں رکھتے نہیں دیکھا۔
حسب حیثیت اور ذوق کبھی ایک کبھی دو۔ کبھی تین اور حد سے حد چار بیویاں اس کے ساتھ رہتی
ہیں۔ پردے کا قائل بھی اس کو اسی طرح سمجھا جا سکتا ہے کہ غیرت مند سانبھر کبھی یہ گوارا نہیں

کرتا کہ کوئی دوسرا سانبھر اس کی حرم سرا یا وادی میں قدم رکھے۔ تخلیے کی یہ پابندی دوسرے
جانوروں کے لیے نہیں ہے۔ صرف اپنی برادری سانبھر ذات کے لیے ہے کہ اس کا کوئی
فرد ان کی خلوت گاہ میں نہ گئے۔ سو یہ سب ہی جانتے ہیں کہ پردہ اکثر اپنوں ہی سے
کیا جاتا ہے محلے سے باہر تو برقعہ انسانوں کا بھی اتر جایا کرتا ہے۔

لکڑ بگھا دان دکھشنا پر جیتا ہے۔ دوسروں کا مارا کھاتا ہے یا مردار اور سڑے
بسے کی آس لگاتا ہے۔ حرام حلال جائز ناجائز کا کوئی جھگڑا نہیں پالتا اس کے بولنے
کو لوگ قہقہوں سے تشبیہ دیتے ہیں۔ قہقہے انسانی برادری میں شاید لکڑ بگھے
کی برادری سے آئے ہیں۔ کیونکہ آدمیوں میں بھی یہ زیادہ تر انہی کے حصے میں
آئے ہیں جو دوسروں کی کمائی پر جئیں یا مرے گرے کی خیر منائیں۔ جو غریب اپنا خون
پسینہ ایک کرتا ہے قہقہہ کیسا اسے تو مسکرانے کی مہلت بھی کم ہی ملتی ہے۔

ریچھ بڑا ذاکر شاغل جانور ہے۔ اکثر چلتے پھرتے تسبیح پڑھنے والوں اور مالا جپنے
والوں کی طرح بڑبڑاتا رہتا ہے۔ اللہ کی کسی نعمت سے اسے انکار نہیں۔ بنیادی طور
پر سبزی خور ہے۔ لیکن دیمک بھی کھا لیتا ہے۔ گوشت بھی مفت کا مل جائے تو روایتی
قاضی کی طرح حلال سمجھتا ہے۔ انسان مہوے کی شراب بنا کر پیتے ہیں۔ یہ ویسے ہی
مہوے کے پھول اور پھل زیادہ مقدار میں کھا کر مست ہو جاتا ہے اور کہتا ہے کہ خمار گندم
میں جب نیکوکار انسان عیب نہیں جانتے تو میرے لیے اس قدرتی نبیذ میں کیا
برائی ہے! فیملی لائف کا قائل ہے۔ میاں بیوی بچے سب ساتھ مل کر نشہ پانی کرتے
ہیں اور غم مٹاتے ہیں۔ ریچھ کو بد مزاج جانور کہا جاتا ہے۔ لیکن مہوے کی شراب طہور
اسے خوش مزاج بنا دیتی ہے!

مہوے کے شوقین سانبھر چیتل بھی ہوتے ہیں اور اس کے پھول ان کے لیے
خواب آور گولیاں بن جاتے ہیں۔ اس تھوڑی سے فروگزاشت کو نظر انداز کر دیا جائے
تو معلوم ہوگا کہ نشے بازی تقریباً سب ہی جانوروں میں ممنوع ہے۔ اور ممنوع کیوں
نہ ہوتی وہاں تو جو سویا اور جس نے ذرا ہوش کھویا سمجھئے کہ مارا گیا۔ نیند جنگل کی مملکت میں

صرف ایک۔ آنکھ کی جائز ہے پتا کھڑکا اور بندہ بھڑکا والی کہاوت جنگل ہی سے انسانی بستی میں آئی ہے۔ شیر تیندوے تک جن کو بظاہر کسی سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ بڑے ہوشیار سوتے ہیں۔ شب بیداری جنگل کے باسیوں کا عام دستور ہے۔ مگر

ہم الٹے بات الٹی یار الٹا

والی مثل ہے۔ جنگل میں رات سونے اور عبادت کے لیے نہیں بلکہ کھانے کمانے کے لیے ہوتی ہے۔ دن کو آرام کیا جاتا ہے۔ چین کی بنسی بجتی ہے۔ اور رات چیرنے پھاڑنے اور گردن دبوچنے کے لیے ہوتی ہے۔ جنگل کے اس قانون کو جن انسانوں نے اپنایا ہے خوب اپنایا ہے! انسانی اور حیوانی لین دین زندگی کے ہر شعبے میں ہے۔ مذہب پرستی اور مذہب بیزاری میں بھی آدمی اور جانور، برابر کے نہ سہی کسی نہ کسی حد تک ایک دوسرے کے شریک ضرور ہیں۔

نیا سلام ہائے!

خواجہ حسن ثانی نظامی

میں نے یہ سلام سب سے پہلے امریکہ میں سنا۔ میرے میزبان کو صبح ہوتے ہی ہائے ہائے" سخت ناپسند تھی اور امریکنوں کا یہ معمول کہ جہاں کوئی صورت آشنا نظر آئی، ہاتھ اٹھایا اور ہائے کا نعرہ مارا۔

امریکن "ہائی" کا تلفظ "ہائے" کرتے ہیں اور یہ وہاں کا ایسا سلام ہے کہ حروف او۔ کے کی طرح ساری دنیا میں پھیل گیا ہے اور ہم ہندوستانیوں نے بھی اسے "او کے" کر دیا ہے۔ اور کیوں نہ کرتے؛ نئی نسل تو خیر ہر ولایتی اور امپورٹڈ چیز کی عاشق ہے۔ پرانے لوگوں کے لیے بھی اس "ہائے" میں دین دنیا کی بھلائیاں موجود ہیں۔

"ہائے" دردمندی کی علامت ہے۔ اور دردمندی صوفی مشن کا خلاصہ اور ہندوستانی شاعری کی جان ہے۔ خبر نہیں گاندھی جی کبھی امریکہ گئے یا نہیں؛ اور اگر امریکہ گئے تو کسی نے انھیں ہائے کہہ کر سلام کیا یا نہیں؛ امریکن بڑے جدت پسند واقع ہوئے ہیں۔ ان کے ہاں صبح کچھ طریقہ ہے۔ شام کو کچھ۔ ممکن ہے یہ سلام اور GREETING بھی گاندھی جی کے

بعد کی ایجاد ہو ورنہ مجھے یقین ہے وہ اسے ضرور اپنی ستیہ گرہ کا حصّہ بنا کر اپنا لیتے اور خوب رواج دیتے۔ کیوں کہ ایک طرف یہ سلام عدم تشدد اور اہنسا کی علامت ہے اور دوسری طرف "قہر درویش برجان درویش" کی لمبی اور مشکل کہاوت کا بہترین خلاصہ اور شارٹ ہینڈ بھی۔

اس سلام کا ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ کم از کم ہم ہندوستانیوں اور اُردو اور ہندی والوں کے لیے "ہائے" کی آڑ میں بہت سی ناگفتنی باتیں گفتنی ہو جاتی ہیں۔ نہ شعروں کے انتخاب کی ضرورت پڑتی ہے۔ نہ اپنی رسوائی کی فکر لاحق ہوتی ہے۔ عاشقانِ صادق اور غیر صادق سب کے لیے یہ یکساں مفید اور گویا تیر بہدف ہے!

ذاتی طور پر مجھے یہ سلام یوں بھی پسند ہے کہ اس کا تعلق میرے پڑوسی، رشکِ عرفی و فخرِ طالب مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ سے ہے وہ بھی کلکتے سے آئے تھے تو آرامارا کے قافیے اور "ہائے ہائے" کی ردیف میں مبتلا آئے تھے۔

کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں
اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے
وہ سبزہ زار ہائے مطرا کہ ہے غضب
وہ نازنیں بتانِ خود آرا کہ ہائے ہائے
صبر آزما وہ ان کی نگاہیں کہ حف نظر
طاقت ربا وہ ان کا اشارہ کہ ہائے ہائے
وہ میوہ ہائے تازہ و شیریں کہ واہ وا
وہ بادہ ہائے ناب گوارا کہ ہائے ہائے

غالبؔ کی یہ "ہائے ہائے" تھی تو شاید اگلے وقتوں ہی کی "ہائے ہائے" مگر کلکتے کے "نازنیں بتانِ خود آرا" کو کچھ ایسی بھائی کہ انھوں نے اسے سلام کی طرح قبول کیا۔ گھڑی بھی دعا کی مقبولیت کی تھی کارکنانِ قضا و قدر نے فرمان جاری کر دیا کہ آئندہ زمانے میں اللہ کی پیاری مخلوق "ہائے ہائے" کر کے اپنے پیاروں کو پکارا کرے گی۔

کیا عجب کہ اس کی کچھ سن گن مرزا کو بھی لگ گئی ہو۔ فرشتوں سے یاد اللہ تھی ہی۔ ان کا

قلم ٹیلی گراف کا کھٹکا بنا فرشتوں کے پیغام وصول کرتا رہتا تھا۔ جیسا کہ خود انھوں نے کہا ہے۔

غالبؔ صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

ممکن ہے اس خاص پیغام کے ساتھ منسٹری آف انفارمیشن کے پریس نوٹ کی طرح یہ ہدایت بھی آئی ہو کہ اسے اواخر بیسویں صدی سے پہلے شائع نہ کیا جائے۔ اس لیے مرزا نے پوری بات کھولی تو نہیں مگر اشارہ کر دیا کہ

"میں عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ ہوں"

گویا بتا دیا کہ ان کی "ہائے ہائے" مستقبل کا سلام بننے والی ہے سچ کہا تھا کسی نے۔

"ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند"

یہ کام سب سے پہلے آپ نے شروع کیا اور جو مرد (بلکہ جواں مرد!) تھے وہ اس پر عمل کرنے لگے!

مگر اب تو مردوں نے کیا عورتوں نے بھی اس "ہائے" کو اختیار کر لیا ہے۔ کیوں نہ ان کو بھی مردانگی کا سرٹی فکٹ دے دیا جائے! اور اگر کوئی مرد یہ سرٹی فکٹ دینے میں اپنا نقصان سمجھتا ہے تو نہ دے۔ کم از کم اللہ کا شکر تو ادا کرے کہ صنفِ مخالف کی طرف سے جو "ہائے" کبھی بددعا بن کر مردوں پر پڑا کرتی تھی۔ اب دعا ہو کر برس رہی ہے!

چوتھا منظر

زندگی اور وجود

مولانا ابوالکلام آزاد

حسب حالے نہ نوشتیم و شد ایامے چند
قاصدے کو کہ فرستم بتو پیغامے چند

گزشتہ سال جب ہم یہاں لائے گئے تھے تو برسات کا موسم تھا وہ دیکھتے دیکھتے گزر گیا اور جاڑے کی راتیں شروع ہوگئیں۔ پھر جاڑے نے بھی رختِ سفر باندھا اور گرمی اپنا ساز وسامان پھیلانے لگی۔ اب پھر موسم کی گردش اسی نقطہ پر پہنچ رہی ہے جہاں سے چلی تھی۔ گرمی رخصت ہو رہی ہے اور بادلوں کے قافلے ہر طرف سے امنڈنے لگے ہیں۔ دنیا میں اتنی تبدیلیاں ہوچکیں، مگر اپنے دل کو دیکھتا ہوں تو ایک دوسرا ہی عالم دکھائی دیتا ہے جیسے اس نگری میں کبھی موسم بدلتا ہی نہیں سرمد کی رباعی کتنی پامال ہوچکی ہے پھر بھی بھلائی نہیں جاسکتی۔

سرما بگذشت و ایں دل زار ہماں   گرما بگزشت و ایں دل زار ہماں
القصہ تمام سرد و گرم عالم   برما بگزشت، و ایں دل زار ہماں

یہاں احاطے کے شمالی گوشے میں ایک نیم کا درخت ہے کچھ دن ہوئے ایک وارڈن نے

اس کی ایک ٹہنی کاٹ ڈالی تھی اور جڑ کے پاس پھینک دی تھی اب بارش ہوئی تو تمام میدان سرسبز ہونے لگا نیم کی شاخوں نے بھی زرد چیتھڑے اتار کر بہار و شادابی کا نیا جوڑا پہن لیا جس ٹہنی کو دیکھو ہرے ہرے پتوں اور سفید سفید پھولوں سے لد رہی ہے لیکن اس کٹی ہوئی ٹہنی کو دیکھیے تو گویا اس کے لیے کوئی انقلاب حال ہوا ہی نہیں۔ ویسی ہی سوکھی کی سوکھی پڑی ہے اور زبان حال سے کہہ رہی ہے۔

ہمچو ماہی غیر داغم پوشش دیگر نہ بود
تا کفن آمد ہمیں یک جامہ برتن داشتم

یہ بھی اسی درخت کی شاخ ہے جسے برسات نے آتے ہی زندگی اور شادابی کا نیا جوڑا پہنا دیا یہ بھی آج دوسری ٹہنیوں کی طرح بہار کا استقبال کرتی، مگر اب اسے دنیا اور دنیا کے موسمی انقلابوں سے کوئی سروکار نہ رہا۔ بہار و خزاں، گرمی و سردی، خشکی و طراوت، سب اس کے لیے یکساں ہو گئے۔

کل دوپہر کو اس طرف سے گزر رہا تھا کہ یکایک اس شاخ بریدہ سے پاؤں ٹھکرا گیا میں رک گیا اور اسے دیکھنے لگا بے اختیار شاعر کی حسن تعلیل یاد آگئی:

قطع امید کردہ نہ خواہم نعیم دہر
شاخ بریدہ را نظرے بر بہار نیست

میں سوچنے لگا کہ انسان کے دل کی سرزمین کا بھی یہی حال ہے اس باغ میں بھی امید طلب کے بے شمار درخت اگتے ہیں اور بہار کی آمد کی راہ تکتے رہتے ہیں۔ لیکن جن ٹہنیوں کی جڑ کٹ گئی ان کے لیے بہار و خزاں کی تبدیلیاں کوئی اثر نہیں رکھتیں۔ کوئی موسم بھی انھیں شادابی کا پیغام نہیں پہنچا سکتا۔

خزاں کیا فصل گل کہتے ہیں کس کو کوئی موسم ہو
وہی ہم ہیں قفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے

موسمی پھولوں کے جو درخت یہاں اکتوبر میں لگائے تھے۔ انھوں نے اپریل کے آخر تک دن نکالے، مگر پھر نہیں خالی جگہ کرنی پڑی۔ مئی میں خیال ہوا کہ بارش کے موسم کی

تیاریاں شروع کر دینی چاہئیں، چنانچہ نئے سرے سے تختوں کی درستگی ہوئی، نئے بیج منگوائے گئے اور اب نئے پودے لگ رہے ہیں چند دنوں میں نئے پھولوں سے نیا چمن آراستہ ہو جائے گا یہ سب کچھ ہو رہا ہے مگر میرے سامنے رہ رہ کر ایک دوسری ہی بات آ رہی ہے سوچتا ہوں کہ دنیا کا باغ اپنی گل شگفتگیوں میں کتنا تنگ واقع ہوا ہے؟ جب تک ایک موسم کے پھول مرجھا نہیں جاتے دوسرے موسم کے پھول کھلتے نہیں گویا قدرت کو جتنا خزانہ لٹانا تھا، لٹا چکی اب اسی میں ادل بدل ہوتا رہتا ہے ایک جگہ کا سامان اٹھایا دوسری جگہ سجا دیا، مگر نئی پونجی یہاں مل سکتی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قدسی کو پھولوں کا کھلنا پسند نہیں آیا تھا۔ اسے اندیشہ ہوا تھا کہ اگر باغ کا پھول کھلے گا تو اس کے دل کی کلی بند کی بند رہ جائے گی۔

عیش ایں باغ بہ اندازۂ یک تنگدل است
کاش گل غنچہ شود تا دل ما بکشاید

غور کیجیے تو یہاں کی ہر بناوٹ کسی بگاڑ ہی کا نتیجہ ہوتی ہے یا یوں کہیے کہ یہاں کا ہر بگاڑ دراصل ایک نئی بناوٹ ہے۔

بگڑنے میں بھی زلف اس کی بنا کی

میدانوں میں گڑھے پڑ جاتے ہیں مگر اینٹوں کا پزادہ بھر جاتا ہے۔ درختوں پر آریاں چلنے لگتی ہیں مگر جہاز بن کر تیار ہو جاتے ہیں۔ سونے کی کانیں خالی ہو گئیں لیکن ملک کا خزانہ دیکھیے تو اشرفیوں سے بھرپور ہو رہا ہے۔ مزدور نے اپنا پسینہ سر سے پاؤں تک بہا دیا مگر سرمایہ دار کی راحت عیش کا سر و سامان درست ہو گیا۔ ہم مالن کی جھولی بھری دیکھ کر خوش ہونے لگتے ہیں مگر ہمیں یہ خیال نہیں آتا کہ کسی کے باغ کی کیاری اجڑی ہو گی جب ہی تو یہ جھولی معمور ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ جب عرفی نے اپنے دامن میں پھول دیکھے تھے۔ تو بے اختیار چیخ اٹھا تھا۔

زمانہ گلشن عیش کرا بہ یغما داد
کہ گل بہ دامن ما دستہ دستہ می آید

اکتوبر سے اپریل تک موسمی پھولوں کی کیاریاں ہماری دلچسپیوں کا مرکز رہیں صبح و شام کئی کئی گھنٹے ان کی رکھوالی میں صرف کر دیتے تھے۔ مگر موسم کا پلٹنا تھا کہ ان کی حالت نے بھی

پلٹا کھایا تو پھر وہ وقت آگیا کہ ان کی رکھوالی کرنا ایک طرف، کوئی اس کا بھی روادار نہ رہا کہ ان اجل رسیدوں کو چند دن اور ان کی حالت پر چھوڑ دیا جائے ایک ایک کر کے تمام کیاریاں اکھاڑ ڈالی گئیں وہی ہاتھ جو کبھی اونچے ہو ہو کر ان کے سر و سینے پر پانی بہاتے تھے اب بے رحمی کے ساتھ ایک ایک ٹہنی توڑ مروڑ کر پھینک رہے تھے۔ جن درختوں کے پھولوں کا ایک ایک ورق حسن کا مرقع اور رعنائی کا پیکر تھا اب جھلسی ہوئی جھاڑیاں اور روندی ہوئی گھانس کی طرح میدان کے ایک کونے میں ڈھیر ہو رہا تھا اور صرف اسی مصرف کا رہ گیا تھا کہ جس بے سر و سامان کو جلانے کے لیے لکڑیاں میسر نہ آئیں وہ انھیں کو چولھے میں جھونک کر اپنی ہانڈی گرم کرے۔

گلگونہ عارض ہے، نہ ہے رنگ حنا تو
اے خون شدہ دل تو تو کسی کام نہ آیا

زندگی اور وجود کے جس گوشہ کو دیکھیے، قدرت کی کرشمہ سازیوں کے ایسے ہی تماشے نظر آئیں گے۔

درچمن کہ بہار و خزاں ہم آغوش است
زمانہ جام بدست و جنازہ بر دوش است

انسان کی زندگی کا بھی بعینہٖ یہی حال ہوا۔ سعی و عمل کا جو درخت پھل پھول لاتا ہے اس کی رکھوالی کی جاتی ہے جو بیکار ہو جاتا ہے اسے چھانٹ دیا جاتا ہے فاما الزبد فید ھب جفاء و اما ما ینفع الناس فیمکث فی الارض [1]

---

[1] یہ قرآن کی ایک آیت کا ٹکڑا ہے جس میں کارخانہ ہستی کی اس اصل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جو چیز نافع ہوتی ہے وہ باقی رکھی جاتی ہے جو بے کار ہو گئی وہ چھانٹ دی جاتی ہے۔

چڑیا چڑے کی کہانی

مولانا ابوالکلام آزاد

قلعۂ احمد نگر

۱۰ر مارچ ۱۹۴۳ء

صدیق مکرم

زندگی میں بہت سی کہانیاں بنائیں۔ خود زندگی ایسی گزری جیسے ایک کہانی ہو۔

ہے آج جو سرگذشت اپنی — کل اس کی کہانیاں بنیں گی

آیئے، آج آپ کو چڑیا چڑے کی کہانی سناؤں:

دگر باشنیدستی، ایں ہم شنو

یہاں کمرے جو ہمیں رہنے کو ملے ہیں، پچھلی صدی کی تعمیرات کا نمونہ ہیں۔ چھت لکڑی کے شہتیروں کی ہے اور شہتیروں کے سہارے کے لیے محرابیں ڈال دی ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ جا بجا گھونسلا بنانے کے قدرتی گوشے نکل آئے، اور گوریاؤں کی بستیاں آباد ہو گئیں۔ دن بھر اُن کا ہنگامہ تگ و دو گرم رہتا ہے۔ کلکتہ میں بالی گنج کا علاقہ چونکہ کھلا اور درختوں سے

بھرا ہے۔ اس لیے وہاں بھی مکانوں کے برآمدوں اور کانسو پر چڑیوں کے غول ہمیشہ حملہ کرتے رہتے ہیں؛ یہاں کی ویرانی دیکھ کر گھر کی ویرانی یاد آگئی!

"اُگ رہا ہے در و دیوار سے سبزہ غالبؔ!
ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے"

گذشتہ سال جب اگست میں یہاں ہم آئے تھے، تو ان چڑیوں کی آشیاں سازیوں نے بہت پریشان کر دیا تھا۔ کمرہ کے مشرقی گوشہ میں منہ دھونے کی ٹیبل لگی ہے۔ ٹھیک اس کے اوپر نہیں معلوم کب سے ایک پرانا گھونسلا تعمیر پا چکا تھا۔ دن بھر میدان سے تنکے چن چن کر لائیں اور گھونسلے میں بچھانا چاہتیں۔ وہ ٹیبل پر گر کے اسے کوڑے کرکٹ سے اَٹ دیتے۔ اِدھر پانی کا جگ بھروا کے رکھا، اُدھر تنکوں کی بارش شروع ہو گئی۔ پچھم کی طرف چار پائی دیوار سے لگی تھی، اُس کے اوپر نئی تعمیروں کی سرگرمیاں جاری تھیں۔ ان نئی تعمیروں کا ہنگامہ اور زیادہ عاجز کر دینے والا تھا۔ ان چڑیوں کو ذرا سی تو چونچ ملی ہے، اور مٹھی بھر کا بھی بدن نہیں، لیکن طلب و سعی کا جوش اس بلا کا پایا ہے کہ چند منٹوں کے اندر بالشت بھر کلفات کھود کے صاف کر دیں گی۔ حکیم ارشمیدس ARCHIMEDAS کا مقولہ مشہور ہے DOSMOIPAUST OKAITENGEKINGESO مجھے فضا میں کھڑے ہونے کی جگہ دے دو، میں کرۂ ارضی کو اس کی جگہ سے ہٹا دوں گا۔ اس دعوے کی تصدیق ان چڑیوں کی سرگرمیاں دیکھ کر ہو جاتی ہے۔ پہلے دیوار پر چونچ مار مار کے اتنی جگہ بنا لیں گی کہ پنجے ٹیکنے کا سہارا نکل آئے۔ پھر اس پر پنجے جما کر چونچ کا پھاوڑا چلانا شروع کر دیں گی، اور اس زور سے چلائیں گی کہ سارا جسم سکڑ سکڑ کر کانپنے لگے گا۔ اور پھر تھوڑی دیر کے بعد دیکھیے، تو کئی انچ کلفات اُڑ چکی ہوگی۔ مکان چونکہ پرانا ہے، اس لیے نہیں معلوم، کتنی مرتبہ چونے اور ریت کی تہیں دیوار پر چڑھتی رہی ہیں اب مل ملا کر تعمیری مسالے کا ایک موٹا سا دَل بن گیا ہے۔ ٹوٹتا ہے تو سارے کمرے میں گرد کا دھواں پھیل جاتا ہے؛ اور کپڑوں کو دیکھیے، تو غبار کی تہیں جم گئی ہیں۔

اس مصیبت کا علاج بہت سہل تھا، یعنی مکان کی ازسرِنو مرمت کر دی جائے، اور تمام گھونسلے بند کر دیے جائیں، لیکن مرمت بغیر اس کے ممکن نہ تھی کہ معمار بلائے جائیں، اور

یہاں باہر کا کوئی آدمی اندر قدم رکھ نہیں سکتا۔ یہاں ہمارے آتے ہی پانی کے نل بگڑ گئے تھے ایک معمولی مستری کا کام تھا، لیکن جب تک ایک انگریز فوجی انجینیر کمانڈنگ آفیسر کا "پروانہ" راہداری لے کر نہیں آیا، اُن کی مرمت نہ ہو سکی۔

چند دنوں تک تو میں نے صبر کیا، لیکن پھر برداشت نے صاف جواب دے دیا، اور فیصلہ کرنا پڑا کہ اب لڑائی کے بغیر چارہ نہیں:

من و گرز و میدان و افراسیاب

یہاں میرے سامان میں ایک چھتری بھی آگئی ہے؛ میں نے اٹھائی اور اعلانِ جنگ کر دیا۔ لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد معلوم ہو گیا کہ اس کوتاہ دستی کے ساتھ ان حریفانِ سقف و محراب کا مقابلہ ممکن نہیں۔ حیران ہو کر کبھی چھتری کی نارسائی دیکھتا، کبھی حریفوں کی بلند آشیانی۔ بے اختیار حافظ کا شعر یاد آگیا:

خیالِ قدِ بلندِ تو می کند دلِ من
تو دستِ کوتہِ من بین و آستین دراز

اب کسی دوسرے ہتھیار کی تلاش ہوئی۔ برآمدہ میں جالا صاف کرنے کا بانس پڑا تھا۔ دوڑتا ہوا گیا اور اُسے اٹھا لایا۔ اب کچھ نہ پوچھیے کہ میدانِ کارزار میں کس زور کا رن پڑا۔ کمرہ میں چاروں طرف حریف طواف کر رہا تھا اور میں بانس اٹھائے، دیوانہ وار اس کے پیچھے دوڑ رہا تھا۔ فردوسی اور نظامی کے رجز بے اختیار زبان سے نکل رہے تھے:

بہ خنجر زمیں را میستاں کنم
بہ نیزہ ہوا را نیستاں کنم

آخر میدان اپنے ہی ہاتھ رہا، اور تھوڑی دیر کے بعد کمرہ ان حریفانِ سقف و محراب سے بالکل صاف تھا:

بیک تاختن تا کجا تاختم
چہ گردن کشاں را سر انداختم

اب میں نے چھت کے تمام گوشوں پر فتحمندانہ نظر ڈالی، اور مطمئن ہو کر لکھنے میں مشغول

ہوگیا لیکن ابھی پندرہ منٹ بھی پورے نہیں گزرے ہوں گے کہ کیا سنتا ہوں، حریفوں کی رجز خوانیوں اور ہوا پیمائیوں کی آوازیں پھر اُٹھ رہی ہیں۔ سر اٹھا کے جو دیکھا، تو چھت کا ہر گوشہ اُن کے قبضہ میں تھا۔ میں فوراً اٹھا اور بانس لاکر پھر معرکۂ کارزار گرم کردیا:

برآرم دیار از ہمہ لشکرش
بہ آتش بسوزم ہمہ کشورش

اس مرتبہ حریفوں نے بڑی پامردی دکھائی۔ ایک گوشہ چھوڑنے پر مجبور ہوتے، تو دوسرے میں ڈٹ جاتے، لیکن باالآخر میدان کو پیٹھ دکھانی ہی پڑی۔ کمرہ سے بھاگ کر برآمدہ میں آئے اور وہاں اپنا لاؤ لشکر نئے سرے سے جمانے لگے۔ میں نے وہاں بھی تعاقب کیا۔ اور اُس وقت تک ہتھیار ہاتھ سے نہیں رکھا کہ سرحد سے بہت دور تک میدان صاف نہیں ہوگیا تھا۔ اب دشمن کی فوج تتر بتر ہوگئی تھی، مگر یہ اندیشہ باقی تھا کہ کہیں پھر اکٹھی ہوکر میدان کا رُخ نہ کرے۔ تجربے سے معلوم ہوا تھا کہ بانس کے نیزہ کی ہیبت دشمنوں پر خوب چھاگئی ہے جس طرف رُخ کرتا تھا۔ اسے دیکھتے ہی کلمۂ فرار پڑھتے تھے اس لیے فیصلہ کیا کہ ابھی کچھ عرصے تک اسے کمرے میں رہنے دیا جائے۔ اگر کسی اِکا دُکا حریف نے رُخ کرنے کی جرأت بھی کی، تو یہ سرِ بفلک نیزہ دیکھ کر اُلٹے پاؤں بھاگنے پر مجبور ہوجائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ سب سے پُرانا گھونسلا منھ دھونے کی ٹیبل کے اوپر تھا۔ بانس اس طرح وہاں کھڑا کردیا گیا کہ اس کا سرا ٹھیک گھونسلے کے دروازے کے پاس پہنچ گیا تھا۔ اب گو مستقبل اندیشوں سے خالی نہ تھا، تاہم طبیعت مطمئن تھی کہ اپنی طرف سے سروسامانِ جنگ میں کوئی کمی نہیں کی گئی۔ میر کا یہ شعر زبانوں پر چڑھ کر بہت پامال ہوچکا ہے، تاہم موقعہ کا تقاضہ ٹالا بھی نہیں جاسکتا:

شکست و فتح نصیبوں سے ہے ولے اے میرؔ!
مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا!

اب گیارہ بج رہے تھے میں کھانے کے لیے چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد واپس آیا تو کمرہ میں قدم رکھتے ہی ٹھٹھک کے رہ گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ سارا کمرہ پھر حریف کے قبضہ میں ہے، اور اس

اطمینان و فراغت سے اپنے کاموں میں مشغول ہیں، جیسے کوئی حادثہ پیش آیا ہی نہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ جس ہتھیار کی ہیبت پر اس درجہ بھروسہ کیا گیا تھا، وہی حریفوں کی کامجوئیوں کا ایک نیا آلہ ثابت ہوا۔ بانس کا سرا جو گھونسلے سے بالکل لگا ہوا تھا گھونسلے میں جانے کے لیے اب دہلیز کا کام دینے لگا ہے تنکے چُن چُن کر لاتے ہیں اور اس نوتعمیر دہلیز پر بیٹھ کر بہ اطمینان تمام گھونسلے میں بچھاتے جاتے ہیں۔ ساتھ ہی چُوں چُوں بھی کرتے جاتے ہیں۔ عجب نہیں یہ مصرعہ گنگنا رہے ہوں کہ:

عدو شود سبب خیر گر خدا خواہد

اپنی وہمی فتح مندیوں کا یہ حسرت انگیز انجام دیکھ کر بے اختیار ہمت نے جواب دے دیا۔ صاف نظر آگیا کہ چند لمحوں کے لیے حریف کو عاجز کردینا تو آسان ہے، مگر اُن کے جوشِ استقامت کا مقابلہ کرنا آسان نہیں؛ اور اب اس میدان میں ہار مان لینے کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں رہا۔

بیا کہ ما سپر انداختیم، اگر جنگ ست!

اب یہ فکر ہوئی کہ ایسی رسم و راہ اختیار کرنی چاہیے کہ ان ناخواندہ مہمانوں کے ساتھ ایک گھر میں گزارا ہو سکے۔ سب سے پہلے چارپائی کا معاملہ سامنے آیا۔ یہ بالکل نئی تعمیرات کی زد میں تھی پرانی عمارت کے گرنے اور نئی تعمیروں کے سروسامان سے جس قدر گرد و غبار اور کوڑا کرکٹ نکلتا سب کا سب اِسی پر گرتا۔ اس لیے اسے دیوار سے اتنا ہٹا دیا گیا کہ براہِ راست زد میں نہ رہے۔ اس تبدیلی سے کمرہ کی شکل ضرور بگڑ گئی، لیکن اس کا علاج ہی کیا تھا! جب خود اپنا گھر ہی اپنے قبضہ میں نہ رہا، تو پھر شکل و ترتیب کی آرائشوں کی کسے فکر ہوسکتی تھی؛ البتہ منھ دھونے کے ٹیبل کا معاملہ اتنا آسان نہ تھا۔ وہ جس گوشے میں رکھا گیا تھا۔ صرف وہی جگہ اس کے لیے نکل سکتی تھی؛ ذرا بھی اِدھر اُدھر کرنے کی گنجائش نہ تھی۔ مجبوراً یہ انتظام کرنا پڑا کہ بازار سے بہت سے جھاڑن منگوا کر رکھ لیے اور ٹیبل کی ہر چیز پر ایک ایک ڈال دیا تھوڑی دیر کے بعد انھیں اٹھا کر جھاڑ دیتا اور پھر ڈال دیتا۔ ایک جھاڑن اس غرض سے رکھنا پڑا کہ ٹیبل کی سطح کی صفائی برابر ہوتی رہے سب سے زیادہ مشکل مسئلہ فرش کی صفائی کا تھا۔ لیکن اسے بھی کسی نہ کسی طرح حل کیا گیا۔ یہ بات طے کرلی گئی کہ صبح کی معمولی صفائی کے علاوہ بھی کمرے میں بار بار جھاڑو پھر جانا چاہیے۔

ایک نیا جھاڑو منگوا کر الماری کی آڑ میں چھپا دیا۔ کبھی دن میں دو مرتبہ، کبھی تین مرتبہ، کبھی اس سے بھی زیادہ، اس سے کام لینے کی ضرورت پیش آتی۔ یہاں ہر دو کمرے کے پیچھے ایک قیدی صفائی کے لیے دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ ہر وقت جھاڑو لیے کھڑا نہیں رہ سکتا تھا، اور اگر رہ بھی سکتا تو اس پر اتنا بوجھ ڈالنا انصاف کے خلاف تھا۔ اس لیے یہ طریقہ اختیار کرنا پڑا کہ خود ہی جھاڑو اٹھا لیا اور ہمسایوں کی نظریں بچا کے جلد جلد دو چار ہاتھ مار دیے۔ دیکھیے ان ناخواندہ مہمانوں کی خاطر تواضع میں کتنی سی تگ کرنی پڑی؛

عشق ازیں بسیار کردست و کُند!

ایک دن خیال ہوا کہ جب صلح ہو گئی، تو چاہیے کہ پوری طرح صلح ہو۔ یہ ٹھیک نہیں کہ رہیں ایک ہی گھر میں اور رہیں بیگانوں کی طرح۔ میں نے باورچی خانے سے تھوڑا سا کچا چاول منگوایا۔ اور جس صوفے پر بیٹھا کرتا ہوں۔ اس کے سامنے کی دری پر چند دانے چھٹک دیے۔ پھر اس طرح سنبھل کے بیٹھ گیا، جیسے ایک شکاری دام بچھا کے بیٹھ جاتا ہے۔ دیکھیے عرفی کا شعر صورت حال پر کیسا چسپاں ہوا ہے:

فتادم دام بر کنجشک و شادم یاد آں ہمت
کہ گر سیمرغ می آمد بدام، آزاد میکردم

کچھ دیر تک تو مہمانوں کو توجہ نہیں ہوئی؛ اگر ہوئی بھی، تو ایک غلط انداز نظر سے معاملہ آگے نہیں بڑھا۔ لیکن پھر صاف نظر آگیا کہ معشوقانِ ستم پیشہ کے تغافل کی طرح یہ تغافل بھی نظر بازی کا ایک پردہ ہے، ورنہ نیلے رنگ کی دری پر سفید سفید ابھرے ہوئے دانوں کی کشش ایسی نہیں کہ کام نہ کر جائے؛

حور و جنت جلوہ بر زاہد دہد در راہ دوست
اندک اندک عشق در کار آورد بیگانہ را

پہلے ایک چڑیا آئی اور ادھر ادھر کودنے لگی۔ بظاہر چہچہانے میں مشغول تھی مگر نظر دانوں پر تھی۔ جنتی یزدی کیا خوب کہہ گیا ہے:

چہ لطف باکہ درین شیوۂ نہانی نیست　　عنایتے کہ تو داری بمن بیانی نیست

پھر دوسری آئی اور پہلی کے ساتھ مل کر دری کا طواف کرنے لگی۔ پھر تیسری اور چوتھی بھی پہنچ گئی۔ کبھی دانوں پر نظر پڑتی، کبھی دانہ ڈالنے والے پر؛ کبھی ایسا محسوس ہوتا جیسے آپس میں کچھ مشورہ ہو رہا ہے؛ اور کبھی معلوم ہوتا ہے ہر فرد غور و فکر میں ڈوبا ہوا ہے۔ آپ نے غور کیا ہوگا کہ گوریا جب تفتیش اور تفحص کی نگاہوں سے دیکھتی ہے، تو اس کے چہرے کا کچھ عجیب سنجیدہ انداز ہو جاتا ہے۔ پہلے گردن اٹھا کے سامنے کی طرف دیکھے گی، پھر گردن موڑ کے داہنے بائیں دیکھنے لگے گی۔ پھر کبھی گردن کو مروڑ دے کر اوپر کی طرف نظر اٹھائے گی، اور چہرے پر متفحص اور استفہام کا کچھ ایسا انداز چھا جائے گا، جیسے ایک آدمی ہر طرف متعجبانہ نگاہ ڈال ڈال کر اپنے آپ سے کہہ رہا ہو کہ آخر یہ معاملہ ہے کیا اور ہو کیا رہا ہے؟ ایسی ہی متفحص نگاہیں اس وقت بھی ہر چہرہ پر ابھر رہی تھیں۔

پایم بہ پیش از سر ایں کو نمی رود
یاراں خبر دہید کہ ایں جلوہ گاہ کیست

پھر کچھ دیر کے بعد آہستہ آہستہ قدم بڑھنے لگے۔ لیکن براہ راست، دانوں کی طرف نہیں، آڑے ترچھے ہو کر بڑھتے اور کترا کر نکل جاتے۔ گویا یہ بات دکھائی جا رہی تھی کہ خدانخواستہ ہم دانوں کی طرف نہیں بڑھ رہے ہیں۔ دروغ راست مانند کی یہ نمائش دیکھ کر ظہوری کا شعر یاد آ گیا:

بگو حدیثِ وفا، از تو باور ست، بگو
شوم فدائے دروغے کہ راست مانند ست

آپ جانتے ہیں کہ جیسے کہیں زیادہ صیاد کو اپنی نگرانیاں کرنی پڑتی ہیں، جونہی ان کے قدموں کا رخ دانوں کی طرف پھرا، میں نے دم سادھ لیا؛ نگاہیں دوسری طرف کر لیں، اور سارا جسم پتھر کی طرح بے حس و حرکت بنا لیا، گویا آدمی کی جگہ پتھر کی ایک مورتی دھری ہے۔ کیونکہ جانتا تھا کہ اگر نگاہِ شوق نے مضطرب ہو کر ذرا بھی جلد بازی کی، تو شکار دام کے پاس آتے آتے نکل جائے گا۔ یہ گویا نازِ حسن اور نیازِ عشق کے معاملہ کا پہلا مرحلہ تھا:

نہاں از روبہ رخش دانستم تماشائے
نظر بجانب ما کرد و شرمسار شدم

خیر، خدا خدا کر کے اس عشوۂ تغافل نما کے ابتدائی مرحلے طے ہوئے، اور ایک بُتِ طنّاز نے صاف صاف دانوں کی طرف رُخ کیا۔ مگر یہ رخ بھی کیا قیامت کا رُخ تھا۔ ہزار تغافل اس کے جلو میں چل رہے تھے۔ میں بے حس و حرکت بیٹھا دل ہی دل میں کہہ رہا تھا:

بہ ہر کجا ناز سر بر آرد، نیاز ہم پائے کم ندارد
تو و خرامے و صد تغافل، من و نگاہے و صد تمنا

ایک قدم آگے بڑھتا تھا، تو دو قدم پیچھے ہٹتے تھے۔ میں جی ہی جی میں کہہ رہا تھا کہ التفات و تغافل کا یہ ملا جلا انداز بھی کیا خوب انداز ہے۔ کاش تھوڑی سی تبدیلی اس میں کی جا سکتی: دو قدم آگے بڑھتے، ایک قدم پیچھے ہٹتا۔ غالب کیا خوب کہہ گیا ہے:

وداع و وصل جداگانہ لذتے دارد
ہزار بار برو، صد ہزار بار بیا

التفات و تغافل کی ان عشوہ گریوں کی ابھی جلوہ فروشی ہو ہی رہی تھی کہ ناگہاں ایک تنومند چڑے نے جو اپنی قلندرانہ بے دماغی اور رندانہ جراتوں کے لحاظ سے پورے حلقہ میں ممتاز تھا، سلسلۂ کار کی درازی سے اکتا کر بیباکانہ قدم اٹھا دیا، اور زبانِ حال سے یہ نعرۂ مستانہ لگاتا ہوا بہ یک دفعہ دانوں پر ٹوٹ پڑا کہ:

زدیم بر صفِ رندان و ہر چہ باد آباد

اس ایک قدم کا اٹھنا تھا کہ معلوم ہوا، جیسے اچانک تمام رُکے ہوئے قدموں کے بندھن کھل پڑے۔ اب نہ کسی قدم میں جھجک تھی، نہ کسی نگاہ میں تذبذب۔ مجمع کا مجمع بہ یک دفعہ دانوں پر ٹوٹ پڑا۔ اور اگر انگریزی محاورہ کی تعبیر مستعار لی جائے، تو کہا جا سکتا ہے کہ حجاب و تامل کی ساری برف اچانک ٹوٹ گئی، یا یوں کہیے کہ پگھل گئی۔ غور کیجیے، تو اس کارگاہِ عمل کے ہر گوشے کی قدم رانیاں ہمیشہ اسی ایک، قدم کے انتظار میں رہا کرتی ہیں۔ جب تک یہ نہیں اٹھتا، سارے قدم زمین میں گڑے رہتے ہیں! یہ اُٹھا، اور گویا ساری دُنیا اچانک اُٹھ گئی۔

نامردی و مردی قدمے فاصلہ دارد

اس بزمِ سود و زیاں میں کامرانی کا جام کبھی کوتاہ دستوں کے لیے نہیں بھرا گیا۔ وہ ہمیشہ انھیں

کے حصّے میں آیا جو خود بڑھ کر اٹھا لینے کی جرأت رکھتے تھے۔ شاد عظیم آبادی مرحوم نے ایک شعر کیا خوب کہا تھا:

یہ بزمِ مے ہے، یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں، مینا اُسی کا ہے

اس چڑے کا یہ بیباکانہ اقدام کچھ ایسا دل پسند واقع ہوا، کہ اسی وقت دل نے ٹھان لی، اس مرد کار سے رسم و راہ بڑھانی چاہیے۔ میں نے اس کا نام قلندر رکھ دیا، کیونکہ بد دماغی اور وارستگی کی سرگرانیوں کے ساتھ ایک خاص طرح کا بانکپن بھی ملا ہوا تھا، اور اس کی وضعِ قلندرانہ کو آب و تاب دے رہا تھا:

ہے ایک بانکپن بھی بے دماغی میں تو زیبا ہے
بڑھا دو چینِ ابرو پر ادائے کج کلاہی کو

دو تین دن تک اسی طرح اُن کی خاطر تواضع ہوتی رہی۔ دن میں دو تین مرتبہ دانے دری پر ڈال دیتا۔ ایک ایک کر کے آتے، اور ایک ایک دانہ چُن لیتے۔ کبھی دانہ ڈالنے میں دیر ہو جاتی، تو قلندر آ کر چُوں چُوں کرنا شروع کر دیتا کہ وقتِ معہود گزر رہا ہے۔ اس صورتِ حال نے اب اطمینان دلا دیا تھا کہ پردۂ حجاب اُٹھ چکا، وہ وقت دُور نہیں کہ رہی سہی جھجک نکل جائے:

اور کھل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں

چند دنوں کے بعد میں نے اس معاملہ کا دوسرا قدم اٹھایا۔ سگرٹ کے خالی ٹین کا ایک ڈھکنا لیا۔ اس میں چاول کے دانے ڈالے اور ڈھکنا دری کے کنارے رکھ دیا۔ فوراً مہمانوں کی نظر پڑی۔ کوئی ڈھکنے کے پاس آ کر منھ مارنے لگا، کوئی ڈھکنے کے کنارے پر چڑھ کر زیادہ جمعیتِ خاطر کے ساتھ چُگنے میں مشغول ہو گیا۔ آپس میں رقیبانہ زد و کد بھی ہوتی رہی۔ جب دیکھا کہ اس طریق ضیافت سے طبیعتیں آشنا ہو گئی ہیں، تو دوسرے دن ڈھکنا دری کے کنارے سے کچھ ہٹا کر رکھا، تیسرے دن اور زیادہ ہٹا دیا اور بالکل اپنے سامنے رکھ دیا۔ گویا اس طرح بتدریج بُعد سے قُرب کی طرف معاملہ بڑھ رہا تھا۔ دیکھیے، بُعد و قُرب کے معاملہ نے عُلیّہ بنت المہدی کا مطلع یاد دلا دیا۔

وَحَبِّب، فَاِنَّ الحُبَّ دَاعِیَۃُ الحُبِّ ۔۔۔ وَکَم مِن بَعیدِ الدّارِ مُستَوجِبُ القُربِ

اتنا قرب دیکھ کر پہلے تو مہمانوں کو کچھ تامل ہوا۔ دری کے پاس آ گئے۔ مگر قدموں میں جھجک تھی اور نگاہوں میں تذبذب بول رہا تھا۔ لیکن اتنے میں قلندر اپنے قلندرانہ نعرے لگاتا ہوا آ پہنچا اور اس کی رندانہ جرأتیں دیکھ کر سب کی جھجک دور ہو گئی، گویا اس راہ میں سب قلندر ہی کے پیرو ہوئے۔ جہاں اس کا قدم اٹھا، سب کے اٹھ گئے۔ وہ دانوں پر چونچ مارتا، پھر سر اٹھا کے اور سینہ تان کے زبان حال سے مترنم ہوتا:

وَما الدَّھرُ اِلّا مِن رُواۃِ قصائدی
اِذا قُلتُ شعراً، اَصبحَ الدَّھرُ مُنشِد

جب معاملہ یہاں تک پہنچ گیا، تو پھر ایک قدم اور اٹھایا گیا، اور دانوں کا برتن دری سے اٹھا کے تپائی پر رکھ دیا۔ یہ تپائی میرے بائیں جانب صوفے سے لگی رہتی ہے، اور پوری طرح میرے ہاتھ کی زد میں ہے۔ اس تبدیلی سے خوگر ہونے میں کچھ دیر لگی۔ بار بار آتے اور تپائی کے چکر لگا کے چلے جاتے۔ بالآخر یہاں بھی قلندر ہی کو پہلا قدم بڑھانا پڑا، اور اس کا بڑھنا تھا کہ یہ منزل بھی پچھلی منزلوں کی طرح سب پر کھل گئی۔ اب تپائی کبھی تو ان کی مجلس آرائیوں کا ایوان طرب بنتی، کبھی باہمی معرکہ آرائیوں کا اکھاڑا۔ جب اس قدر نزدیک آ جانے کے خوگر ہو گئے، تو میں نے خیال کیا، اب معاملہ کچھ اور بڑھایا جا سکتا ہے۔ ایک دن صبح یہ کیا کہ چاول کا برتن صوفے پر ٹھیک اپنی بغل میں رکھ دیا اور پھر لکھنے میں اس طرح مشغول ہو گیا، گویا اس معاملے سے کوئی سروکار نہیں۔

دل و جانم بتو مشغول و نظر بر چپ و راست
تا نہ دانند رقیبان کہ تو منظور منی!

تھوڑی دیر کے بعد کیا سنتا ہوں کہ زور زور سے چونچ مارنے کی آواز آ رہی ہے۔ انکھیوں سے دیکھا، تو معلوم ہوا کہ ہمارا پرانا دوست قلندر پہنچ گیا ہے، اور بے تکان چونچ مار رہا ہے۔ ڈھکنا چونکہ بالکل پاس دھرا تھا، اس لیے اس کی دم میرے گھٹنے کو چھو رہی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد دوسرے یاران تیز گام بھی پہنچ گئے؛ اور پھر تو یہ حال ہو گیا کہ ہر وقت دو تین دوستوں کا حلقۂ بے تکلف میری بغل میں اچھل کود کرتا رہتا۔ کبھی کوئی صوفے کی

پشت پر چڑھ جاتا، کبھی کوئی جست لگا کر کتابوں پر کھڑا ہو جاتا، کبھی نیچے اتر آتا اور چوں چوں کر کے پھر واپس آ جاتا۔ بے تکلفی کی اس اچھل کود میں کئی مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ میرے کاندھے کو درخت کی ایک جھکی ہوئی شاخ سمجھ کر اپنی جست و خیز کا نشانہ بنانا چاہا، لیکن پھر چونک کر پلٹ گئے، یا پنجوں سے اسے چھوا اور اوپر ہی اوپر نکل گئے۔ گویا ابھی معاملہ اس منزل سے آگے نہیں بڑھا تھا جس کا نقشہ وحشی یزدی نے کھینچا ہے:

ہنوز عاشقی و دلربایئے نہ شدہ است
ہنوز زوری و مردآزمایئے نہ شدہ است
ہمیں تواضع عام ست حسن را باعشق
میان ناز و نیاز آشنایئے نہ شدہ است

بہر حال رفتہ رفتہ آہوان ہوائی کو یقین ہو گیا کہ یہ صورت جو ہمیشہ صوفے پر دکھائی دیتی ہے، آدمی ہونے پر بھی آدمیوں کی طرح خطرناک نہیں ہے۔ دیکھیے، محبت کا افسوں جو انسانوں کو رام نہیں کر سکتا، وحشی پرندوں کو رام کر لیتا ہے:

درس وفا اگر بود زمزمۂ محبتے
جمعہ بمکتب آورد طفل گریز پا را

بارہا ایسا ہوا کہ میں اپنے خیالات میں محو، لکھنے میں مشغول ہوں، اتنے میں کوئی دلنشیں بات نوک قلم پر آ گئی، یا عبارت کی مناسبت نے اچانک کوئی پرکیف شعر یاد دلا دیا، اور بے اختیار اس کی کیفیت کی خود رفتگی میں میرا سر و شانہ ہلنے لگا، یا منہ سے "ہا" نکل گیا، اور یکایک زور سے پروں کے اڑنے کی ایک پھریری آواز سنائی دی۔ اب جو دیکھتا ہوں تو معلوم ہوا کہ ان یاران بے تکلف کا ایک طائفہ میری بغل میں بیٹھا بے تامل اپنی اچھل کود میں مشغول تھا۔ اچانک انھوں نے دیکھا کہ یہ پتھر اب ہلنے لگا ہے، تو گھبرا کر اڑ گئے۔ عجب نہیں، اپنے جی میں کہتے ہوں، یہاں صوفے پر ایک پتھر پڑا رہتا ہے لیکن کبھی کبھی آدمی بن جاتا ہے!

حضرتِ انسان

سید عابد حسین

(۱۶ جون ۱۹۴۸ء)

آج کل ایک سرے سے ساری دُنیا فکر و پریشانی، خوف و ہراس، غم و غصّے میں مبتلا ہے۔ ایک لڑائی کا بخار اُترنے کے بعد انسانیت کے جوڑ جوڑ میں درد ہے، مُنہ کا مزا کڑوا ہے، مزاج چڑچڑا ہے اور دوسری لڑائی کا جاڑا چڑھنا شروع ہو گیا ہے۔ ہندوستان اس جاڑے بخار سے تو سستا چھوٹ گیا تھا مگر یکایک سیاسی موسم بدلنے سے فرقہ پرستی کا مواد اس طرح ابھر آیا کہ پُرانے فسادِ خون نے شدید زہر باد کی صورت اختیار کر لی اور عمل جراحی کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ اس آپریشن کے بعد بدن کا زخم اور دل کا زخم ابھی تک بھرنے نہیں پایا ہے اور طاقت بھی پوری طرح نہیں آئی ہے۔ طبیب کہتے ہیں کہ صحت پانے کے لیے ضروری ہے کہ مریض ہنستا بولتا رہے، خوش و خرم رہے۔

سوال یہ ہے کہ اس زمانے میں، اس فضا میں کوئی بھلا آدمی کیوں کر خوش رہ سکتا ہے خصوصاً ہندوستان میں جہاں ایک کروڑ سے زیادہ آدمی جڑ سے اکھڑ گئے ہیں اور کئی کروڑ کی

جڑیں ہل گئی ہیں، بہت سے خود دکھ بھر رہے ہیں اور بہت سے اپنے بھائیوں کی مصیبت دیکھ کر کڑھ رہے ہیں۔ ایسے وقت میں ہنسی آنا ایک طرف مسکراہٹ بھی بے حیائی، بے حسی، بے دردی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ بے فکری اور اوچھے پن کی ہنسی کے علاوہ ایک اور ہنسی بھی ہوتی ہے، جو گہرے ایمان، پکے ارادے اور بلند حوصلے کی نشانی ہے جو شخص خدا کی خدائی اور انسان کی انسانیت پر ایمان رکھتا ہے، جو دُنیا کی مشکلوں اور مصیبتوں سے لڑنے کا ارادہ اور ان پر غالب آنے کا حوصلہ رکھتا ہے وہ شدید رنج و الم کو خوش مزاجی اور خوش وقتی کے پردے میں چھپا سکتا ہے اور چھپاتا ہے۔ اس کا دل روتا ہے مگر چہرہ ہنستا رہتا ہے اسی کیفیت کا نقشہ غالبؔ نے چند لفظوں میں کھینچا ہے۔ ع

دل محیطِ گریہ و لب آشنائے خندہ ہے

ظرافت یا خوش طبعی جو انسان کو ہنسنے ہنسانے پر ابھارتی ہے، قدرت کی بہت بڑی نعمت ہے۔ دراصل یہ احساسِ تناسب کی صفت ہے اور اسے تہذیب یا کلچر کی بنیاد سمجھا جاتا ہے جس میں احساسِ ظرافت ہوتا ہے اس کی نظر میں ہر قسم کی بے اعتدالی بے تکا پن، بھونڈا پن فوراً کھٹکتا ہے وہ ان چیزوں پر خود ہنستا ہے اور دوسروں کو ہنساتا ہے اس طرح وہ ایک طرف الم ہستی کے بوجھ کو ہلکا کرتا ہے اور دوسری طرف لوگوں کو ان کے عیوب کی طرف توجہ دلا کر اصلاح کا موقع دیتا ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ ظرافت کا استعمال بے دردی سے نہیں ہمدردی سے کیا جائے۔ یہ نہ ہو کہ جس پر ہم ہنسیں اُسے رُلا دیں۔ اس سے تو ضد اور عداوت پیدا ہوتی ہے۔ ظرافت کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ جس کی ہنسی اڑائی جائے وہ خود بھی ہنس پڑے اور جھیپ کر کہے "بھئی بات تو ٹھیک ہے"۔ یہ ہمدردی کا جذبہ اس وقت نمایاں ہوتا ہے، جب ہم اپنے آپ کو اپنی ظرافت کا نشانہ بناتے ہیں۔ اپنے اوپر ہنسنے میں ہمارا اندازہ یہ ہوتا ہے کہ ہماری یہ حرکت تو واقعی بے تکی تھی مگر یوں ہم آدمی اچھے ہیں۔ یہی انداز سب کے ساتھ ہونا چاہیے۔ صحیح احساسِ ظرافت یا احساسِ تناسب رکھنے والا جانتا ہے کہ دنیا میں سراسر اچھا یا سراسر برا کوئی نہیں ہوتا۔

بالقوۃ سب انسان اچھے ہیں یعنی سب میں اچھا بننے کی صلاحیت موجود ہے۔ البتہ بالفعل ہر شخص خوبیوں اور خامیوں کا مجموعہ ہوتا ہے۔ ہماری ظرافت عموماً اس کی خامیوں کو دکھاتی ہے لیکن اگر پس منظر میں اس کی خوبیاں بھی دکھادی جائیں تو نقش زیادہ ابھر آتا ہے۔ دھوپ چھاؤں کا کھیل تصویر میں جان ڈال دیتا ہے۔

مثلاً ہمارے دوست سر اے۔ بی۔ سی۔ کو لے لیجیے۔ بچارے کچھ عرصے سے اپنے خوش طبع حریفوں کا تختۂ مشق بنے ہوئے ہیں۔ پچھلے سال جب خطابوں کی آخری فہرست میں انھیں سر کا خطاب ملا تو ایک دل لگی باز نے کہا۔

لے لو سر کا خطاب اے۔ بی۔ سی بھاگتے بھوت کی لنگوٹی ہے۔

جھنڈے کی سلامی کی رسم ادا کی تو ایک بگڑے دل نے فقرہ کسا۔

پرجا کا سلامی بھی ہے سرکار کا سر بھی

اے نہالی کے بینگن تو اِدھر بھی ہے اُدھر بھی

اسی طرح بچارے کی اس بات پر کہ پہلے اپ ٹوڈیٹ انگریزی لباس ڈانٹ کر دیتی شان سے اکڑتے تھے اور اب شدھ کھدر کے کپڑے پہن کر دیسی انداز میں برتے ب، طرح طرح کی پھبتیاں کسی جاتی ہیں۔ کوئی پکارتا ہے ؏

او زمانے کی طرح رنگ بدلنے والے

کوئی میاں خوجی کے الفاظ میں کہتا ہے۔

پہچان لیا بہروپیا ہے

کوئی ان کو سنا کر کسی سے پوچھتا ہے ”کیوں بھئی کون سے دانت کھانے کے ہیں ون سے دکھانے کے۔“

ان باتوں کو سن کر آپ کے ذہن میں ان کی تصویر کچھ اس قسم کی آئے گی کہ ایک دھڑ ہے دو سر ہیں، ایک سر ہیٹ سے آراستہ ہے۔ دوسرا گاندھی ٹوپی سے۔ ایک ہاتھ میں یونین جیک ہے۔ دوسرے میں قومی جھنڈا۔ آدھے بدن پر کوٹ آدھے پر کرتا، ایک ٹانگ میں پتلون کا پائنچہ ایک میں دیسی پاجامہ کا، ایک پاؤں میں ولایتی شو ہے ایک میں چپل۔ مگر یہ

تو مگو کے دوہرے کا ساخاکہ ہوا انسان کی تصویر نہ ہوئی۔ آئیے ہم آپ کو ان کی سیرت کا ایک روشن رُخ بھی دکھاتے ہیں۔ تاکہ دھوپ چھاؤں کے صحیح تناسب سے آپ ان کی جیتی جاگتی تصویر کھینچ سکیں۔

سر اے۔ بی۔ سی کی سیرت کی سب سے نمایاں خصوصیت ہمدردی کا مادہ ہے۔ جس کی عمومیت کی کوئی حد نہیں۔ بچپن میں ان کے ماں باپ میں بہ تقاضائے محبت ہمیشہ آپس میں جوتی پیزار رہتی تھی، ننھا اے۔ بی۔ سی اس وقت تک سر نہیں ہوا تھا مگر

بالائے سرش زہوش مندی

می تافت ستارۂ بلندی

وہ جوش الفت میں دونوں سے الگ الگ بے حد ہمدردی کا اظہار کرتا، ایک کے سامنے دوسرے کو بُرا کہہ کر اس کے زخم دل پر مرہم رکھتا اور دونوں سے پیسے لے کر اپنا غم غلط کرنے کو مٹھائی کھا لیتا۔ وہ بڑا ہو کر مدرسے میں داخل ہوا تو وہاں بھی اس کی ہمدردی کا یہی حال تھا۔ دو لڑکوں میں لڑائی ہو تو وہ دونوں کا غم خوار، استادوں اور طالب علموں میں کش مکش ہو تو فریقین کا مشیر کار بن جاتا تھا۔

جب اے بی سی نے بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی ہو کر پبلک لائف میں قدم رکھا تو ان کے ہمدردی کے جذبے کو اپنے اظہار کے لیے اور زیادہ وسیع میدان مل گیا۔ وہ ایک امیر گھرانے کے چشم وچراغ تھے۔ ان کے ہاں اللہ کا دیا یعنی اللہ کے غریب بندوں سے لیا ہوا، سب کچھ موجود تھا اور انھیں کسب معاش میں جان کھپانے کی ضرورت نہ تھی۔ اس لیے انھوں نے اپنے آپ کو ملک وقوم کی خدمت کے لیے وقف کر دیا۔ انھوں نے دیکھا ہندوستان کو سب سے زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ کوئی شخص راعی اور رعایا کے بیچ میں پڑے اور اس بات کی کوشش کرے کہ دونوں ایک دوسرے سے نہ سہی کم سے کم اسی سے خوش رہیں۔ اے۔ بی۔ سی جانتے تھے کہ دل کو دل سے راہ ہو یا نہ ہو مگر دل کو پیٹ سے ضرور راہ ہے چنانچہ وہ قومی خدمت کے لیے پبلک پلیٹ فارم اور لکھنے کی میز سے زیادہ کھانے کی میز سے کام لیتے تھے۔ اکبر مرحوم نے ان ہی کی شان میں کہا تھا۔ ؏

قوم کے غم میں ڈنر کھاتا ہے حکام کے ساتھ

لیکن یہ مصرعہ صرف معاملے کے ایک پہلو کو ظاہر کرتا ہے۔ اے۔ بی سی صرف حکام بالا دست ہی کی دعوتیں نہیں کرتے تھے بلکہ حکام زیر دست یعنی شخصی لیڈروں کے غذائی مسئلے کو حل کرنے میں بھی حصہ لیتے تھے۔ جب راشننگ کا دور آیا اور ہم کو آپ کو آدھے پیٹ آٹا اور ایک واڑھ شکر ملنے لگی تو اے۔ بی سی کو بڑی مشکل پیش آئی مگر ان کی طبع رسا نے اس کا یہ حل نکالا کہ چور بازاری کے انسداد کا بیڑہ اٹھالیا اور محکمہ غذا کے عمال کے ساتھ مل کر ناجائز ذخیروں کو بہ حق افسران سرکار اور بہ حق لیڈران قوم ضبط کرنے لگے۔ چور بازار خالی کر کے چور معدوں کو پُر کرنے کی خدمت انھوں نے بڑی تندہی سے بغیر کسی معاوضے کے برسوں تک انجام دی۔ اسی کے صلے میں سرکار ابد قرار نے ان کو سر کے خطاب سے سرفراز کیا۔

مگر افسوس کہ سر منڈاتے ہی پڑ گئے اولے۔ یعنی ان کے سر ہوتے ہی سرکار ابد قرار سر پر پاؤں رکھ کر فرار ہوگئی، وہ سر جو زیب تن ہوتا اب وبال دوش ہوگیا۔ اب بے چارے کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ دو طرح کے ملاقاتی کارڈ رکھیں۔ ایک پر سر اے۔ بی۔ سی کٹ، اور دوسرے پر خادم قوم اے۔ بی۔ سی۔ چھپوائیں۔ انگریزی وضع کے کپڑے تو بہت تھے۔ اب اس مہنگائی کے زمانے میں شدہ کھدر کے کپڑے جن میں تراش کم اور خراش زیادہ ہوتی ہے، بنوانے پڑے۔ آپ ان کی دورنگی پر ہنستے ہیں حالاں کہ آپ کو قلق آنا چاہئے اس غریب کی حالت پر جسے روشنی سے اتنی سچی محبت ہے کہ ڈوبتے چاند کی ٹھنڈی پھیکی کرنیں اور چڑھتے سورج کی گرم تیز شعاعیں یکساں عزیز ہیں۔ دونوں کی چھوٹ نے مل کر یہ گنگا جمنی رنگ پیدا کر دیا ہے جسے آپ دورنگی کہتے ہیں۔

(۸ اگست ۱۹۴۸ء)

بھائی صاحب کا نام ان کے دوستوں اور عزیزوں میں بہت کم لوگوں کو معلوم ہے شاید ان کی بیوی کے سوا سب ہی لوگ انھیں بھائی صاحب کہہ کر پکارتے ہیں۔ سچ مچ وہ اپنی طرف سے ہر ایک کے ساتھ بھائی کا سا برتاؤ کرتے ہیں اس کے گھر کو اپنا گھر، اس کے حقے کو

اپنا حقہ سمجھتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ کسر نفسی کی وجہ سے دوسروں کو موقع نہیں دیتے کہ وہ بھی ان کے ساتھ اس قسم کا برادرانہ برتاؤ کریں۔

شام کو میرے ہاں اکثر دوستوں کا مجمع ہوتا ہے۔ بھائی صاحب بھی عموماً آ براجتے ہیں خصوصاً ان دنوں جب لکھنؤ سے خمیرے کا پارسل آیا ہوا ہو۔ کوئی ایسی ہی مجبوری ہو تو دو ایک چلم کے بعد اٹھ جاتے ہیں۔ ورنہ چلموں بیٹھے رہتے ہیں۔ ایک کان سے سنائی نہیں دیتا، دوسرے سے بھی کئی منزل اونچا سنتے ہیں۔ ہم لوگ ان سے کہتے ہیں: بھائی صاحب کیا بات ہے آپ کے انصاف کی۔ سب کی ایک کان سے سنتے ہیں (آہستہ سے) اور دوسرے کان سے اڑا دیتے ہیں: دراصل سننے کا موقع بہت کم آتا ہے۔ زیادہ تر سناتے ہی رہتے ہیں۔ کسی نے کوئی بات چھیڑی اور انھوں نے اسے زبردستی اپنے ڈھب پر لا کر اپنا کھڑاگ چھیڑ دیا۔ بس ایک موضوع سے گھبراتے ہیں اور وہ سیاست ہے۔ جہاں سیاسی گفتگو شروع ہوئی اور وہ حقہ لے کر الگ جا بیٹھے۔ کچھ دیر تک کہیں کہیں سے دو چار لفظ جو کان میں پڑ جائیں سنتے رہتے ہیں، تاؤ کھاتے رہتے ہیں اور زور زور سے حقے کے کش لیتے رہتے ہیں۔ پھر سلگتے سلگتے ایک دم بھڑک اٹھتے ہیں اور بحث کے بیچ میں اس طرح دھم سے کود پڑتے ہیں کہ سب دھک سے رہ جاتے ہیں۔ وہ پیچیدہ مسئلے جو بڑے بڑے مدبروں کے ناخن تدبیر سے برسوں میں حل نہ ہوں۔ ان کی گرمئی تقریر سے دم بھر میں پگھل جاتے ہیں۔

کل کا ذکر ہے ہم لوگ اس پر بحث کر رہے تھے کہ اگر تیسری عالمگیر جنگ چھڑ جائے تو ہندوستان کو امریکہ (برطانیہ امریکہ۔ برطانیہ) کا ساتھ دینا چاہیے یا روس کا، یا غیر جانبدار رہنا چاہیے۔ بحث کا ایک تکون بن گیا اور اسے سیدھی لکیر بنانے کی کوشش کسی طرح کامیاب نہ ہوتی تھی۔ بھائی صاحب نے ایک ہی جھٹکے میں اسے اور ہم سب کو گھن چکر بنا دیا۔ ڈپٹ کر بولے: کیا بے کار کی رار مچا رکھی ہے۔ کچھ جانیں نہ بوجھیں بحث کرنے کو موجود۔ بھلا بتاؤ ہیروشیما میں جو ایٹم بم پھٹا تھا وہ کہاں سے آیا تھا۔ کہہ دو امریکہ سے۔ جی کہیں سے آیا ہو بھلا یہ بات عقل میں آتی ہے کہ امریکہ کے پاس ایٹم بم ہوتا اور وہ جرمنی پر فتح پانے کے لیے اپنی

نو جیں کٹواتا۔ بم سے کام نہ لیتا۔ آج ہم سے سُن لو، یہ بم اندر سے پھٹا تھا اندر سے یہ اسی مادے سے بنا تھا جس سے ٹوجو، ہٹلر، مسولینی بنے تھے۔ یہی ایٹم بم آج امریکہ میں اور روس میں بن رہا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ کل انگلستان یا ہندوستان میں نہیں بنے گا۔ بین الاقوامی حکمت عملی کو گل حکمت کرکے چولھے میں ڈالو۔ اپنے ملک کے اندر، خود اپنے اندر ان چنگاریوں کو ڈھونڈو اور بجھاؤ جن سے ایٹم بم تیار ہوتا ہے (حقے کا کش لے کر) لاحول ولاقوۃ جل کر رہ گیا کیسا اچھا آ رہا تھا۔

(یکم ستمبر ۱۹۴۸ء)

نعیم صاحب اور ان کی وکالت میں ان بن تو رہتی ہی تھی، ۱۹۲۰ء کی سیاسی تحریک میں موقع دیکھ کر اسے طلاق دے بیٹھے۔ خدا کے فضل وکرم سے معاش سے آزاد تھے جس کا بھائی محکمۂ تعمیرات میں انجینئر ہو وہ آرام سے گھر بیٹھ کر سونے کا نوالہ کھا سکتا ہے اس لیے کہ انجینئری تو کیمیا کا نسخہ ہے، مٹی سے سونا بنانا اور جگہ استعارہ ہو۔ مگر تعمیرات میں حقیقت ہے۔ ریت سے، سیمنٹ سے، اینٹوں سے، لوہے سے ہر چیز سے کھرا کندن بنتا ہے۔

وکالت چھوڑ کر نعیم صاحب نے سیاست میں قدم رکھا مگر منڈیر ہی کے اُستاد رہے، اکھاڑے میں نہیں اُترے۔ ان کے گھر پر شام کو کانگریس اور خلافت کے پٹھے جمع ہوتے تھے۔ نعیم صاحب ان کو اندرونی اور بیرونی سیاست کے داؤں پیچ سمجھاتے اور اس کے بعد لپٹن کا دور چلتا۔ پہلے دھواں دھار تقریر اور پھر گرما گرم چائے۔ لوگ صبر کی تلخی کو، بر شیریں کے لالچ میں برداشت کرتے تھے۔

نعیم صاحب کے ولی نعمت اور بھائی انجینئر صاحب پنشن پانے کے ہول سے وفات پا گئے۔ اور وصیت نامے میں بیوی بچوں کے نام جائداد اور نعیم صاحب کے نام دعائے خیر لکھ گئے۔ اس صدمے سے نعیم صاحب کا دماغ اُلٹ گیا۔ بہت دن تک مرے ہوئے بھائی کو کوستے رہے کہ اتنی جلدی کیوں مر گئے، سیاست بگھارنے کا شوق اب بھی باقی تھا۔ مگر بگھارنے کا سامان نہیں رہا۔ اپنے ہاں چائے پلا کر جھکنے میں جو شان تھی وہ دوسروں کے ہاں پی کر بہکنے میں نہ تھی۔ مگر ان کو اس کا احساس نہ تھا بلکہ جوں جوں ان کی مالی حالت ابتر ہوتی گئی۔ اس

کی تلافی کے لیے سیاست دانی کا ادعا بڑھتا گیا۔ رفتہ رفتہ تخیّل کے زور سے فکر اور عمل کا فصل مٹ گیا۔ اب بچارے پر سیاست کی نظری باریکیاں سمجھانے ہی کا نہیں بلکہ ان کی عملی گتھیاں سلجھانے کا بار بھی پڑ گیا اور اس کو یہ ناتواں اٹھائے پھرتا ہے۔

فرماتے ہیں وہ یہ ٹرومین تو ٹائیں ٹائیں فش ہو کر رہ گیا۔ اب دیکھیں ڈیوی کیا کرتا ہے ہماری رائے میں تو چرچل کو چاہیے کہ امریکی شہری بن کر صدر منتخب ہو جائے۔ امریکہ والوں کو آج کل ایسے ہی تاباوچی کی ضرورت ہے اور چین اور جرمنی کے یہ جھگڑے تو محض بے کار ہیں۔ کوئی ان کو سمجھائے کہ میاں دو قوموں کا نظریہ مان لو، دو دو حصوں میں بٹ کر برطانوی ڈومینین بن جاؤ۔ گورنروں جنرلوں کی ضرورت ہو تو ہندوستان سے منگوا لینا۔ رہا فلسطین تو وہاں نئی ریاست کا بادشاہ قاسم رضوی کو بنا دو۔ اپنے آپ کو عرب نسل سے بتاتا ہے۔ صورت سے یہودی معلوم ہوتا ہے۔ دونوں خوش ہو جائیں گے اور ضمناً حیدر آباد کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔ چین کا قصہ برسوں سے چل رہا ہے۔ کسی طرح طے ہونے میں نہیں آتا۔ اس کی صورت یہی ہو سکتی ہے کہ جاپان پوست کی کاشت کرے، اس کی معاشی مشکل آسان ہو جائے گی اور چین کو افیون بھیجی جائے، اس کی سیاسی گتھی سلجھ جائے گی۔ افیم کے عمل سے چینیوں میں پھر وہی دھیان گیان، رقت قلب اور صلح جوئی پیدا ہو جائے گی اور اس روز روز کی خانہ جنگی سے چھٹکارا مل جائے گا اور یہ کشمیر کا جھگڑا ابھی کوئی جھگڑا ہے۔ وہ تو اسی دن طے ہو گیا تھا۔ جس دن مہاراجہ نے، مایۂ خویش، باہر کے بنکوں میں منتقل کر کے ریاست کا حساب کم و بیش شیخ عبداللہ کے سپرد کر دیا اور اب جو ہندوستان اور پاکستان کی میزان نہیں بیٹھتی۔ اس کی تدبیر ہم سے پوچھو، پنڈت نہرو تو کرلیں شادی اور لیاقت علی تجرد کی زندگی اختیار کریں، تیل، مرچ کھٹائی، بادی چیزوں کا پرہیز رکھیں۔ پھر اگر ہماری سیاست اعتدال پر نہ آ جائے۔ تو نعیم کا نام بدل دینا مگر مشکل یہ ہے کہ یہ سب کرے کون ہے وہ کہ ایک نعیم کم بخت اکیلا کس کس چیز کو سنبھالے۔ ایک دل ہزار فکریں ایک سر ہزار سودا۔

(۸ اکتوبر ۱۹۴۸ء)

ہمارے دوست ل، ک، ملاحی صاحب دیکھنے میں تو بڑے حلیم الطبع اور رقیق القلب

نظر آتے ہیں۔ شاید اس لیے کہ دائمی نزلے نے ان کی آواز میں ایک جکڑی ہوئی نرمی اور چہرے پر ایک بہتی ہوئی رقت کی کیفیت پیدا کر رکھی ہے۔ لیکن اگر کبھی غصہ آجائے تو الاماں، الحفیظ۔ یہی رقت اس طرح تپنے اور دہکنے لگتی ہے کہ معلوم ہوتا ہے جوالا مکھی کے دہانے سے لاوا اُبل رہا ہے۔ لوگ جتنا ان کے فرطِ غضب سے ڈرتے ہیں، اتنے ہی ان کے وفورِ محبت سے بھی خائف رہتے ہیں اس لیے کہ دونوں حالتوں میں صرف پاسبانِ عقل ہی نہیں بلکہ پاسبانِ ادب بھی اس بگڑے دل کو تنہا چھوڑ کر ٹہل جاتا ہے اور اس کی زبان سے بے ساختہ اُردوئے معلّٰی کے چھٹے ہوئے محاورے سرزد ہونے لگتے ہیں۔ جن میں عموماً مخاطب کی خلافِ شرع پیدائش کا ذکر ہوتا ہے اور اس کے خاندان کے ساتھ سسرالی رشتوں کا اور طرح طرح کے ازدواجی اور غیر ازدواجی تعلقات کا دعویٰ کیا جاتا ہے۔ ملاحی صاحب کو اپنے صاف دل ہونے پر بڑا فخر ہے اور یہ اس لحاظ سے صحیح ہے کہ گو ان کے دل میں گندگی بڑی کثرت سے پیدا ہوتی ہے پر ٹھہرنے نہیں پاتی، فوراً اُگل پڑتی ہے اور دل اُبنی ہوئی اوجھڑی کی طرح صاف ہو جاتا ہے۔ مگر ان کو یہ شکایت ہے کہ ان کا دل صاف ہوتے ہی دوسروں کا دل میلا ہو جاتا ہے۔ سخت افسوس کیا کرتے ہیں کہ اس انگریزی تہذیب نے ہمارے مذاق اور اخلاق کا ہاضمہ خراب کر دیا ہے۔ ان کو کوئی چٹ پٹی مسالہ دار چیز پچتی ہی نہیں ہے۔ موجودہ عہد کے اخلاقی ضعفِ معدہ پر ملامت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ آخر ہمارے بزرگ بھی تو تھے جو میر ضاحک اور سودا کی ہجویں، جعفر زٹلی کی ہزل، رنگین اور جان صاحب کی ریختی، شوق کی مثنویاں، یہاں تک کہ چرکین کی اسہالیات ہضم کر جاتے تھے اور ڈکار نہ لیتے تھے، ہمارے نئے ادب کی عریانیات میں ملاحی صاحب کو خاک مزہ نہیں آتا۔ وہ تو اس اکسیر کے قائل ہیں جس سے مراد آباد میں مردہ زندہ ہو جائے۔ جب آج کل کی کسی تصنیف نہانی کا ذکر سنتے ہیں تو بڑے شوق سے منگوا کر پڑھتے ہیں اور مایوس ہو کر کہتے ہیں، وہ بس دیکھ لیا۔ اس برتے پر تتا پانی۔

۸ر دسمبر ۱۹۴۸ء

ع اپنے سے کر، نہ غیر سے، الفت ہی کیوں نہ ہو

معلوم نہیں غالب مرحوم کو یہ نصیحت کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ اس لیے کہ یہی تو ایک فرض ہے جسے عام طور پر لوگ آپ ہی آپ بڑے ذوق شوق سے ادا کرتے ہیں۔ اگر کچھ خدا کے بندے ایسے ہوں بھی جنھیں اس بارے میں تاکید کی ضرورت ہو تو ہمارے نہال صاحب ان میں سے نہیں ہیں۔ نہال صاحب کو اپنے آپ سے سچی اور گہری محبت ہے۔ وہ اپنی صورت کے عاشقِ زار ہیں۔ مگر غیرت مند، خوددار عاشقوں کی طرح اپنا رازِ محبت دوسروں پر ظاہر نہیں ہونے دیتے۔ چھپ چھپ کر آئینے میں اپنی شکل دیکھتے ہیں اور غش غش کرتے ہیں۔ دوسروں کی کوتاہ بیں نظر کو ان کے چوکور چہرے، چوکھی رنگت، فراخ دہانے، کشادہ، ہوادار، ناک اور بانکی ترچھی آنکھوں میں کوئی حسن دکھائی نہیں دیتا۔ مگر لیلیٰ را بہ چشمِ مجنوں باید دید۔ نہال صاحب کو آئینے میں انسان کا عکس نہیں بلکہ حسن و جمال کی پوٹ نظر آتی ہے جسے دیکھ کر ان کا دل لوٹ پوٹ ہو جاتا ہے

نہال صاحب کے کان بڑے حساس ہیں۔ ہر آواز جو ذرا سی سخت یا کرخت، تیز یا بھاری پھٹی ہوئی یا بیٹھی ہوئی ہو ان کو زہر لگتی ہے۔ مگر اپنی آواز کا زیر و بم، شد و مد، قبض و بسط انھیں اتنا پسند ہے کہ ہر وقت منہ ہی منہ میں گنگناتے رہتے ہیں اور دل ہی دل میں مزے لیتے رہتے ہیں۔ اور جہاں موقع ملے۔

رنگ روپ اور سر تال ہی پر موقوف نہیں، وہ اپنی آن بان، سج دھج چال ڈھال غرض ایک ایک ادا پر سو سو جان سے قربان ہیں۔ مگر یہ نہ سمجھئے گا کہ نہال صاحب محض صورت کے بندے ہیں۔ وہ اپنے جمالِ ظاہری سے کہیں زیادہ اپنے حُسنِ باطنی کی قدر کرتے ہیں۔ ان کی جوہر شناس آنکھ اپنی سیرت میں ایسی ایسی خوبیاں دیکھتی ہے جنھیں غیر کی نظریں مشکل سے پرکھ سکتی ہیں، مثلاً ان کا اپنے ساتھ حُسنِ سلوک، اپنی ہمدردی، دل نوازی، دلداری، دلجوئی، اپنے عیبوں سے چشم پوشی، اپنی خطاؤں سے درگذر، ہر مصیبت میں اپنا ساتھ دینا۔ ہر مشکل میں اپنے کام آنا۔ ان صفاتِ حسنہ کی وجہ سے اپنی پرستش اس خشوع و خضوع کے ساتھ کرتے ہیں کہ بالکل ع

صنم ہم دیر ہم بت خانہ ہم بت ہم برہمن ہم

کے مصداق بن کر رہ گئے۔

نہال صاحب کے عشق مجہول کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ کسی کو ان سے رقابت نہیں، وہ بلا شرکت غیرے اپنے محبوب کے لطف و کرم سے بہرہ اندوز ہوتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ کبھی کبھی اکتا کر یہ کہہ اُٹھتے ہیں۔

ع کاش کوئی رقیب بھی ہوتا (جاری)

عام زندگی

سید عابد حسین

یکم دسمبر ۱۹۴۸ء

"آیئے آیئے میر صاحب اب تو مہینوں کیا برسوں آپ کی صورت نظر نہیں آتی۔ پہلے آپ کو عید کا چاند کہتے تھے۔ اب دُم دار ستارہ کہنا پڑے گا"

"یہ دم دار ستارہ کیا معنی؟ جو منہ میں آتا ہے بک دیتے ہو۔ دیکھئے نہیں کہ ایک تو محاورہ غلط ہے۔ دوسرے اس میں ذم کا پہلو نکلتا ہے"

"ارے توبہ معاف کیجیے گا۔ میں نے محاورہ سمجھ کر نہیں استعارہ سمجھ کر کہا تھا۔ مگر بڑا غضب تو یہ ہوا کہ ذم کا پہلو نکل آیا۔ اب کیا ہوگا! ذرا اچھی طرح دیکھ لیجیے کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کو دھوکا ہوگیا ہو"

"دھوکا کیا ہوتا، کھلی ہوئی بات ہے۔ ایک تو دم داریوں ہی قبیح ہے اور پھر دم دار ستارے میں تو قباحت کے علاوہ نحوست بھی آگئی"

"قباحت کو تو خیر صبر کر لیجیے۔ مشیتِ ایزدی میں کیا چارہ ہے۔ مگر یہ نحوست آپ کی

میری سمجھ میں نہیں آئی "

"پھر وہی شرارت کی باتیں۔ میری نحوست کا ذکر ہے یا دمدار ستارے کی"

"توبہ کیجیے پیر صاحب میری کیا مجال کہ آپ کی نحوست کو کچھ کہوں۔ میں تو دم دار ستارے کی نحوست سے انکار کر رہا ہوں"

"تمہارا کیا ہے۔ تم تو شیطان کی شیطانیت سے بھی انکار کر دوگے۔ غضب خدا کا صریحاً دیکھ رہے ہو کہ ادھر دم دار ستارہ نکلا، اُدھر بمبئی پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ وہ طوفان آیا کہ بس خدا کی پناہ اور پھر بھی اس منحوس ستارے کی نحوست سے انکار کرتے ہو۔"

"قربان جایئے آپ کے اس بھولے پن کے۔ بمبئی کا طوفان آپ کے خیال میں دم دار ستارے کے دُم چھلّا تھا۔ ستارہ تو ساری دنیا میں دیکھا گیا اور اس کی نحوست کی تان صرف بمبئی پر آکر ٹوٹی۔ اور یہ جو ہندوستان اور پاکستان میں ایک کروڑ آدمیوں پر خانہ بربادی کی قیامت ٹوٹی اور اب چالیس کروڑ آدمیوں پر مہنگائی اور بھوک کی قیامت ٹوٹ رہی ہے اور یہ جو یورپ کے اوپر جنگ کی قیامت ٹوٹی اور اب کومن فارم اور مارشل ایڈ کی قیامت ٹوٹ رہی ہے اسے بھی آپ دمدار ستارے کی نحوست کہیں گے"

"تو پھر کیا کہوں؟"

"اپنے اعمال کی شامت کہیے، اپنی حماقت، جہالت اور وحشت کہیے۔ وہ دن گئے جب انسان اپنے کرتوت شیطان کے سر منڈھ دیا کرتا تھا یا دم دار ستارے کی دم سے باندھ دیا کرتا تھا۔ اب قانون اور آئین کا زمانہ ہے۔ سوچ سمجھ کر چونچ کھولنا چاہیے اگر آپ نے شیطان پر یا دمدار ستارے پر ایسے بے سروپا الزام لگائے تو یو۔این۔او میں نالش کر دیں گے اور چودھری ظفر اللہ کو اپنا وکیل بنالیں گے۔ بیٹھے بٹھائے آپ کے اوپر کمیشن بیٹھ گیا تو پھر کیا کیجیے گا۔"

تم تو ہو مسخرے اور مجھے مسخرے پن سے چڑ ہے۔ اسی لیے تم سے ملتے ہوئے گھبراتا ہوں"

یوں کہیے نا۔ ع

"تو بے نیسوڑا اور میں ہوں مقطع میرا تیرا میل نہیں"

۱۶ر دسمبر ۴۸ء۱۹

(ا، ب ریل میں انٹر کے ایک ڈبے میں سفر کر رہے ہیں)

ا۔ غضب خدا کا دسمبر کے شروع میں یہ سردی! ہاتھ پاؤں کیا ہوش وحواس تک جم کر رہ گئے۔ (اخبار پر نظر ڈال کر) جی ہاں، کل کے موسم کی رپورٹ میں لکھا ہے۔ دلی میں درجۂ حرارت گر گر ۳۸ تک پہنچ گیا۔

ا۔ درجۂ حرارت؟ بہت معقول! ارے درجۂ برودت، درجۂ مصیبت درجۂ ہلاکت نہیں کہتے۔ لوگ سردی سے اکڑ کر رہ گئے اور آپ درجۂ حرارت لیے پھرتے ہیں۔

ب۔ تو صاحب میں اس کے لیے کیا کروں علمی اصطلاح یہی ہے۔

ا۔ بجا ارشاد ہوا، ہم بھی جانتے ہیں کہ علمی اصطلاح یہی ہے۔ مگر علم کے ساتھ کچھ اخلاق کا بھی تو خیال رہنا چاہیے۔

ب۔ آپ تو کچھ عجیب آدمی معلوم ہوتے ہیں، میں نے کون سی بد اخلاقی کی۔

ا۔ ہائے یہی تو آپ نہیں سمجھتے۔ جب لوگ جاڑوں مر رہے ہوں تو درجۂ حرارت کا نام لینا بد اخلاقی کیا بے دردی ہے خواجہ میر درد فرماتے ہیں۔ ع

درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو

ب۔ اس طرح سے تو زبان کھولنا مشکل ہو جائے گا۔ مثلاً اس میں یہ پیش گوئی ہے کہ اگلے تین چار روز میں رات کو سردی اور زیادہ بڑھ جائے گی۔ اس کا ذکر کرنا تو آپ کے نزدیک اور بھی بے دردی ہوگی۔

ا۔ آہ ظالم یہ کیا کہہ دیا۔ ع

اک تیر میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے

ارے بے دردی کیسی یہ تو قساوت ہے قساوت۔ کس بے پروائی سے فرماتے ہیں کہ اور بڑھ جائے گی سردی۔ اور اس اخبار پر خدا کی مار، اسے کوئی اور خبر چھاپنے کو نہیں ملتی تھی۔

ب۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کی عقل پر ہنسوں یا روؤں۔

ا۔ ہنسیے ہنسیے، روئیں آپ کے دشمن، بس ہنسنے ہی کی کسر رہ گئی ہے۔

ب ۔ ارے بندۂ خدا کیا سردی میرے یا کسی کے کہنے سے پڑتی ہے۔ کیا فطرت کسی کے الفاظ کی تابع ہے۔

ا ۔ بے شک ہے۔ ورنہ شاعر وہ فال بد، حال بد، والی بات کیوں کہتا۔ مگر یہاں اس کا ذکر نہیں۔ فطرت کے تو خمیر میں بے مروتی ہے۔ انسان کیوں بے دید بن جائے۔

ب ۔ تو آپ چاہتے کیا ہیں۔ علمی تحقیقات بند کر دی جائے۔ موسمیات کا محکمہ بند کر دیا جائے۔ سردی گرمی کا ذکر تک نہ آئے۔

ا ۔ یہ کس کمبخت نے کہا ہے۔ آپ علمی تحقیقات، موسمیات جس قسم کی آت اوریات چاہیں شوق سے کریں۔ مگر غریب انسان کے جذبات و حسیات کا تو خیال رکھئے۔ اگر اس قسم کی منحوس خبر سنانا ایسا ہی ضروری ہو تو دو چار ہمدردی کے کلمے تو کہہ دیا کیجیے مثلاً افسوس یہ کہتے ہوئے کلیجہ کٹتا ہے کہ یہ سردی جو تلوار کی دھار کی طرح تیز ہے اور تیز ہونے والی ہے۔ آہ کس دل سے کہا جائے کہ اس قہر کی سردی کے بعد قیامت کی سردی پڑنے والی ہے۔

ب ۔ بہت اچھا اب خیال رکھوں گا۔ مگر اس وقت کس منہ سے کہوں کہ میرا اسٹیشن آگیا۔ مجھے اترنا ہے۔

۲۴ر جنوری ۱۹۴۹ء

• کیا بتاؤں میں تو اس نالائق کی حرکتوں کو دیکھتے دیکھتے زندگی سے عاجز آگیا ہوں۔ جی چاہتا ہے کسی روز کچھ کھا کر سو رہوں۔

• تو کیا اور آپ کچھ کھائے بغیر سو جاتے ہیں؟ یہ تو بڑی بری بات ہے۔ آخر آپ کو خالی پیٹ نیند کیسے آتی ہے؟

• آپ کو تو ہمیشہ مذاق سوجھتا ہے بھلا یہ بھی کوئی دل لگی کا موقع ہے۔

• ہرگز نہیں، یہ تو سر پیٹنے کا موقع ہے۔ مگر کیسے پیٹوں۔ پاس ادب مانع ہے۔ سچ کہتا ہوں۔ مجھے آپ سے دلی ہمدردی ہے۔ لے دے کے ایک بیٹا اور وہ بھی ایسا سپوت نکلا۔

• اس کمبخت کو آپ سپوت کہتے ہیں۔

• جو بیٹا باپ کے قدم بہ قدم ہو اسے سپوت نہ کہوں تو اور کیا کہوں!

• سچ بتایئے وہ کون سی ایسی حرکت کرتا ہے جو آپ نہیں کرتے؟

• آپ ہی جیسے لوگ تو نوجوانوں کو بگاڑتے ہیں۔ بھلا بیٹے کو باپ کی اچھی باتیں سیکھنی چاہئیں یا بری باتیں؟

• چاہنے کا ذکر نہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ وہ کم و بیش دونوں ہی طرح کی باتیں سیکھتا ہے۔

• ہوتا ہے سے کیا کام چلے گا۔ ہمیں تو اپنی اولاد کو "چاہئے" کی تعلیم دینا ہے۔

• ضرور دیجئے۔ بڑا ثواب ہوگا۔ مگر فائدہ کچھ نہیں ہوگا۔ آخر آپ نے اتنے دن کوشش کر کے دیکھ لیا۔

• تو آپ ہی بتایئے اب کیا کروں؟

• یہ کیجیے کہ "چاہئے" کی عمارت بنانے سے پہلے "ہوتا ہے" کی بنیاد کو درست کر لیجیے۔

• کیا مطلب ہے آپ کا۔ اس کو اس کے حال پر چھوڑ دوں۔

• جی نہیں میرا مطلب یہ ہے کہ اپنے آپ کو اپنے حال پر نہ چھوڑیئے۔

• یہ آپ کیا پہیلیاں بجھواتے ہیں! میری سمجھ میں آپ کی بات بالکل نہیں آئی۔

سمجھ میں تو ضرور آگئی ہوگی، یہ کہیئے کہ دل میں نہیں بیٹھی۔ جب رات کو کچھ کھا کر سو رہنے کو جی چاہے، اس وقت سوچئے گا۔

۱۲ر فروری ۱۹۴۹ء

جنتا ایکسپریس کے جس ڈبے میں خاکسار نے بند کھڑکی کے کھلے منہ میں سر ڈال کر غوطہ لگایا، وہاں جمہوریت برابر رہی تھی یعنی جگہ کی تقسیم "سب کو برابر" یا "ہر ایک کو بہ قدر ضرورت" کے اصول پر نہ تھی بلکہ جرأت رندانہ کے حساب سے۔ کچھ لوگ اس طرح پھیل پڑے تھے کہ دوسروں کو سکڑنا ہی پڑتا تھا، بہ قول شاعر

سیٹ اس کی بنچ اس کی بلکہ ڈبہ اس کا ہے
جس کی ٹانگیں تیری لیلیٰ پر خرداماں ہو گئیں

کہیں آدمیوں کے بیٹھنے کی جگہ پر اسباب ڈھیر تھا اور کہیں اسباب رکھنے کی جگہ پر آدمی ڈھیر تھے۔ جب میں غوطہ لگا کر ابھرا تو بہت کچھ ہاتھ پاؤں مارنے کے بعد دو موٹے سجنوں کے بیچ میں ایک

پاؤں گاڑی کے فرش پر اور ایک اسباب کی گٹھری پر رکھ کر کھڑے ہونے کی جگہ ملی۔ ایک تو یوں ہی دم گھٹ رہا تھا اور کچومر نکلا جاتا تھا اور اوپر سے گھڑکیوں اور جھڑکیوں کی بوچھاڑ ہو رہی تھی۔ میری وہ کیفیت تھی جیسے جنوبی افریقہ میں کوئی کالا گوروں کی بستی میں جا پھنسا ہو، جس سے آنکھیں چار ہوتی تھیں وہ ڈاکٹر ملان کی طرح خون کا پیاسا نظر آتا تھا۔

یوں بدل دیں خوف نے سارے جہاں کی صورتیں
آنکھ اُٹھا کر دیکھتا ہوں جس طرف صیاد تھا

اور میرا خوف بے بنیاد نہ تھا اس لیے کہ ایک صاحب کے خلاف، جنھوں نے میری طرح ڈبے کے دوسرے سرے پر قانون داخلہ کی خلاف ورزی کی تھی۔ اور لڑ جھگڑ کر اپنی مداخلت بیجا کو بجا ثابت کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ڈائریکٹ ایکشن شروع ہو گیا تھا۔ میں نے خیریت اسی میں سمجھی کہ دم سادھے چُپ چاپ کھڑا رہوں، پھر بھی دل میں ڈر رہا تھا کہ دیکھیے گاڑی چلنے کے بعد میرے ساتھ کیا سلوک ہوتا ہے مگر گاڑی کے حرکت میں آتے ہی ڈبے میں سکون ہو گیا۔ ادھر ان زبان دراز بزرگ کو جان کی اماں مل گئی اور ادھر مجھ بے زبان پر جو گرم فقروں اور تیکھی نظروں کی بوچھار ہو رہی تھی وہ رک گئی۔ دیکھنے والوں کی آنکھوں میں ڈاکٹر ملان کے قہر کی جگہ ڈاکٹر اسمٹس کا تحمل جھلکنے لگا۔ میرے محدود حقوق شہریت تسلیم کر لیے گئے اور ایک ٹانگ پر کھڑے رہنے کی اجازت مل گئی۔ دونوں طرف سے ٹھوس اور دبیز جسموں کا جو دباؤ پڑ رہا تھا وہ بھی کم ہو گیا اور پیٹ میں سانس سمانے لگا۔ میں سوچ رہا تھا کہ میرے دیس بھائیوں میں پریم کے رس کی کمی نہیں ہے۔ مگر کبھی کبھی یہ رس تھوڑی دیر کے لیے تاؤ کھا کر سرکہ بن جاتا ہے۔ اگر ان میں اتنی سہار ہو کہ وہ دوسروں کا تاؤ ٹھنڈا ہونے تک خود جوش میں آ کر ابل نہ پڑیں تو ہماری زندگی کی چاشنی اتنی تیزش نہ ہونے پائے۔

یکم مارچ ۱۹۴۹ء

رات کھانے پر شب دیگ اتنے مزے کی تھی کہ صبح اُٹھا تو طبیعت کو سخت بدمزہ پایا۔ ناشتہ نہیں کرنا چاہیے تھا، مگر کیا کرتا؟ ایک دوست نے تمہاری بھیجی تھی

نہار توبہ شکن می رسد چہ چارہ کنم

ناشتہ کے عمل نے داخل، خارج کی کارروائی کی صورت اختیار کر لی۔ کلّی کر کے پلنگ پر لیٹا تھا کہ معلوم ہوا کہ صاحب ملنے کو آئے ہیں۔ باہر آیا تو دیکھا ایک بزرگ سوٹ سے آراستہ بوٹ سے مسلح ہاتھ میں چمڑے کا بیگ لیے کھڑے ہیں۔ میں سمجھا کوئی لاگو ڈاکٹر ہے جو دور سے شکار کی بو پا کر آن پہنچا ہے۔ پہلا سوال جوان حضرت نے کیا اس سے یقین ہو گیا کہ یہ ضرور عدستان کے ہائی کمشنر کے ہاں پرسٹ آفیسر ہیں۔

"خیر تو ہے کیسا مزاج ہے؟"

"یہاں سب خیریت ہے اور آپ کی خیریت درگاہِ الٰہی سے مطلوب۔"

"آپ کا سانس پھول رہا ہے۔ چہرے پر غیر طبعی سرخی ہے۔ معلوم ہوتا ہے خون کا دباؤ بڑھا ہوا ہے۔"

"ڈاکٹر صاحب میں تو بچپن سے دباؤ سہنے کا عادی ہوں۔ شادی کے بعد سے زیادہ لوچ پیدا ہو گیا ہے۔"

"جی وہ علّت اور ہے یہ اور ہے اس میں تو شریان پتلے پڑ جاتے ہیں، ان پر دورانِ خون سے بہت زیادہ دباؤ۔"

"اُف ڈاکٹر صاحب یہ شریان تو بڑا خبیث مرض معلوم ہوتا ہے سچ بتائیے کہیں مہلک تو نہیں؟"

"اب آپ سچ پوچھتے ہیں تو کہنا ہی پڑے گا۔ خون کا دباؤ مہلک بھی ہو سکتا ہے۔ اس کا شدید حملہ فالج کی شکل میں ہوتا ہے اور فالج خدا کی پناہ! جس عضو پر گرا اُسے شل کر دیا، عضو معطّل کر دیا۔ اور کہیں خون اندر اندر زیادہ بہہ گیا تو پھر الاماں! الحفیظ!"

"خدا کے لیے ڈاکٹر صاحب ذرا آلہ لگا کر دیکھیے گا میرے کان پر یقیناً فالج گر گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے اندر ہی اندر خون کی دھار بہہ رہی ہے۔"

"میں آپ کے سچے خیر خواہ کی حیثیت سے کہتا ہوں کہ آپ فوراً انشورنس پالیسی خرید لیجیے۔ ابھی مرض کی ابتدا ہے، بیمہ ہو سکتا ہے۔"

"ذرا ٹھہرئے گا آپ ڈاکٹر۔"

"جی نہیں میں انشورنس کا ایجنٹ ہوں۔"

مجھے ایسا معلوم ہوا کہ خون کان سے اندر ہی اندر اوپر چڑھ رہا ہے اور کوئی دم میں سر پر سوار ہو جائے گا۔" (جاری)

باون ہاتھی

کرشن چندر

مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ کہ تری پوری کے مقام پر ہندوستان کی سب سے بڑی سیاسی جماعت انڈین نیشنل کانگرس نے نہایت فخر سے یہ فیصلہ کیا تھا۔ کہ کانگرس کے صدر کا جلوس باون ہاتھیوں پر نکالا جائے۔ خدا کی خلقت پیدل چلے گی۔ لیکن کانگرس کے صدر کی گاڑی میں باون ہاتھی جوتے جائیں گے۔ مجھے یہ بھی اچھی طرح یاد ہے۔ کہ اُس سے پچھلے سال کانگرس کے صدر کا جلوس ایک بیل گاڑی اور بارہ بیلوں پر نکالا گیا تھا۔ انہی مثالوں کو دیکھتے ہوئے میں نے ملک کے سامنے یہ تجویز رکھی ہے۔ کہ امسال صدر کے جلوس میں ایک بگھی گاڑی اور چند بگھیاں شامل کی جائیں۔ تاکہ اُس قرونِ وسطیٰ کی تہذیب کہ جس کا احیا ہمارے رہنما چاہتے ہیں دوبارہ زندہ ہو سکے۔

اس کی یہ وجہ نہیں کہ مجھے ہاتھیوں سے نفرت ہے۔ ہاتھی ایک بہت بڑا جانور ہے۔ اور اُس زمانے کی مخلوق ہے۔ کہ جب ابھی قدرت کے تخیل میں انسان کا وجود بھی نہ گھڑا گیا تھا۔ اس لیے ہاتھی بنی نوعِ آدم کا بزرگ ہے۔ اور میں اس کی اتنی ہی عزت کرتا ہوں۔ کہ جتنی میں

اپنے اُن بزرگوں کی عزت کرتا ہوں۔ جنہیں اس دنیا میں مجھ سے پہلے پیدا ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ اس کے علاوہ میں یہ بھی ماننے کو تیار ہوں کہ ہاتھی میں کئی خوبیاں ہیں۔ خاص کر مجھے وہ منظر بہت دل کش معلوم ہوتا ہے۔ جب میں کسی ہاتھی کو کسی ندی کے درمیان کھڑا ہو کر اپنی لمبی سونڈ سے پانی کو فوارے کی طرح اچھالتا دیکھتا ہوں۔ اس لحاظ سے ہاتھی قدرت کا شالامار باغ ہے۔ اور آگ بجھانے والا آلہ بھی۔ پچھلے وقتوں میں جب شہروں میں آگ بجھانے والی مشینیں نہ ہوتی تھیں۔ بڑے بڑے مہاراجے اور بادشاہ اپنے ہاتھیوں کی سونڈوں سے بازاروں اور محلوں میں آگ بجھانے کا کام لیا کرتے تھے۔ اور اب مجھے ڈر ہے کہ کہیں میری اس تحریر کا یہ اثر نہ ہو۔ کہ ہندوستان کی میونسپل کمیٹیاں آگ بجھانے کی برقی مشینیں ترک کر کے ہاتھی پالنا شروع کر دیں اور گڑ اور چرخے کے ساتھ ساتھ ہاتھی بھی پرانی تہذیب و تمدن کا مظہر بن جائے۔

ہم ہاتھی کو قرونِ وسطیٰ کے تمدن کا ایک خوب صورت نشان سمجھ کر اُسے آثارِ قدیمہ میں شامل کر سکتے ہیں۔ زندگی کے ارتقاء کے نظریے کے ماتحت اُسے قدرت کے مشہور عجائبات میں شمار کر سکتے ہیں۔ لیکن جس چیز پر مجھے اعتراض ہے۔ وہ ہے ہاتھی کو آمدورفت کا ذریعہ بنانا۔ ہاتھی فی الحقیقت سواری کا جانور نہیں ہے ہاتھی کی پیٹھ پر بیٹھنا بالکل ایسا ہی ہے جیسا کسی کوہ آتش فشاں کے دہانے پر بیٹھنا۔ میں اُس دن کو کبھی نہیں بھول سکتا کہ جب میں آخری بار ایک ہاتھی کے ہودے میں بیٹھا تھا۔ وہ ایک چھوٹی سی ریاست تھی۔ راجہ صاحب کا ہاتھی تھا۔ اور ہاتھی کی پیٹھ پر چاندی کا ہودہ کسا تھا۔ بیچارے راجہ صاحب کا انتقال ہو گیا تھا۔ اور ہم سب لوگ ایک ماتمی جلوس کی شکل میں شمشان گھاٹ کو جا رہے تھے۔ ہزاروں آدمی جمع تھے کیونکہ ریاستوں میں ماتمی جلوس بھی اتنے ہی پُرشکوہ ہوتے ہیں، کہ جتنے شادیوں کے جلوس، نفریاں اور ڈھول بج رہے تھے۔ ہاتھی اور علم بردار سجے ہوئے تھے۔ سنکھ پھونکے جا رہے تھے۔ اور ریاستی بینڈ بج رہا تھا۔ ہم چاندی کے ہودے میں بصد فخر و امتیاز بیٹھے ہوئے نیچے زمین پر چلنے والی رعیت کو دیکھ رہے تھے۔ جو اس طرح بین کر رہی تھی۔ جیسے سچ مچ اُن کا گھر اُجڑ گیا ہو۔ ہاتھی کی خفیف سی حرکت بھی ہودے میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو اپنی جگہ تبدیل کر دینے پر مجبور

کر دیتی۔ چنانچہ آدھ گھنٹے کے سفر کے بعد حالت یہ ہو گئی۔ کہ جو شخص ہودے میں سب سے آگے بیٹھا تھا۔ اب سب سے پیچھے لڑھک گیا تھا۔ غالباً سب سے محفوظ جگہ وہ تھی۔ جہاں مہاوت خود بیٹھا ہوا تھا۔ دھت، دھت، بیری، بیری، مہاوت آرام سے بیٹھا ہوا حکم دیئے جاتا تھا۔ اور ہمارے شانے ایک دوسرے سے رگڑ کھا کر چھلنی ہوئے جا رہے۔ ہڈیاں ٹوٹنے کو تھیں۔ اور پیٹ کا پانی اچھل کر گلے تک آ پہنچا تھا۔ آہستہ آہستہ ہم دریا کے کنارے پہنچ گئے۔ ارتھی شمشان گھاٹ کی طرف چلی جہاں چتا تیار کی جا رہی تھی۔ یہاں پہنچ کر لوگ اِدھر اُدھر گھومنے لگے، اور مجمع بکھر گیا۔ یہاں پہنچ کر ہاتھیوں کی چال بھی تیز ہو گئی۔ یکایک ہمارے ہاتھی نے ایک چیخ ماری اور دریا کی طرف دوڑا۔ یہ دیکھ کر لوگ خوف سے اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔ کسی نے دریا میں چھلانگ لگائی تو کوئی سرکنڈوں میں جا چھپا۔ کئی لوگ ارتھی کو چھوڑ کر بھاگ گئے۔ مہاوت نے ہاتھی کو قابو میں لانے کی بہت کوشش کی۔ لیکن بے سود۔ کوہ آتش فشاں کو اب قابو میں لانا بہت مشکل تھا۔ ہاتھی نے سر کو ایک زور سے جھٹکا دیا اور غریب مہاوت زمین پر گر پڑا اور ہاتھی نے اُسے سونڈ سے اٹھا کر ایک طرف پھینک دیا۔ اور اگر وہ چاہتا تو اُسے پاؤں تلے بھی روند سکتا تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں اُس نے مہاوت کی جان بخشی کر دی۔ جو ہر لحظہ پیر تسمہ پا کی طرح اس کے سر پر سوار رہتا تھا۔

یہاں سے ہاتھی خوشی سے چیخیں مارتا ہوا دریا میں گھس گیا۔ دریا کو پار کر کے دھان کے کھیتوں میں گزرتا ہوا بلا خوف و خطر ایک چھوٹی سی گھاٹی پر چڑھ گیا۔ یہاں پہنچ کر اس نے لمبے لمبے چکر کاٹنے شروع کر دیے۔ شاید وہ صدیوں تک اسی طرح لمبے لمبے چکر کاٹتا رہا اور مسرت سے چنگھاڑتا رہا۔ شمشان گھاٹ ہم سے اوجھل ہو گیا تھا۔ اور اس پاگل ہاتھی کے ہودے میں گویا ہم ہر لحظہ موت کے منہ میں جا رہے تھے۔ لیکن کوئی فرد بھی ہماری مدد کو نہ پہنچا تھا۔ کون ایسا دلیر آدمی تھا۔ جو ایک پاگل ہاتھی کے ہودے میں بیٹھے ہوئے آدمیوں کی مدد کر سکتا۔ بہت دیر کے بعد گویا صدیوں کے عرصہ کے بعد ہاتھی کی چال مدھم پڑ گئی۔ شاید جوش سرد پڑ رہا تھا۔ آزادی کی خواہش معدوم ہو رہی تھی۔ اُس کے چکر چھوٹے ہوتے گئے۔ اور آخر وہ ایک جگہ پر بالکل رُک گیا۔ کچھ سوچنے لگا۔ پھر وہ آہستہ سے مڑا۔ اور گھاٹی سے نیچے اُترنے لگا۔ گھاٹی سے اُتر کر اُس نے دھان کے کھیتوں کو پار کیا۔ اور پھر واپس دریا میں گھسا۔ اور سرکنڈوں کے بیچ میں

سے ہوتا ہوا پھر واپس شمشان گھاٹ میں پہنچا۔ اس عرصہ میں لوگوں نے اپنی دانست میں ہمیں مردہ سمجھ لیا تھا۔ اور اب وہ نہایت دل جمعی سے ہمارے لیے بھی چتا تیار کر رہے تھے۔ یکایک ہاتھی کو دوبارہ واپس آتے ہوئے اور ہمیں ہودے میں زندہ دیکھ کر وہ بہت حیران ہوئے سوائے مہاوت کے اور کوئی شخص ہمیں خوش آمدید کہنے کے لیے آگے نہ بڑھا۔ مہاوت بھی رُکتے رُکتے قدموں سے قریب آیا۔ لیکن ہاتھی اب سرجھکا کر چپکا کھڑا تھا۔ جیسے اپنے طرزِ عمل پر خود ہی نادم ہو۔ مہاوت اُس کی سونڈ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اُسے پچکارنے لگا۔ اور اُسے پیارے پیارے ناموں سے بلانے لگا۔ میری پیاری نینا۔ سندر نینا۔ سندر نینا تم کتنے شریر ہو۔ واہ کیا شرارت ہے۔ ہماری تو ہودے میں ہڈیاں تک ریزہ ریزہ ہوگئیں۔ اور آپ کیا مزے سے فرماتے ہیں۔ سندر نینا تم کتنے شریر ہو۔ اگر کسی کو جان سے مار دینے کی کوشش محض ایک شرارت کہی جاسکتی ہے۔ تو میں اپنے ملک کے رہنماؤں سے درخواست کروں گا کہ وہ اس ہاتھی کی شرارت کا خیال رکھیں۔ ریاستی دنیا میں شاید انسان کی زندگی کی اس قدر قدر و قیمت نہ ہو۔ لیکن انگریزی علاقہ میں ابھی تک انسان کی جان اس قدر سستی نہیں ہے کہ اُسے ہاتھی کی ایک معصوم شرارت پر قربان کیا جاسکے۔

قصہ مختصر یہ کہ ہاتھی بطور ایک ذریعہ آمد و رفت ایک ناکارہ شے ہے۔ بدمست غدار بھی ہے۔ اور غیر عوامی UNDEMOCRATIC بھی۔ ہندوستان کے اکثر رہنماؤں کی طرح ہاتھی کا جسم بڑا اور دماغ بہت چھوٹا ہوتا ہے۔ اور اُسے یہ پتہ نہیں ہوتا کہ اس کا اگلا قدم کیا ہوگا۔ وہ کیا کرنا چاہتا ہے۔ ہندوستانی رہنماؤں کی طرح وہ ہمیشہ اپنے آپ کو اندھیرے میں پاتا ہے۔ اور روشنی کی تلاش میں بھٹکتا ہوا محسوس کرتا ہے۔ کبھی کبھی اُس کے دماغ میں روشنی کی ایک کرن آجاتی ہے۔ لیکن پھر جس سرعت سے روشنی اندر آتی ہے۔ اُسی سرعت سے واپس چلی جاتی ہے اور دماغ کو بدستور تنگ و تاریک چھوڑ جاتی ہے۔ اور ہاتھی بے چارہ یہ سمجھ نہیں سکتا کہ اُسے کیا کرنا چاہئے۔ اور کیوں؟ اور بیچارے مہاوتوں اور آدمیوں کو بھی یہ اندازہ نہیں ہوسکتا کہ اب ہاتھی کیا کرے گا اور کب؟

پنجاب کا مہاراجہ جے پال محمود غزنوی سے مارا گیا۔ اور پورس نے سکندر اعظم سے

شکست کھائی۔ اس لیے نہیں کہ ہندوستانی دلیر اور بہادر نہ تھے یا کہ وہ فوجی اور غیر فوجی جماعتوں میں بٹے ہوئے تھے۔ انھوں نے شکست کھائی تو اس لیے کہ ان کے ہاتھیوں نے انہیں دغا دیا۔ بجائے اس کے کہ یہ ہاتھی ترکوں اور یونانیوں کا مقابلہ کرتے اور آگے بڑھ کر انہیں کچل ڈالتے۔ انھوں نے اپنی پیٹھ موڑ لی۔ اور اپنے ہی ہندوستانی سپاہیوں کو اپنے پاؤں تلے روندا۔ اور ان کی صف بندیوں کو تحس نحس کر دیا۔ ہندوستان کی غلامی کی تواریخ ہاتھیوں کی غداری کی تواریخ ہے نہ کہ میر جعفر اور جے چند کی غداری کی تواریخ کاش ہمارے ملک کے رہنما تواریخ سے کچھ سبق سیکھ سکتے۔ انھوں نے اپنے جلوسوں میں ایک نہیں بلکہ باون باون ہاتھی استعمال کرنا شروع کیے ہیں۔ اس کا نتیجہ ملک کے حق میں اچھا نہیں ہوسکتا۔

آخر میں یہ اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا ہاتھی "تشدد" کا حامی ہے۔ یا "عدم تشدد" کا۔ وہ "سچائی" پسند کرتا ہے یا "فریب" تو اس کے متعلق بھی میں وثوق سے کچھ کہہ نہیں سکتا۔ جہاں تک میں نے ہاتھی کی فطرت کا مطالعہ کیا ہے۔ وہ ایک خدا پرست جانور ہے۔ جو کچھ وہ کرتا ہے اُسے ایک الٰہی اشارہ سمجھنا چاہئے۔ اور مجھے تو وہ الٰہی اشارہ کبھی نہیں بھولتا۔ جب اُس نے دریا کے پار ایک بلند گھاٹی پر چند چکر دے کر مجھے ذہن نشین کرا دیا تھا۔ کہ مال ہستی محض ایک فریب ہے۔ اس لحاظ سے ایک صوفی ہے۔ وہ ایک مہاتما ہے جو لنگوٹی سے بھی ناآشنا ہے۔ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ اگر وہ باون ہاتھی جو کانگرس کے صدر کی گاڑی میں جوتے گئے تھے۔ اُسی الٰہی اشارے کے زیر اثر اُسے نربدا میں گھسیٹ لے جاتے تو کیا ہوتا۔ کیا ہندوستان کی تواریخ بدل جاتی یوں نہ ہوتا لیکن ان باتوں کو بے کار سوچنے سے کیا حاصل۔ حقیقت یہی ہے کہ جب تک ہندوستان میں گئو، چرخہ اور ہاتھی کا اقتدار رہیگا۔ یہ بدنصیب ملک کبھی آزاد نہیں ہوسکتا۔

غُسلیات

کرشن چندر

بہت سے بچّوں کا نفسی تجزیہ کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ نہانے کی رسم پتھر کے زمانے بلکہ اس سے بھی بہت پہلے زمانے کی یادگار ہے۔ جب کہ اس کرۂ ارض پر صرف پانی ہی پانی تھا۔ آہستہ آہستہ اس پانی میں مچھلیاں، مینڈک، گھڑیال اور مگرمچھ پیدا ہوئے اور تخلیق حیات کے مختلف منازل طے کرتے ہوئے مختلف النوع ارتقائی درجوں کے بعد انسان کی موجودہ صورت کو پہنچے۔ چنانچہ آج بھی بیسویں صدی کا بچہ جب ٹب میں پڑے پڑے چلّا اٹھتا ہے تو یقیناً پانی کے ٹھنڈا ہونے کی شکایت نہیں کرتا۔ بلکہ اس آبی زمانے کی وحشی رسم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا ہے جس کے نام سے ڈارون کا نام ہمیشہ کے لیے وابستہ ہے۔

اس زمانے میں بہت سی پرانی وحشیانہ رسمیں متروک ہو چکیں، مگر نہانے کے متعلق ابھی کچھ عرصہ اور جہاد کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ میرے بہت سے احباب جو اس قابل نفرین رسم کے خلاف جہاد کرتے کرتے تنگ آ چکے ہیں اور کچھ بہت پُرامید نہیں ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ جب تک پنجاب میں پانچ دریا بہتے رہیں گے انسان بدستور ان میں نہاتے اور گھڑیال، مگرمچھ

اور خوفناک بھنوروں کا شکار ہوتے رہیں گے۔ یہاں میں ان لوگوں کا تفصیل سے ذکر کرنا نہیں چاہتا جو غسل خانوں میں نہاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم ہے چنانچہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ پنجاب میں جہاں متوسط طبقے کے لوگ کافی تعداد میں ہیں۔ ہر دو ہزار افراد کے لیے صرف ایک غسلخانہ دستیاب ہو سکتا ہے اور بعض اضلاع میں تو تناسب کا یہ فرق بہت بڑھ جاتا ہے۔ چنانچہ محکمہ دیہات سدھار کے اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ ضلع ہوشیارپور میں ایک بھی غسلخانہ نہیں۔

لیکن میں اپنے احباب کے نکتۂ نگاہ کو درست نہیں سمجھتا۔ میں مستقبل کے متعلق اس قدر ناامید نہیں ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ میرا عقیدہ محض اک نام نہاد رسمی رجائیت کے فلسفے پر مبنی ہو۔ لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ دنیا میں یاسیت اور تذبذب میں پڑے ہوئے دلوں نے آج تک کچھ نہیں کیا اور پھر میرے پاس تو پُرامید ہونے کے لیے بہت سی وجہیں ہیں۔ انہیں تفصیل بیان کر دینا چاہتا ہوں۔

(۱) اس سیاسی خلفشار کے زمانہ میں لوگوں کو غسل سے وہ دلچسپی نہیں رہی جو پہلے تھی نہانا ایک انفرادی فعل ہے، اور فسطائیت یا اشتراکیت ہر دو مقبول عمومی فلسفے انفرادیت کو مٹانے پر تلے ہوئے ہیں۔

(۲) جوں جوں تہذیب بڑھتی چلی جا رہی ہے، انسان کو پانی سے نفرت ہوتی جا رہی ہے۔ اور نہانا تو بعض اب نچلے درجوں کی پسماندہ جماعتوں کے لیے رہ گیا ہے۔ وہ شائستہ و مہذب لوگ تو صرف ڈرائی کلین ہی پر اکتفا کرتے ہیں۔ کنوئیں پر نہاتے نہاتے ایک پوربیے کا دوسرے پوربیے سے کہنا "او رے یار، تو نے تو لٹیا ہی ڈبو دی" ذرا خیال کیجیے کتنا قبیح، غریب، افلاس زدہ فقرہ ہے خودداری بلند حوصلگی اور تہذیب سے قطعاً عاری۔ میں تو یہاں تک کہہ سکتا ہوں کہ اگر کوئی مجھے یہ بتا دے کہ وہ دن کے کے بجے نہاتا ہے تو میں یہ وثوق سے بتا سکتا ہوں کہ مکمل تہذیب یافتہ ہونے کے لیے ابھی اُسے کتنے مدارج اور طے کرنے ہیں۔

(۳) مثال کے طور پر ——

صبح چار بجے کون نہاتا ہے؟ —— پوربیا، بنیا، میونسپلٹی کی سڑکوں پر پانی چھڑکنے والا بہشتی!

صبح چھ بجے۔ ڈاکیہ، دفتر کا بابو، پولیس کا سپاہی۔

آٹھ بجے — پروفیسر، کالج کا لڑکا۔

دس بجے — صاحب بہادر، لیڈر

بارہ بجے — منسٹر، مجسٹریٹ، رئیس اعظم

اس کے علاوہ جوں جوں آپ یہ مدارج طے کرتے جائیں گے، آپ دیکھیں گے کہ نہانے میں وقت بتدریج کم صرف ہو رہا ہے، اگر آپ پہلے غسل کرتے وقت آدھ، پون گھنٹہ صرف کرتے تھے۔ تو اب صرف دو منٹ پر آجائیں گے۔ اگر پہلے سارے جسم کو پانی میں بار بار ڈبوتے تھے تو اب صرف چہرہ، ہاتھ اور پاؤں کو تر کر کے "نہانے" سے فارغ ہو جاتے ہیں۔ اور میں تو اُس مہذب زمانے کا انتظار کر رہا ہوں کہ جب لوگ صرف اپنے ہاتھوں کی انگلیاں پانی سے تر کر لیا کریں گے۔ اور پھر فخریہ لہجے میں اپنے احباب سے ذکر کیا کریں گے کہ لو بھئی آج ہم "نہائے" اور یقیناً جس طرح ایک روز ہندوستان کو سوراج حاصل ہوگا۔ اسی طرح وہ دن بھی ضرور آنے والا ہے جب کہ نہانے کی رسم اس ہندوستان جنت نشان سے قطعاً اُٹھ جائے گی۔ صرف کہیں کہیں جس طرح آج کل بعض راسخ الاعتقاد ہندو سنیچر وار کو تیل کی پیالی میں پیسہ ڈال کر اپنا مُنہ دیکھ لیتے ہیں۔ بعض پرانی وضع کے بزرگوار راہ چلتے چلتے ہفتے کے روز پانی کی پیالی میں چہرہ دیکھ لیا کریں گے اور نہایت غرور سے کہا کریں گے: "آج ہم نے تو غسل کر لیا۔ کتنی مدت کے بعد آج پانی میں منہ دیکھنا نصیب ہوا ہے۔ خدا غارت کرے اس نئے زمانے کو۔ آج کل لوگ نہاتے بھی نہیں۔ جب ہم چھوٹے سے تھے تو ہماری اماں ہفتے میں ایک دن ہمارے سارے جسم کو پانی سے تر کر دیا کرتی تھیں اور پتہ نہیں یہ کہاں تک سچ ہے۔ مگر ہمارے دادا جان ذکر کیا کرتے تھے کہ ایک وہ زمانہ تھا کہ جب لوگ ہر روز اپنے جسموں کو پانی میں بھگو لیا کرتے تھے" ایک جھرجھری لے کر "واہ، واہ اُس نہانے میں بھی کیا مزہ ہوگا!"

غُسل کے نقصانات جتانے کی ضرورت نہیں۔ وہ پُرانا عقیدہ کہ غسل کرنے سے مسام کھلتے ہیں۔ بدن صاف رہتا ہے اور جی ہلکا پھلکا رہتا ہے کبھی کا اپنی موت آپ مر چکا۔ میں خود اپنی پچیس سالہ تجرباتی زندگی کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ راوی میں نہانے سے مسام کھلتے نہیں بلکہ جو کھلے ہوں وہ بھی اکثر بند ہو جاتے ہیں اور جی کے ہلکے پھلکے رہنے کے متعلق صرف یہ عرض ہے کہ اگر

غلطی سے راوی کا دو گھونٹ پانی اندر چلا جائے تو ہیضہ ہو جانے کا احتمال رہتا ہے۔ غالباً دریا کے کنارے شمشان بھومی بنانے کی غرض و غایت یہی تھی۔

پھر اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ نہانے سے بدن چست ہوتا ہے اور رنگ نکھرتا ہے تو سائنٹفک نکتہ نگاہ سے اُسے بھی غلط سمجھنا چاہیئے۔ نہانے کے فی الفور بعد بدن چست نہیں ہوتا بلکہ سکڑتا ہے باقی رہا رنگ کا نکھرنا۔ اگر نہانے سے رنگ نکھرتا تو جنوبی ہندوستان کے باشندے کب کے "گورے" بن چکے ہوتے۔ اور سمندر کی ہر ایک مچھلی کا رنگ سفید ہوتا۔ مگر اس کے متعلق ایک کہانی عرض کرنا چاہتا ہوں۔

دریائے تاپتی کے کنارے سات بھائی رہتے تھے۔ وہ بہت لمبے اور نحیف الجسم تھے۔ اُن کے جسم اس قدر کمزور تھے کہ وہ اکثر ڈر کے مارے اپنے گھروں سے باہر نہ نکلتے۔ مبادا ہوا کا کوئی تیز و تند جھونکا انہیں اُڑا کر لے جائے۔ وہ ہر صبح اُٹھ کر اپنے پھونس کے جسموں کو دیکھتے اور قدرت کی کاریگری پر حیران ہوتے جس نے ان کو ابھی تک زندہ رکھا ہوا تھا۔ کوئی دن بھر کلائی پکڑے ہوئے نبض ٹٹولتا رہتا، کوئی اپنے پتلے، کاغذی جسم پر بار بار ہاتھ پھیرتا اور سوچتا یا الٰہی اس جسد خاکی میں سانس کہاں اٹکا ہوا ہے؟

ان کی سات بیویاں تھیں، موٹی، بانجھ اور بدصورت بیویاں، وہ سب کی سب اس قدر کریہہ المنظر تھیں کہ ہر ایک بھائی یہ سوچ کر دل میں کڑھتا رہتا ہو نہ ہو میرے اُس بھائی کی عورت میری بیوی سے قدرے اچھی ہے، اگر وہ مجھے مل جاتی تو کیا ہی اچھا ہوتا؟

سات بھائیوں کے گھر میں نہانے کی رسم قطعاً متروک ہو چکی تھی بھائی تو اس خیال سے نہیں نہاتے تھے کہ چونکہ پانی میں تحلیل کرنے کی قوت بہت زیادہ ہوتی ہے کہیں وہ نہاتے نہاتے پانی میں بالکل حل ہی نہ ہو جائیں۔ اور بیویوں کو اس خیال سے نہانے نہیں دیتے تھے کہ دریائے تاپتی میں گھڑیال بہت رہتے ہیں جو یقیناً موٹے جسموں والی عورتوں کو بہت پسند کریں گے۔

ایک دن تیسرے بھائی کی بیوی کے دل میں شیطان نے یہ خیال اُبھارا کہ اسے ضرور نہانا چاہیئے۔ چنانچہ وہ بیوی دوپہر کے وقت جب سب گھڑیال دریا کے کنارے ریت

پر پڑے سوتے تھے۔ دریا پر گئی اور نہا کر واپس گھر لوٹ آئی۔ جب وہ نہا کر لوٹی تو اس نے اپنے سیاہ بال پیٹھ پر پھیلائے ہوئے تھے، اس کے چہرے پر ایک عجیب چمک تھی، اور اس کے پاؤں زمین پر نہ پڑتے تھے۔

جب بھائیوں نے اُسے دیکھا تو بیتاب ہو گئے۔ آپس میں لڑنے جھگڑنے لگے، یہ میری بیوی ہے، نہیں یہ میری بیوی بنے گی، اسے میں لوں گا، اسے میں لے لوں گا گالی گلوچ سے گالی گلوچ سے نوبت دھول دھپا تک پہنچی، طمانچوں کا لگنا تھا کہ سارے بھائی چند لمحوں میں جاں بحق ہو گئے، اور بیویاں بیوائیں بن گئیں، اور جب گھڑیالوں کو یہ خبر لگی تو تاپتی کے کنارے سے رینگ رینگ کر آئے اور ساتوں بیواؤں کو زندہ نگل گئے۔

آج دریائے تاپتی کے کنارے صرف ایک پھونس کا بڑا سا جھونپڑا پڑا ہے جس میں آدھی رات کے وقت کبھی کبھی یہ ہولناک صدائیں بلند ہوتی ہیں "اسے میں نہ دوں گا، اسے میں نہ دوں گا، یہ میری ہے، یہ میری ہے!"

نتیجہ: نہانا اخلاقی جرم ہے

آخر میں آپ استفسار کریں گے یہ تو مولانے درست کہ نہانا ایک قبیح رسم ہے، اسے ملیامیٹ کر دینا ہی بہتر ہوگا۔ اس کے خلاف پُرزور پروپیگنڈا کیا جانا چاہیے مگر صاحب یہ تو سب وقتی، رسمی، ہنگامی باتیں ہیں، آخر آپ کا "پروگرام" کیا ہے، بغیر پروگرام کے آج کل کوئی تحریک کامیاب نہیں ہوتی۔

لگے ہاتھوں وہ بھی سن لیجئے۔

۱۔ جو امیر شخص نہائے اُسے سماج سے باہر نکال دیا جائے۔

۲۔ دفعہ ۴۴ الف میں یہ الفاظ ایزاد کئے جائیں:

"ہرگاہ کہ ہمارے نوٹس میں آیا ہے وغیرہ وغیرہ .... جو غریب شخص غسل کرتا ہوا یا نہاتا ہوا پکڑا جائے گا۔ اُسے فی الفور گولی سے ہلاک کر دیا جائے گا۔"

میں ابھی یہاں تک لکھنے پایا تھا کہ گنگو میرے سامنے میز کا کنارہ پکڑ کر کھڑا ہو گیا، اور بولا۔

"بابو جی، غسل خانے میں پانی دھرا ہے، آپ جلدی نہا لیں، ورنہ پانی ٹھنڈا

ہو جائے گا۔"

میں قلم چھوڑ، میز کی دراز سے ایک تولیہ نکال کر، یہ شعر گنگناتا ہوا غسل خانے کی طرف بھاگ گیا۔

جو نہاؤ گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں والو

کُتّے

پطرس بخاری

علم الحیوانات کے پروفیسروں سے پوچھا، سلوتریوں سے دریافت کیا، خود سر کھپاتے رہے۔ لیکن کبھی سمجھ میں نہ آیا کہ آخر کتوں کا فائدہ کیا ہے؟ گائے کو لیجیے دودھ دیتی ہے، بکری کو لیجیے دودھ دیتی ہے اور مینگنیاں بھی۔ یہ کتے کیا کرتے ہیں! کہنے لگے کہ کتا وفادار جانور ہے۔ اب جناب اگر وفاداری اسی کا نام ہے کہ شام کے سات بجے جو بھونکنا شروع کیا تو لگاتار بغیر دم لیے صبح کے چھ بجے تک بھونکتے چلے گئے، تو ہم لنڈورے ہی بھلے۔ کل ہی کی بات ہے کہ رات کے کوئی گیارہ بجے ایک کتے کی طبیعت جو ذرا گدگدائی تو انھوں نے باہر سڑک پر آکر طرح کا ایک مصرع دیا۔ ایک آدھ منٹ کے بعد سامنے کے بنگلے میں سے ایک کتے نے مقطع عرض کر دیا۔ اب جناب ایک کہنہ مشق استاد کو جو غصہ آیا، ایک حلوائی کے چولھے میں سے باہر لپکے اور بھنّا کے پوری غزل مقطع تک کہہ گئے۔ اس پر شمال مشرق کی طرف سے ایک قدر شناس کتے نے زوروں کی داد دی، اب تو حضرت وہ مشاعرہ گرم ہوا۔ کچھ نہ پوچھیے کم بخت بعض تو دو غزلے لکھ لائے تھے کئی ایک نے فی البدیہہ قصیدے کے قصیدے پڑھ

ڈالے۔ وہ ہنگامہ ہوا کہ ٹھنڈا ہونے میں نہ آتا تھا ہم نے کھڑکی میں سے ہزاروں دفعہ "آرڈر، آرڈر" پکارا، لیکن ایسے موقعوں پر پردھان کی بھی کوئی نہیں سنتا۔ اب ان سے پوچھیے کہ میاں تمہیں ایسا ہی ضروری مشاعرہ کرنا تھا تو دریا کے کنارے کھلی ہوا میں جا کر طبع آزمائی کرتے یہ گھروں کے درمیان آ کر سوتوں کو ستانا کون سی شرافت ہے اور پھر ہم دیسی لوگوں کے کتے بھی کچھ عجیب بدتمیز واقع ہوئے ہیں اکثر تو ان میں ایسے قوم پرست ہیں کہ پتلون کوٹ کو دیکھ کر بھونکنے لگ جاتے ہیں خیر یہ تو ایک حد تک قابل تعریف بات ہے اس کا ذکر ہی جانے دیجیے اس کے علاوہ ایک اور بات ہے یعنی ہمیں بارہا ڈالیاں لے کر صاحب لوگوں کے بنگلے پر جانے کا اتفاق ہوا ہے۔ خدا کی قسم ان کتوں میں شائستگی دیکھی ہے کہ عش عش کرتے لوٹ آئے ہیں۔ جونہی ہم بنگلے کے دروازے میں داخل ہوئے کتے نے برآمدے ہی میں کھڑے کھڑے ایک ہلکی سی "بخ" کر دی۔ اور پھر منہ بند کر کے کھڑا ہو گیا۔ ہم آگے بڑھے تو اس نے بھی چار قدم آگے بڑھ کر ایک نازک اور پاکیزہ آواز میں "بخ" کر دی' چوکیداری کی چوکیداری، موسیقی کی موسیقی۔ ہمارے کتے ہیں کہ نہ راگ نہ سُر، نہ سر نہ پیر، تان پر تان لگائے جاتے ہیں، بے تالے کہیں کے: نہ موقع دیکھتے ہیں نہ وقت پہچانتے ہیں گلے بازی کیے جاتے ہیں۔ گھمنڈ اس بات پر ہے کہ تان سین اسی ملک میں تو پیدا ہوا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارے تعلقات کتوں سے ذرا کشیدہ ہی رہے ہیں لیکن ہم سے قسم لیجیے جو ایسے موقع پر ہم نے کبھی ستیہ گرہ سے منہ موڑا ہو شاید آپ اس کو تعلی سمجھیں۔ لیکن خدا شاہد ہے کہ آج تک کبھی کسی کتے پر ہاتھ اٹھ ہی نہ سکا اکثر دوستوں نے صلاح دی کہ رات کے وقت لاٹھی چھڑی ضرور ہاتھ میں رکھنی چاہیے کہ دافع بلیات ہے لیکن ہم کسی سے خواہ مخواہ عداوت پیدا کرنا نہیں چاہتے کتے کے بھونکتے ہی ہماری طبعی شرافت ہم پر اس درجہ غلبہ پا جاتی ہے کہ آپ ہمیں اگر اس وقت دیکھیں تو یقیناً یہی سمجھیں گے کہ ہم بزدل ہیں۔ شاید آپ اس وقت یہ بھی اندازہ لگا لیں کہ ہمارا گلا خشک ہوا جاتا ہے یہ البتہ ٹھیک ہے ایسے موقع پر کبھی میں گانے کی کوشش کروں تو کھرج کے سروں کے سوا اور کچھ نہیں نکلتا اگر آپ نے بھی ہم جیسی طبیعت پائی ہو تو آپ دیکھیں گے ایسے موقع پر آیۃ الکرسی آپ کے ذہن

سے اتر جائے گی۔ اس کی جگہ شاید آپ دعائے قنوت پڑھنے لگ جائیں۔

بعض اوقات ایسا بھی اتفاق ہوا ہے کہ رات کے دو بجے چھڑی گھماتے تھیٹر سے واپس آ رہے ہیں اور ناٹک کی کسی نہ کسی گیت کی طرز ذہن میں بٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ چوں کہ گیت کے الفاظ یاد نہیں، اور نو مشقی کا عالم بھی ہے اس لیے سیٹی پر اکتفا کی ہے کہ بے سرے بھی ہو گئے تو کوئی یہی کہے گا کہ انگریزی موسیقی ہے، اتنے میں ایک موڑ پر سے جو مڑے تو سامنے ایک بکری بندھی تھی۔ ذرا تصور ملاحظہ ہو۔ آنکھوں نے اسے بھی کتا دیکھا۔ ایک تو کتا پھر بکری کی جسامت کا گویا بہت ہی بڑا کتا۔ بس ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ چھڑی کی گردش دھیمی ہوتے ہوتے ایک نہایت ہی نامعقول زاویے پر ہوا میں کہیں ٹھہر گئی۔ سیٹی کی موسیقی بھی تھرتھرا کر خاموش ہو گئی۔ لیکن کیا مجال جو ہماری تھوتھنی کی مخروطی شکل میں ذرا بھی فرق آیا ہو۔ گویا ایک بے آواز لے۔ ابھی تک نکل رہی ہے۔ طب کا مسئلہ ہے کہ ایسے موقعوں پر اگر سردی کے موسم میں بھی پسینہ آ جائے تو کوئی مضائقہ نہیں بعد میں پھر سوکھ جاتا ہے۔

چونکہ ہم طبعاً ذرا محتاط ہیں۔ اسی لیے آج تک کتے کے کاٹنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا۔ یعنی کسی کتے نے آج تک ہم کو کبھی نہیں کاٹا۔ اگر ایسا سانحہ کبھی پیش آیا ہوتا تو اس سرگزشت کی بجائے آج ہمارا مرثیہ چھپ رہا ہوتا تاریخی مصرعہ دعائیہ ہوتا کہ اس کتے کی مٹی سے بھی کتا گھاس پیدا ہو لیکن ؎

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے سگِ رہ بری بلا ہے
مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

جب تک اس دنیا میں کتے موجود ہیں اور بھونکنے پر مصر ہیں سمجھ لیجیے کہ ہم قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں اور پھر ان کتوں کے بھونکنے کے اصول بھی تو کچھ نرالے ہیں یعنی ایک تو متعدی مرض ہے اور پھر بچوں بوڑھوں سبھی کو لاحق ہے اگر کوئی بھاری بھرکم اسفندیار کتا کبھی کبھی اپنے رعب اور دبدبے کو قائم رکھنے کے لیے بھونک لے تو ہم بھی چار و ناچار کہہ دیں کہ بھئی بھونک (اگرچہ ایسے وقت میں اس کو زنجیر سے بندھا ہونا چاہیے) لیکن یہ کم بخت دو روزہ

سے روزہ دو دو تین تین تولے کے پلے بھی بھونکنے سے باز نہیں آتے، باریک آواز ذرا سا پھیپھڑا اس پر بھی اتنا زور لگا کر بھونکتے ہیں کہ آواز کی لرزش دم تک پہنچتی ہے اور پھر بھونکتے ہیں چلتی موٹر کے سامنے آ کر گویا اسے روک ہی تو لیں گے! اب اگر یہ خاکسار موٹر چلا رہا ہو تو قطعاً ہاتھ کام کرنے سے انکار کر دیں، لیکن ہر کوئی یوں ان کی جان بخشی تھوڑا ہی کر دے گا۔

کتوں کے بھونکنے پر مجھے سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ ان کی آواز سوچنے کے تمام قویٰ کو معطل کر دیتی ہے، خصوصاً جب کسی دکان کے تختے کے نیچے سے ان کا ایک پورا خفیہ جلسہ باہر سڑک پر آ کر تبلیغ کا کام شروع کر دے۔ تو آپ ہی کہیے ہوش ٹھکانے رہ سکتے ہیں؟ ہر ایک طرف باری باری متوجہ ہونا پڑتا ہے کچھ ان کا شور کچھ ہماری صدائے احتجاج (زیر لب) بے ڈھنگی حرکات و سکنات (حرکات ان کی، سکنات ہماری) اس ہنگامے میں دماغ بھلا خاک کام کر سکتا ہے؟ اگرچہ یہ مجھے بھی نہیں معلوم کہ اگر ایسے موقع پر دماغ کام کرے بھی تو کیا تیر مارے گا؟ بہرحال کتوں کی یہ پرلے درجے کی ناانصافی میرے نزدیک ہمیشہ قابل نفرین رہی ہے اگر ان کا ایک نمائندہ شرافت کے ساتھ ہم سے آ کر کہہ دے کہ عالی جناب سڑک بند ہے تو خدا کی قسم ہم بغیر چوں و چرا کیے واپس لوٹ جائیں اور یہ کوئی نئی بات نہیں۔ ہم نے کتوں کی درخواست پر کئی راتیں سڑکیں ناپنے میں گذار دی ہیں لیکن پوری مجلس کا یوں متفقہ و متحدہ طور پر سینہ زوری کرنا ایک کمینی حرکت ہے (قارئین کرام کی خدمت میں یہ عرض ہے کہ ان کا کوئی عزیز و محترم کتا کمرے میں موجود ہو تو یہ مضمون بلند آواز سے نہ پڑھا جائے مجھے کسی کی دل شکنی مطلوب نہیں) خدا نے ہر قوم میں نیک افراد بھی پیدا کیے ہیں۔ کتے اس کلیے سے مستثنیٰ نہیں آپ نے خدا ترس کتا بھی ضرور دیکھا ہوگا عموماً اس کے جسم پر تپسیا کے اثرات ظاہر ہوتے ہیں جب چلتا ہے تو اس مسکینی اور عجز سے گویا بارِ گناہ کا احساس آنکھ نہیں اٹھانے دیتا، دم اکثر پیٹ کے ساتھ لگی ہوتی ہے۔ سڑک کے بیچوں بیچ غور و فکر کے لیے لیٹ جاتا ہے اور آنکھیں بند کر لیتا ہے شکل بالکل فلاسفروں کی سی اور شجرہ دیو جانس کلبی سے ملتا ہے۔ کسی گاڑی والے نے متواتر بگل بجایا، گاڑی کے مختلف حصوں کو کھٹکھٹایا، لوگوں سے کہلوایا، خود دس بارہ دفعہ آوازیں دیں۔ تو آپ نے سر کو وہیں

زمین پر رکھے سُرخ مخمور آنکھوں کو کھولا۔ صورت حالات کو ایک نظر دیکھا اور پھر آنکھیں بند کرلیں۔ کسی نے ایک چابک لگایا تو آپ نہایت اطمینان کے ساتھ وہاں سے اُٹھ کر ایک گز پر جا لیٹے اور خیالات کے سلسلے کو جہاں سے وہ ٹوٹ گیا تھا وہیں سے پھر شروع کر دیا۔ کسی بائیسکل والے نے گھنٹی بجائی تو لیٹے ہی لیٹے سمجھ گئے کہ بائیسکل ہے ایسی چھچھوری چیزوں کے لیے وہ راستہ چھوڑ دینا فقیری کی شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔

رات کے وقت یہی کتا اپنی خشک پتلی سی دم کو تا بحدِ امکان سڑک پر پھیلا کر رکھتا ہے اس سے محض خدا کے برگزیدہ بندوں کی آزمائش مقصود ہوتی ہے جہاں آپ نے غلطی سے اس پر پاؤں رکھ دیا انھوں نے غیظ و غضب کے لہجے میں آپ سے پرسش شروع کر دی، بچّا فقیروں کو چھیڑتا ہے نظر نہیں آتا ہم سادھو لوگ یہاں بیٹھے ہیں بس اس فقیر کی بد دعا سے اُسی وقت رعشہ شروع ہو جاتا ہے بعد میں کئی راتوں تک یہی خواب نظر آتے رہتے ہیں کہ بے شمار کتے ٹانگوں سے لپٹے ہوئے ہیں اور جانے نہیں دیتے آنکھ کھلتی ہے تو پاؤں چارپائی کے ادوائن میں پھنسے ہوتے ہیں۔

اگر خدا مجھے کچھ عرصے کے لیے اعلیٰ قسم کے بھونکنے اور کاٹنے کی طاقت عطا فرمائے تو جنونِ انتقام میرے پاس کافی مقدار میں ہے۔ رفتہ رفتہ سب کتّے علاج کے لیے کسولی پہنچ جائیں۔ ایک شعر ہے ؎

عرفی تو میندیش زغوغائے رقیباں
آوازِ سگاں کم نہ کند رزقِ گدارا

یہی وہ خلافِ فطرت شاعری ہے جو ایشیا کے لیے باعثِ ننگ ہے۔ انگریزی میں ایک مثل ہے کہ بھونکتے ہوئے کتّے کاٹا نہیں کرتے، یہ بجا سہی لیکن کون جانتا ہے کہ ایک بھونکتا ہوا کتّا کب بھونکنا بند کر دے اور کاٹنا شروع کر دے۔

میں ایک میاں ہوں

پطرس بخاری

میں ایک میاں ہوں۔ مطیع و فرمانبردار۔ اپنی بیوی روشن آرا کو اپنی زندگی کی ہر ایک بات سے آگاہ کرنا اصولِ زندگی سمجھتا ہوں۔ اور ہمیشہ سے اس پر کاربند رہا ہوں۔ خدا میرا انجام بخیر کرے۔

چنانچہ میری اہلیہ میرے دوستوں کی تمام عادات و خصائل سے واقف ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ میرے دوست جتنے مجھ کو عزیز ہیں اتنے ہی روشن آرا کو بُرے لگتے ہیں میرے احباب کی جن اداؤں نے مجھے مسحور کر رکھا ہے۔ انھیں میری اہلیہ ایک شریف انسان کے لیے باعثِ ذلت سمجھتی ہے۔

آپ کہیں یہ نہ سمجھ لیں کہ خدانخواستہ وہ کوئی ایسے آدمی ہیں۔ جن کا ذکر کسی معزز مجمع میں نہ کیا جا سکے۔ کچھ اپنے ہنر کے طفیل اور کچھ خاکسار کی صحبت کی بدولت سب کے سب ہی سفید پوش ہیں۔ لیکن اس بات کو کیا کروں کہ ان کی دوستی میرے گھر کے امن میں اس قدر خلل انداز ہوتی ہے کہ کچھ کہہ نہیں سکتا۔

مثلاً مرزا صاحب ہی کو لے لیجیے۔ اچھے خاصے بھلے آدمی ہیں۔ گو محکمۂ جنگلات میں ایک معقول عہدے پر ممتاز ہیں۔ لیکن شکل وصورت ایسی پاکیزہ پائی ہے کہ امام مسجد معلوم ہوتے ہیں جوا نہیں کھیلتے۔ گلی ڈنڈے کا ان کو شوق نہیں۔ جیب کترتے ہوئے کبھی وہ نہیں پکڑے گئے۔ البتہ کبوتر پال رکھے ہیں۔ انھی سے جی بہلاتے ہیں ہماری اہلیہ کی یہ کیفیت ہے کہ محلے کا کوئی بدمعاش جوئے میں قید ہوجائے۔ تو اس کی ماں کے پاس ماتم پرسی تک کو چلی جاتی ہیں۔ گلی ڈنڈے میں کسی کی آنکھ پھوٹ جائے تو مرہم پٹی کرتی رہتی ہیں۔ کوئی جیب کترا پکڑا جائے۔ تو گھنٹوں آنسو بہاتی رہتی ہیں۔ لیکن وہ بزرگ جن کی دنیا بھر کی زبان مرزا صاحب مرزا صاحب کہتے تھکتی ہے۔ ہمارے گھر میں "موئے میں ایک میاں ہوں"

"کبوتر باز" کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں کبھی بھولے سے بھی آسمان کی طرف نظر اٹھا کر کسی چیل، کوے، گدھ، شکرے کو دیکھنے لگ جاؤں۔ تو روشن آرا کو فوراً خیال ہوجاتا ہے کہ بس اب یہ بھی کبوتر باز بننے لگا۔

اس کے بعد مرزا صاحب کی شان میں ایک قصیدہ شروع ہوجاتا ہے۔ بیچ میں میری جانب گریز کبھی لمبی بحر میں کبھی چھوٹی بحر میں۔

ایک دن جب یہ واقعہ پیش آیا۔ تو میں نے مصمم ارادہ کرلیا کہ اس مرزا کمبخت کو کبھی پاس نہ پھٹکنے دوں گا۔ آخر گھر سب سے مقدم ہے۔ میاں بیوی کے باہمی اخلاص کے مقابلے میں دوستوں کی خوشنودی کیا چیز ہے؟ چنانچہ ہم غصے میں بھرے ہوئے مرزا صاحب کے گھر گئے۔ دروازہ کھٹکھٹایا کہنے لگے اندر آجاؤ۔ ہم نے کہا نہیں آتے تم باہر آؤ۔ خیر آخر اندر گیا۔ بدن پر تیل مل کر ایک کبوتر کی چونچ منہ میں لیے دھوپ میں بیٹھے تھے۔ کہنے لگے۔ بیٹھ جاؤ۔ ہم نے کہا بیٹھیں گے نہیں۔ آخر بیٹھ گئے۔ معلوم ہوتا ہے ہمارے تیور کچھ بگڑے ہوئے تھے۔ مرزا بولے۔ کیوں بھئی خیر باشد! میں نے کہا کچھ نہیں کہنے لگے۔ اس وقت کیسے آنا ہوا؟

اب میرے دل میں فقرے کھولنے شروع ہوئے پہلے ارادہ کیا کہ ایک دم ہی سب کچھ کہہ ڈالو اور چل دو۔ پھر سوچا کہ مذاق سمجھے گا۔ اسی لیے کسی ڈھنگ سے بات شروع کرو لیکن سمجھ میں نہ آیا کہ پہلے کیا کہیں۔ آخر ہم نے کہا:

"مرزا بھئی! کبوتر بہت مہنگے ہوتے ہیں!"

یہ سنتے ہی مرزا صاحب نے چین سے لے کر امریکہ تک کے تمام کبوتروں کو ایک ایک کرکے گنوانا شروع کیا۔ اس کے بعد دانے کی مہنگائی کے متعلق گل افشانی کرتے رہے اور پھر محض مہنگائی پر تقریر کرنے لگے۔ اس دن تو ہم یونہی چلے آئے لیکن ابھی کھٹ پٹ کا ارادہ دل میں باقی تھا۔ خدا کا کرنا ہوا کہ شام کو گھر میں ہماری صلح ہوگئی۔ ہم نے کہا۔ چلو اب مرزا کے ساتھ بگاڑنے سے کیا حاصل؟ چنانچہ دوسرے دن مرزا سے بھی صلح صفائی ہوگئی۔

لیکن میری زندگی تلخ کرنے کے لیے ایک نہ ایک دوست ہمیشہ کار آمد ہوتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فطرت نے میری طبیعت میں قبولیت اور صلاحیت کوٹ کوٹ کر بھر دی ہے کیونکہ ہماری اہلیہ کو ہم میں ہر وقت کسی نہ کسی دوست کی عادات قبیحہ کی جھلک نظر آتی ہے۔ یہاں تک کہ میری اپنی ذاتی شخصی سیرت بالکل ناپید ہوچکی ہے۔

شادی سے پہلے ہم کبھی کبھی دس بجے اٹھا کرتے تھے ورنہ گیارہ بجے۔ اب کتنے بجے اٹھتے ہیں؟ اس کا اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جن کے گھر ناشتہ زبردستی صبح کے سات بجے کرا دیا جاتا ہے۔ اور اگر ہم کبھی بشری کمزوری کے تقاضے سے مرغوں کی طرح تڑکے اٹھنے میں کوتاہی کریں۔ تو فوراً کہہ دیا جاتا ہے کہ اس نکھٹو نسیم کی صحبت کا نتیجہ ہے ایک دن صبح صبح ہم نہا رہے تھے۔ سردی کا موسم۔ ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے۔ صابن سر سے ملتے تھے۔ تو ناک میں گھستا تھا کہ اتنے میں ہم نے خدا جانے کس پراسرار جذبے کے ماتحت غسل خانے میں الاپنا شروع کیا۔ اور پھر گانے لگے کہ "توری چھل بل ہے نیاری......" اس کو ہماری انتہائی بدمذاقی سمجھا گیا اور اس بدمذاقی کا اصل منبع ہمارے دوست پنڈت جی کو ٹھہرایا گیا۔

لیکن حال ہی میں مجھ پر ایک ایسا سانحہ گزرا ہے کہ میں نے تمام دوستوں کو ترک کردینے کی قسم کھالی ہے۔

تین چار دن کا ذکر ہے کہ صبح کے وقت روشن آرا نے مجھ سے میکے جانے کے لیے اجازت مانگی۔ جب سے ہماری شادی ہوئی ہے۔ روشن آرا صرف دو دفعہ میکے گئی ہے اور

پھر اُس نے کچھ اس سادگی اور عجز سے کہا کہ میں انکار نہ کر سکا۔ کہنے لگی تو پھر میں ڈیڑھ بجے کی گاڑی سے چلی جاؤں؟ میں نے کہا اور کیا؟

وہ جھٹ تیاری میں مشغول ہو گئی اور میرے دماغ میں آزادی کے خیالات نے چکر لگانے شروع کیے۔ یعنی اب بیشک دوست آئیں۔ بیشک اودھم مچائیں میں بیشک کھاؤں۔ بیشک جب چاہوں اُٹھوں۔ بیشک تھیٹر جاؤں میں نے کہا۔

"روشن آرا جلدی کرو۔ نہیں گاڑی چھوٹ جائے گی"

ساتھ اسٹیشن پر گیا۔ جب گاڑی میں سوار کر چکا تو کہنے لگی "خط ضرور لکھتے رہیے۔"

میں نے کہا "ہر روز اور تم بھی!"

"کھانا وقت پر کھا لیا کیجیے۔ اور ہاں دُھلی ہوئی جُرابیں اور رومال الماری کے نچلے خانے میں پڑے ہیں۔"

اس کے بعد ہم دونوں خاموش ہو گئے۔ اور ایک دوسرے کے چہرے کو دیکھتے رہے اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ میرا دل بھی بے تاب ہونے لگا اور جب گاڑی روانہ ہوئی۔ تو میں دیر تک مبہوت پلیٹ فارم پر کھڑا رہا۔

آخر آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا ہوا کتابوں کی دوکان تک آیا۔ اور رسالوں کے ورق پلٹ پلٹ کر تصویریں دیکھتا رہا۔ ایک اخبار خریدا۔ تہ کر کے جیب میں ڈالا۔ اور عادت کے مطابق گھر کا ارادہ کر لیا۔

پھر خیال آیا کہ اب گھر جانا ضروری نہیں رہا۔ اب جہاں چاہوں جاؤں چاہوں تو گھنٹوں اسٹیشن پر ٹہلتا رہوں۔ دل چاہتا تھا قلابازیاں کھاؤں۔

کہتے ہیں جب افریقہ کے وحشیوں کو کسی تہذیب یافتہ ملک میں کچھ عرصہ رکھا جاتا ہے تو گو وہ وہاں کی شان و شوکت سے بہت متاثر ہوتے ہیں لیکن جب واپس جنگلوں میں پہونچتے ہیں تو خوشی کے مارے چیخیں مارتے ہیں۔ کچھ ایسی ہی کیفیت میرے دل کی بھی ہو رہی تھی۔ بھاگتا ہوا اسٹیشن سے آزادانہ باہر نکلا۔ آزادی کے لہجے میں تانگے والے کو بلایا اور کود کر تانگے میں سوار ہو گیا۔ سگریٹ سلگایا ٹانگیں سیٹ پر پھیلا دیں۔

اور کلب کو روانہ ہو گیا۔

رستے میں ایک بہت ضروری کام یاد آ گیا۔ تانگہ موڑ کر گھر کی طرف پلٹا۔ باہر ہی سے نوکر کو آواز دی۔

"امجد۔"

"حضور!"

"دیکھو حجام کو جا کے کہہ دو کہ کل گیارہ بجے آئے۔"

"بہت اچھا۔"

"گیارہ بجے سن لیا نا؟ کہیں روز کی طرح پھر چھ بجے وارد نہ ہو جائے۔"

"بہت اچھا حضور۔"

"اور اگر گیارہ بجے سے پہلے آئے۔ تو دھکّے دے کر باہر نکال دو۔"

یہاں سے کلب پہونچے۔ آج تک کبھی دن کے دو بجے کلب نہ گیا تھا۔ اندر داخل ہوا تو سنسان آدمی کا نام نشان تک نہیں۔ سب کمرے دیکھ ڈالے۔ بلیرڈ کا کمرہ خالی شطرنج کا کمرہ خالی۔ تاش کا کمرہ خالی۔ صرف کھانے کے کمرے میں ایک ملازم چھریاں تیز کر رہا تھا۔

اس سے پوچھا "کیوں بے آج کوئی نہیں آیا؟"

کہنے لگا "حضور آپ جانتے ہیں اس وقت بھلا کون آتا ہے؟"

بہت مایوس ہوا۔ باہر نکل کر سوچنے لگا۔ کہ اب کیا کروں؟ اور کچھ نہ سوجھا تو وہاں سے مرزا صاحب کے گھر پہونچا معلوم ہوا۔ ابھی دفتر سے واپس نہیں آئے دفتر پہونچا۔ دیکھ کر بہت حیران ہوئے۔ میں نے سب حال بیان کیا۔ کہنے لگے۔ تم باہر کے کمرے میں ٹھہرو تھوڑا سا کام رہ گیا ہے۔ بس ابھی بھگتا کے تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔ شام کا پروگرام کیا ہے؟"

میں نے کہا "تھیٹر!"

کہنے لگے "بس بہت ٹھیک ہے تم باہر بیٹھو میں ابھی آیا۔"

باہر کے کمرے میں ایک چھوٹی سی کرسی پڑی تھی۔ اس پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگا۔ اور جیب سے اخبار نکال کر پڑھنا شروع کر دیا۔ شروع سے آخر تک سب پڑھ ڈالا۔ اور ابھی

چار بجنے میں ایک گھنٹہ باقی تھا۔ پھر سے پڑھنا شروع کیا۔ سب اشتہار پڑھ ڈالے۔ اور پھر سب اشتہاروں کو دوبارا پڑھ ڈالا۔

آخرکار اخبار پھینک کر بغیر کسی تکلف یا لحاظ کے جمائیاں لینے لگا۔ جمائی پہ جمائی جمائی پر جمائی۔ حتیٰ کہ جبڑوں میں درد ہونے لگا۔

اس کے بعد ٹانگیں ہلانا شروع کیا۔ لیکن اس سے بھی تھک گیا۔

پھر میز پر طبلے کی گتیں بجاتا رہا۔

بہت تنگ آگیا تو دروازہ کھول کر مرزا سے کہا۔

"ابے یار اب چلتا بھی ہے کہ مجھے انتظار ہی میں مار ڈالے گا؟ مردود کہیں کا۔ سارا دن میرا ضائع کر دیا۔

وہاں سے اٹھ کر مرزا کے گھر گئے۔ شام بڑے لطف میں کٹی۔ کھانا کلب میں کھایا اور وہاں سے دوستوں کو ساتھ لیے تھیٹر گئے۔ رات کے ڈھائی بجے گھر لوٹے۔ تکئے پر سر رکھا ہی تھا کہ نیند نے بے ہوش کر دیا۔

صبح ہی آنکھ کھلی۔ تو کمرے میں دھوپ لہریں مار رہی تھیں۔ گھڑی کو دیکھا تو پونے گیارہ بجے تھے۔ ہاتھ بڑھا کر میز پر سے ایک سگریٹ اٹھایا۔ اور سلگا کر طشتری میں رکھ دیا اور پھر اونگھنے لگا۔

گیارہ بجے امجد کمرے میں داخل ہوا۔ کہنے لگا۔

"حضور حجام آیا ہے"

ہم نے کہا۔ "یہیں بلا لاؤ" یہ عیش مدت کے بعد نصیب ہوا کہ بستر میں لیٹے لیٹے حجامت بنوالیں۔ اطمینان سے اٹھے اور نہا دھو کر باہر جانے کے لیے تیار ہوئے لیکن طبیعت میں وہ شگفتگی نہ تھی۔ جس کی امید لگائے بیٹھے تھے۔ چلتے وقت الماری سے رومال نکالا۔ تو خدا جانے دل میں کیا خیال آیا۔ وہیں کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور سودائیوں کی طرح رومال کو تکتا رہا۔ الماری کا ایک اور خانہ کھولا تو سرمئی رنگ کا ایک ریشمی دوپٹہ نظر پڑا۔ باہر نکالا۔ ہلکی ہلکی عطر کی خوشبو آرہی تھی۔ بہت دیر تک اس پر ہاتھ پھیرتا رہا۔ دل بھر آیا۔ گھر سونا معلوم

ہونے لگا۔ بہتیرا اپنے آپ کو سنبھالا لیکن آنسو ٹپک ہی پڑے۔ آنسوؤں کا گرنا تھا کہ بیتاب ہو گیا اور سچ مچ رونے لگا۔ سب جوڑے باری باری نکال کر دیکھے لیکن نہ معلوم کیا کیا یاد آیا اور بھی بے قرار ہوتا گیا۔

آخر نہ رہا گیا۔ باہر نکلا اور سیدھا تار گھر پہونچا۔ وہاں سے تار دیا کہ "میں بہت اداس ہوں۔ تم فوراً آجاؤ۔"

تار دینے کے بعد دل کو اطمینان ہوا یقین تھا کہ روشن آرا اب جس قدر جلد ہو سکے گا آجائے گی۔ اس سے کچھ ڈھارس بندھ گئی۔ اور دل پر سے جیسے ایک بوجھ ہٹ گیا۔

دوسرے دن دوپہر کو مرزا کے مکان پر تاش کا معرکہ گرم ہونا تھا۔ وہاں پہونچے تو معلوم ہوا کہ مرزا کے والد سے کچھ لوگ ملنے آئے ہیں۔ اس لیے تجویز یہ ٹھہری کہ یہاں سے کسی اور جگہ سرک چلو۔ ہمارا مکان تو خالی تھا ہی۔ سب یار لوگ وہیں جمع ہوئے امجد سے کہہ دیا گیا کہ حقے میں اگر ذرا بھی خلل واقع ہوا تو تمہاری خیر نہیں۔ اور پان اس طرح سے متواتر پہونچتے رہیں کہ بس تانتا لگ جائے۔

اب اس کے بعد کے واقعات کو کچھ مرد ہی اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ شروع شروع میں تو تاش باقاعدہ اور باضابطہ ہوتا رہا۔ جو کھیل بھی کھیلا گیا۔ بہت معقول طریقے سے۔ قواعد و ضوابط کے مطابق اور متانت و سنجیدگی کے ساتھ۔ لیکن ایک دو گھنٹے کے بعد کچھ خوش طبعی شروع ہوئی۔ یار لوگوں نے ایک دوسرے کے پتے دیکھنے شروع کر دیئے۔ یہ حالت تھی کہ آنکھ بچی نہیں اور ایک آدھ کام کا پتہ اڑا نہیں۔ اور ساتھ ہی قہقہے پر قہقہے اڑنے لگے۔ تین گھنٹے کے بعد یہ حالت تھی کہ کوئی گھٹنا ہلا ہلا کر گا رہا ہے۔ کوئی فرش پر بازو ٹیکے سیٹی بجا رہا ہے۔ کوئی تھیٹر کا ایک آدھ مذاقیہ فقرہ لاکھوں دفعہ دہرا رہا ہے۔ لیکن تاش برابر ہو رہا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد دھول دھپا شروع ہوا۔ ان خوش فعلیوں کے دوران میں ایک مسخرے نے ایک ایسا کھیل تجویز کر دیا۔ جس کے آخر میں ایک آدمی بادشاہ بن جاتا۔ دوسرا وزیر تیسرا کوتوال۔ اور جو سب سے ہار جاتا ہے وہ چور۔ سب نے کہا: "واہ واہ کیا بات کہی ہے!" ایک بولا: "پھر آج جو چور بنا۔ اس کی شامت آجائے گی" دوسرے نے کہا "اور نہیں تو کیا۔ بھلا ایسا ویسا کھیل ہے سلطنتوں کے

معاملے ہیں، سلطنتوں کے!"

کھیل شروع ہوا۔ بدقسمتی سے ہم چور بن گئے۔ طرح طرح کی سزائیں تجویز ہونے لگیں۔ کوئی کہے "ننگے پاؤں بھاگتے ہوئے جائیے اور حلوائی کی دکان سے مٹھائی خرید کے لائیے" کوئی کہے "نہیں حضور" سب کے پاؤں پڑے۔ اور ہر ایک کے دو دو چانٹے کھائیے" دوسرے نے کہا۔ نہیں صاحب ایک پاؤں پر کھڑا ہو کر ہمارے ساتھ ناچئے" آخر میں بادشاہ سلامت بولے "ہم حکم دیتے ہیں کہ چوکور کاغذ کی ایک لمبوتری نوک دار ٹوپی پہنائی جائے اور اس کے چہرے پر سیاہی مل دی جائے۔ اور یہ اسی حالت میں جا کر اندر سے حقے کی چلم بھر کر لائے" سب نے کہا "کیا دماغ پایا ہے حضور نے۔ کیا سزا تجویز کی ہے واہ، واہ!"

ہم بھی مزے میں آئے ہوئے تھے۔ ہم نے کہا۔ تو ہوا کیا؟ آج ہم ہیں کل کسی اور کی باری آجائے گی۔" نہایت خندہ پیشانی سے اپنے چہرے کو پیش کیا۔ ہنس ہنس کر وہ بیہودہ سی ٹوپی پہنی۔ ایک شان استغنا کے ساتھ چلم اٹھائی۔ اور زنانے کا دروازہ کھول کر باورچی خانے کو چل دیئے اور ہمارے پیچھے کمرہ قہقہوں سے گونج رہا تھا۔

صحن میں پہونچے ہی تھے کہ باہر کا دروازہ کھلا اور ایک برقعہ پوش خاتون اندر داخل ہوئی منہ سے برقعہ الٹا۔ تو روشن آرا۔

دم خشک ہو گیا بدن پر ایک لرزہ سا طاری ہو گیا۔ زبان بند ہو گئی۔ سامنے وہ روشن آرا جس کو میں نے تار دے کر بلایا تھا کہ تم فوراً آجاؤ۔ میں بہت اداس ہوں۔ اور اپنی یہ حالت کہ منہ پر سیاہی ملی ہے۔ سر پر وہ لمبوتری سی کاغذ کی ٹوپی پہن رکھی ہے۔ اور ہاتھ میں چلم اٹھائے کھڑے ہیں اور مردانے سے قہقہوں کا شور برابر آرہا ہے۔

روح منجمد ہو گئی اور تمام حواس نے جواب دیا۔ روشن آرا کچھ دیر تو چپکی کھڑی دیکھتی رہی اور پھر کہنے لگی...... لیکن میں کیا بتاؤں کہ کیا کہنے لگی...... اس کی آواز تو میرے کانوں تک جیسے بیہوشی کے عالم میں پہونچ رہی تھی۔

اب تک آپ اتنا تو جان گئے ہوں گے کہ میں بذاتِ خود از حد شریف واقع ہوا ہوں جہاں تک میں، میں ہوں۔ مجھ سے بہتر میاں دنیا پیدا نہیں کر سکتی۔ میری سسرال میں سب کی

یہی رائے ہے۔ اور میرا اپنا ایمان بھی یہی ہے۔ لیکن ان دوستوں نے مجھے رسوا کر دیا ہے اس لیے میں نے مصمم ارادہ کر لیا ہے کہ اب یا گھر میں رہوں گا۔ یا کام پر جایا کروں گا۔ نہ کسی سے ملوں گا اور نہ کسی کو اپنے گھر آنے دوں گا۔ سوائے ڈاکیے یا حجام کے۔ اور ان سے بھی نہایت مختصر باتیں کیا کروں گا۔

"خط ہے؟"

"جی ہاں۔"

"دیے جاؤ۔ چلے جاؤ۔"

"ناخن تراش دو۔"

"بھاگ جاؤ!"

"بس اس سے زیادہ کلام نہ کروں گا۔ آپ دیکھئے تو سہی!"

اعترافِ شکست

فرقت کاکوروی

اگر کوئی بیوی اپنے نیک اعمال شوہر پر بھروسہ کرے تو یقین مانئے دونوں کا ایمان خطرے میں پڑ گیا کیونکہ ابتدائے آفرینش سے اب تک صرف ایک ہی ایسی محترم اور برگزیدہ ہستی اس روئے زمین پر گزری ہے جس کے ہاتھ پر سب سے پہلے اس کی بیوی نے بیعت کی اور ایمان لائی اور وہ تھے ہمارے رسولؐ۔ اب آپ چاہے مزاحاً اس کو باور کریں یا نہ کریں۔ مگر یقین مانئے خاکسار تقریباً بالکل شریف قسم کا انسان ہے۔ سوائے بیوی کے عموماً کسی سے ارادتاً جھوٹ نہیں بولتا سچ پوچھیے تو بزرگوں سے بھی جھوٹ نہیں بولتا اور اگر جھوٹ بولتا بھی ہے تو محض حکمت عملی کی مشق کی غرض سے یا یہ سوچ کر کہ بہرحال ہم کو اسی دنیا میں رہ کر اپنی زندگی گزارنا ہے۔ لہٰذا ہم کسی طرح دریا میں رہ کر مگرمچھ سے بیر نہیں رکھ سکتے ہیں ورنہ دھوکہ دینے کی نیت سے حاشا ہم کبھی اس گستاخی کے مرتکب نہیں ہوتے۔ دوست احباب اور عام رشتہ داروں کے ساتھ بھی ہمارا ایمانداری کے ساتھ یہی معمول رہا ہے۔ کہ اگر کوئی جھوٹ بات عادتاً نہ سے نکل گئی تو کبھی اس کی تردید نہیں کی۔ اس وجہ سے کہ ہم فطرتاً نہایت قول مرداں جاں دارد کے انسان واقع ہوئے ہیں۔ اگر کسی دوست

نے اپنی جیب خاص سے ہم کو سینما دکھانے پر آمادگی ظاہر کی تو ہم نے کبھی اس کا دل میلا نہیں کیا، پھانسی کے تختے پر چڑھ کر بھی برج، رمی، فلش، شطرنج، پچیسی یا اسی نوعیت کی دوسری مہذب سماجی نشستوں میں ہم آخر دم تک دوستوں کے برابر کے شریک رہے اور ہم نے نازک سے نازک موقعوں پر بھی اُن میں شرکت سے روگردانی نہیں اختیار کی۔

آج بھی ہماری ظاہرا بداعمالیوں سے حد درجہ متنفر اور ناراض ہونے کے باوجود ہماری نیک اور شریف النفس بیوی اس کی گواہی تو عدالت تک میں دینے کو تیار ہے کہ اللہ بخشے جب ہمارے والد مرحوم آخر مرتبہ چھوٹی دیوالی کے دن سکرات کے عالم میں مبتلا تھے اور ہم کو دوا لینے بھیجا گیا تو راستہ میں ہم احتراماً فلش کی نشست میں شریک ہو گئے اور جب ہم دوسرے روز شام کو قبرستان میں والد مرحوم کی قبر سے لپٹ کر دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے تو ہمارے سوا کوئی دوسرا عزیز گرد و پیش نہ تھا ——— "ہائے، ہم بدنصیب کو ابا کا آخری دیدار میسر نہ ہوا۔"

اس کا اقرار تو ہم پوری ایمانداری کے ساتھ یہاں سے خدا کے گھر تک کرنے کو تیار ہیں کہ ہم نماز نہیں پڑھتے، روزے نہیں رکھتے، رمضان کی تراویح میں حصہ نہیں لیتے اور اپنے پیسے سے فاتحہ درود نہیں کرتے مگر آپ ہمارے بچوں کا ہاتھ پکڑ کر انہیں قبلہ رو کھڑا کر کے خود اُن ہی سے دریافت کر لیجیے کہ رمضان میں افطار کے وقت ہم کبھی دسترخوان پر سے غیر حاضر رہے! بارہا ان بچوں میں سے دو ایک غیر حاضر ہوئے مگر ہم ہمیشہ واحد حاضر بنے رہے۔ آپ یہ بھی باور کریں کہ ہوش میں آنے کے بعد رمضان کی کوئی شب ہماری بغیر سحری کے خالی نہیں گزری۔ یقین مانئے ہم ہمیشہ سے کفرانِ نعمت کے مخالف رہے۔

بے تعصبی کا یہ عالم کہ مذہبیات سے تقریباً نابلد ہونے کے باوجود ہر مذہب اور ہر عبادت کو دنیا کی بہترین عبادت سمجھتے ہیں اور اس چیز کی گواہی تو ہمارے پڑوس کے بڑے بوڑھے ہندو بھی دے سکتے ہیں کہ بچپن میں محلے میں مہابیر جی کے مندر میں منگل منگل دوپہر اور رات کا کھانا کھانے کے بعد ہم پنڈت جی کو پابندی سے دو پیسے دے کر ان سے دس بارہ بیسن کے لڈو پرشاد کی شکل میں وصول کر کے تن تنہا مندر کی دہلیز پر کھاتے ہوئے دیکھے گئے۔ اور اگر ہماری یادداشت دھوکہ نہیں دیتی تو اللہ بخشے پنڈت جی بھی ہماری طرح نہایت شریف النفس،

بے ریا اور بالکل غیر دنیادار قسم کے انسان تھے۔ ان معنوں میں کہ اگر کوئی دونے میں مٹھائی باہر سے خرید کر چڑھاتا تو اس سے وہ اتنا خوش نہ ہوتے تھے جتنا کہ ہمارے دو پیسے ہاتھ پر رکھتے ہی ان کے جسم کا خون چلووں بڑھ جاتا تھا، ان کی باچھیں کھل جاتی تھیں ایمان کی روشنی ان کے چہرے سے پھوٹ نکلتی تھی، لڈوؤں کی مٹھاس ان کے لب بند کر دیتی تھی، ان کے کلام میں شیرینی ان کے مزاج میں شگفتگی، ان کی سانس میں گیندے اور جوہی کے پھولوں کی بھینی بھینی مہک اور ان کے اعضا میں چستی پیدا ہو جاتی وہ ہماری پیٹھ تھپتھپا کر دعا کرتے،" ہمیشہ بنے رہو بچہ نارائن تم کو خوش رکھے" اور اس کی وجہ یہ تھی کہ لڈو ان کے لیے بے کار تھے اور پیسوں میں بڑی گنجائش تھی ہمیں یاد ہے۔ جب پیسے لینے کے بعد وہ لڈو کی طرف ہاتھ بڑھاتے تو ہم عقیدتاً آنکھیں بند کر کے مورتی کے سامنے جھک جاتے اور ہمارے لبوں سے نہایت عقیدت مندانہ انداز میں دلی کیفیات کا اظہار ہونے لگتا، ہم رک رک کر کہتے " بارہ ۱۲ "۔ چودہ ۱۴ "۔ اٹھارہ ۱۸ "۔ بعض مرتبہ نشانہ ٹھیک بیٹھتا مگر بعض مرتبہ جب بارہ کے بجائے دس لڈو ہاتھ لگتے تو ہم چپکے چپکے مہنت جی سے منہ بنا کر کہتے کہ" آج مہابیر جی دو لڈوؤں بھر ہم سے ناراض ہیں۔" یہ سن کر مہنت جی دو لڈو دے کر ہماری منہ مانگی مراد پوری کر دیتے۔ البتہ اگر کسی دن دس کی فرمائش کی اور پندرہ ملے تو دل بلیوں اچھل اچھل کر کہتا کہ کاش مہابیر جی کے دوسرے بھائی بھی یہاں ہوتے۔

اسی طرح تمام حصّے بٹنے والی مجالس اور میلاد شریفوں میں بھی ہم بے لوث عقیدت رکھتے تھے۔ ہم ہمیشہ ان میں اس وقت شرکت کرتے جب ذاکرین اور میلاد خواں حضرات " اب دعا کے لیے اٹھاؤ ہاتھ" والا فقرہ ادا کر کے منبر یا چوکی پر سے اترنے لگتے۔ ہم ہمیشہ سے اپنے مذہبی عقائد کو دوسروں سے بلند اور برتر سمجھتے ہیں۔ اسی لیے مونگ پھلی، خمیری روٹی، کھچڑے اور اسی قبیل کی دوسری چھوٹی موٹی اور نچلے طبقے کی مجلسوں میں شرکت سے گریز کرتے ہیں اور باقر خانی سے لے کر کھیر، پلاؤ، امرتیوں، بالوشاہیوں اور شاہی ٹکڑوں والی محفلوں میں شریک ہو کر تمام دن ہم دُہرا حصّہ لینے والوں کی شکل بنانے کی مشق میں مصروف رہا کرتے تھے بے ایمانی کو ہمیشہ سے ہم نے ننگ انسانیت سمجھا اور بحمد اللہ اس وقت بھی سمجھتے ہیں۔ مگر

حصّہ بٹتے وقت اگر ہم ایک ہاتھ براہ راست پھیلا کر دوسرا ہاتھ کسی کی بغل سے نکال کر پابندی سے دو حصّے حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو اس کا مقصد محض زیادہ سے زیادہ تبرک حاصل کرنا ہوتا ہے، کیوں کہ معاذ اللہ دھوکہ دہی یا فریب۔ زیادہ سے زیادہ تبرک حاصل کرنے سے انسان کی نیت صائب رہتی ہے، دل باغ باغ ہو جاتا ہے رہزنی، جھوٹ، مکر، فریب دھوکہ دہی جیسے سفلے اور پست جذبات سرد پڑ جاتے ہیں چہرے پر شگفتگی خون میں بالیدگی، ہاتھ پاؤں میں چستی، کام کاج میں چلت پھرت، آنکھوں میں چمک اور اعضا میں نمو پیدا ہو جاتی ہے اور تمام فاتحہ درود کرانے والے مذاہب سے عقیدت بڑھنا شروع ہو جاتی اب آپ ہی انصاف سے بتایئے کہ اس میں ہم کون سے گناہ کبیرہ یا صغیرہ کے مرتکب ہوتے ہیں۔

تو اور کیا فرماتے ہیں علمائے دین و حامیان شرع متین درمیان اس مسئلے کے کہ اگر کوئی شریف مرد اپنی بیوی کے اس مطالبے پر کہ ہم بن۔ بیاہی رانڈ۔ فلم دیکھیں گے؛ یہ کہے کہ ارے حماقت کر رہی ہو یہ تماشا تو نہایت لچر ہے اور اسے ہم ایک مرتبہ نہیں دو تین مرتبہ دیکھ چکے ہیں۔ خواہ ہم نے اسے ایک مرتبہ بھی نہ دیکھا ہو۔ تو کیا ہمارے اس کہنے کو جھوٹ یا معاذ اللہ فریب تصور کیا جائے گا جب کہ یہ کہتے وقت محض کفایت شعاری کا جذبہ ہمارے پیش نظر ہوتا ہے فرض کیجئے کہ دیوالی دسہرے میں ہم ساری رقم ہار کر اور اپنی دنیا اندھیر کر کے گھر پہونچے اور رفع شر کی خاطر ہم نے بیوی سے کہہ دیا کہ وعظ میں شرکت کرنے چلے آرہے ہیں وعظ اس لیے کہا کہ وعظ سننے کے بعد بھی انسان کی نظروں میں دنیا کی ہر چیز ہیچ اور مادی نظر آتی ہے۔ اور انسان میں دنیا سے نفرت اور بیزاری کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اگر ہم کسی مشاعرے میں معاوضے پر بلائے گئے اور ہم نے گھر آکر کہہ دیا کہ لعنت ہو ایسے مشاعروں پر جن میں سوائے واہ واہ کے کچھ ہاتھ نہیں لگتا۔ تو اس میں دروغ گوئی کا کونسا پہلو نکلتا ہے۔

عورت کے بارے میں بزرگوں کا کہنا ہے کہ وہ ناقص العقل ہوتی ہے اس لیے اگر ہم نے اس سے سچی بات کہہ کر ذرا معاوضے کے پہلو کو بچا لیا تو اس میں ہماری بے ایمانی کا کون سا پہلو نکلتا ہے۔ یا تاخیر سے رات گئے گھر آنے پر اکثر بیوی بچے سو گئے اور ماما نے اٹھ کر کواڑ کھول دیئے اور ہم انگوٹھوں پر اپنی ساری بد اعمالیوں کا بوجھ اٹھائے آہستہ آہستہ گھر میں

داخل ہوئے تاکہ کسی کی نیند نہ خراب ہو اور بیوی ناخن کی چنک سے اُٹھ کر بولیں ۔ اس وقت تشریف آئی ہے ! کیا بجا ہے ! ہم نے مُھنتے ہی اپنی گھڑی دیکھ کر کہا کہ ابھی سوا آٹھ بجے ہیں : تو اس میں کون سا گناہ ہوگیا ؟ ہم نے ذرا سی گھڑی کی سوئی ہی تو گھمادی لوگ بڑے بڑے گھنٹہ گھر غلط بجادیتے ہیں ۔

ریڈیو پر تقریر کرنے کے بعد گھر پہنچ کر اگر ہم نے بیوی سے کہہ دیا کہ ریڈیو کی تقریر میں آج یہ پہلا اور آخری واقعہ گزرا کہ ایک شخص نے تقریر بھی کی اور اسے پیسے بھی نہیں ملے ۔ محض اس جرم میں کہ اس کی آواز ریڈیو پر فٹ نہیں ہوئی بھلا بتایئے اس میں ہماری آواز کی کیا غلطی ۔ مگر نہیں صاحب پیسے نہیں دیں گے ، میں بھی غصے میں اسی طرح ریڈیو اسٹیشن چھوڑ کر چلا آیا ، ہمارے اس کہنے کے بعد بھی اگر کوئی دانت پیسے تو صاحب ہم کیا کریں ۔ اگر ہم نے کوئی ناقابل یقین بات کہی ہوتی تو ہم اور ہماری تین پشتیں بے وقوف "۔

ہم بقر عید میں چڑیا چڑے کی قربانی تک کے قائل ہیں چہ جائے کہ بکرے کے جو قد و قامت میں ہم سے انیس ، بلکہ سچ پوچھئے تو وہ بعض چیزوں میں ہم سے فضیلت رکھتا ہے مثلاً ہماری دو ٹانگوں کے مقابلہ میں اس کے چار ہوتی ہیں ہمارے سر پر سینگ نہیں ہوتے وہ ماشاء اللہ دو سینگوں کا مالک و مختار کل ہوتا ہے ۔ ہمارے دُم نہیں ہوتی ۔ اس کے دو کان ہمارے پورے خاندان کے کانوں کو جوڑنے کے بعد بھی دو چار انگل بڑے ہی نکلیں گے ۔ اس کی کھال ہم سے زیادہ دبیز اور جاڑے میں لحاف کا کام دینے والی ہوتی ہے ، رنگ و روغن کے لحاظ سے بھی وہ رنگ برنگی آواز میں وہ بنک کہ آپ ایک فرلانگ سے سُن لیں ۔ ایسی صورت میں اگر ہم ازراہ ہمدردی اس کی قربانی کو اپنی قربانی سمجھتے ہیں تو ہم کیونکر بزعم اسلام مرتد اور کافر قرار دیئے جاسکتے ہیں ۔

کیا آپ ہماری اس بات کو بزدلی یا معاذ اللہ کاہلی پر محمول کریں گے کہ اگر رات میں کسی نے کنڈی کھٹکھٹائی اور ہم نے لحاف کے اندر منہ کر کے ذرا بیوی سے دھیمے سروں میں کہہ دیا کہ دیکھنا کون ہے — اگر ضرورت پڑے تو مجھے آوا ... دے لینا ، تو اس میں ہم نے کون سا زہر ملا دیا ۔ مگر ہمارے اس کہنے کو بھی لوگ ہمارے ڈرپوک ہونے پر محمول کرتے ہیں جبکہ

ہم محض اپنی عورت میں بہادری ، مردانگی جرأت اور ہمت کا جذبہ پیدا کرنے کی غرض سے ایسا کرتے ہیں ۔ حکومت کو کوئی ڈرپوک نہیں کہتا جس نے پولیس فوج ہوائی جہاز سرکاری دفاتر میں عورتوں کی آنکھوں کا پانی مارنے کے لیے مردوں کے برابر رکھا ہے حتیٰ کہ وہ وزارت میں شریک ہیں ۔

دراصل یہ ہماری بدنصیبی نہیں تو اور کیا ہے ۔ بندھا ہمیشہ مار کھاتا ہے ہم کو آپ بیوی کے پلو میں باندھ کر رکھئے اگر ہم کسی کی امانت میں خیانت کرتے ہوں یا کسی کا پینٹ کوٹ جوتا یا ٹوپی بلا اس کی اجازت کے استعمال کر کے یہ سوچنے لگتے ہیں کہ وہ بھی ہماری طرح دوسروں کی چیزیں استعمال کرتا ہوگا کیونکہ انسان انسان سب برابر ہیں ۔ تو صاحب اس مساوات پر پوری شدت سے بھروسہ اور ایمان رکھنے والے پر بوٹیاں نوچنا کیا معنی ۔

ہم اگر گھر میں رہتے ہوئے بستر پر پڑے پڑے بیوی بچوں سے کام لیتے ہیں تو ان کو کام کرنے کی مشق ہی تو کراتے ہیں خدانخواستہ کاہل تو نہیں بناتے پھر اگر اس پر کسی کا خون کھولے تو ہماری کیا غلطی ؟

آپ خیال فرمایئے کہ ہم پوری ایک رات اور تقریباً پورے ایک دن کے جاگے ہوئے ہیں ۔ آنکھیں سُرخ ہیں ، پلکیں نیند سے بوجھل ہیں ، جمائیوں پر جمائیاں آرہی ہیں ، ہاتھ پاؤں ٹوٹ رہے ہیں ، دل چاہتا ہے کہ پلنگ ملے اور ہم دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جائیں ۔ جاگنے کی وجہ بھی سن لیجے کسی بیکار کام کے لیے جاگے ہوں تو ہم پر زمین و آسمان ٹوٹ پڑیں ۔ لیٹے لیٹے چھت پر مسمریزم کی مشق کرتے رہے ہوں تو قابل گردن زدنی ، روپیہ پیسہ کمانے میں کسی قسم کی کوتاہی سرزد ہوئی ہو تو قابل صد ہزار ملامت ۔ آپ جانتے ہیں کہ ہر بیوی بچے والا اپنی عاقبت پر نگاہ رکھتا ہے ، روپیہ فراہم کرنے کی کوشش کرتا ہے ، بڑے بڑے خطرات مول لیتا ہے جدوجہد کرتا ہے ۔ زندگی کیا ہے ؟ ایک جُوا ہے ۔ اچھے پتے لگے تو پورے ورنہ کنگال ۔ تخت یا تختہ ۔ اسی کا نام زندگی ہے ۔ پھر انسان یا تو اس دنیا میں رہے نہ اور اگر رہتا ہے کہ اس کا فرض ہے کہ اپنی ذات سے کسی کے جذبات مجروح نہ کرے ، کسی کا دل نہ توڑے اپنی ذات پر تکلیف اٹھا کر دوسروں کو خوش رکھنے کی کوشش کرے ۔ خدا اور رسول نے تو ہم کو یہی بتایا ہے کہ دوسروں کے جذبات کا

احترام کرو۔ آج ہم دوسروں کے شریک ہوں گے کل وہ ہمارے شریک ہوں گے ہمیشہ ہماری زندگی کا یہی نصب العین رہا ہے اور ہم اس فطری جذبے کو خواہ آپ ہماری اس کمزوری پر کیوں نہ محمول کریں اپنی زندگی کا مقصد بنائے رہے۔

ہم دفتر سے گھر واپس آ رہے ہیں کہ ہم کو ایک مخلص ترین دوست مل جاتے ہیں اور ہم سے اصرار کرتے ہیں کہ جلو رمی کی ایک سالانہ نشست میں شریک ہو لیا جائے جو اللہ بخشے رفیع احمد خاں مرحوم کی برسی کے سلسلے میں منعقد ہوئی تھی اب اس میں ہماری عدم شرکت کے معنے یہ ہوئے کہ ہم فاتحہ درود اگر خود نہیں کرتے تو اس میں شرکت تک نہ کریں چنانچہ ہم رمی میں شریک ہو گئے۔

رمی کے بارے میں جہاں تک ہمارا خیال ہے یہ لفظ "ارم" سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں جنت۔ لہذا اس کھیل کو ہم جنتی کھیل سمجھتے ہیں اور اسی وجہ سے زمین پر رہتے ہوئے جنت الفردوس کے مزے حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ذکر العیش نصف العیش ــ انسان جنت ہی کی خاطر ریاضت کرتا ہے نمازیں پڑھتا ہے، سجدے کرتا ہے دعائیں مانگتا ہے، درگاہوں اور مزاروں کی خاک چھانتا ہے، گناہوں سے توبہ کرتا ہے۔ حالات کچھ ایسے تھے کہ اٹھا تو بڑی چیز کوئی پہلو بھی نہیں بدل سکتا تھا، سنبھال کر سانس لینا پڑتی تھی کہ کہیں دھیان نہ بٹ جائے اور غلط چال ہاتھ سے نہ نکل جائے موقع کا پتا چلنا اور اٹھا لینا کوئی معمولی کام نہیں ...... میں کامل یکسوئی اور حاضر دماغی کی ضرورت ہوتی ہے۔ بڑے بڑے درویشوں کے چھکے چھوٹ جاتے ہیں دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہونا اس میں پہلی شرط ہے۔ اس میں ساری ذہانتوں کو اکٹھا کرنا پڑتا ہے۔ پوری کھیلی ہوئی باری اور چلے ہوئے پتوں کو سامنے رکھنا پڑتا ہے۔ دائیں بائیں ہر شخص کے چہرے پر نگاہ رکھنا پڑتی ہے، ساتھیوں کے جذبات کا احترام کرنا ہوتا ہے، ایک ایک چال میں ذہن اور یادداشت کو سینکڑوں ہفت خواں طے کرنے ہوتے ہیں۔ ان حالات میں بیوی بچے کیا انسان خدا اور رسول کو بھول جاتا ہے پتے کھیلنا بڑی تپے ماری کا کام ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہم دفتر میں چھٹی کی درخواست دینا بھی بھول گئے اور نشست میں سو روپے ہار دئے۔ اب انصاف فرمائیے گا کہ ہم پر چار چار غم بیک وقت لدے ہوئے ہیں ــ اوّل ملازمت چھوٹنے کا اندیشہ کیجئے ہاں ــ اور خدا آپ کا بھلا کرے سو روپے ہارنے کا غم دو ــ اور اللہ آپ کو جیتا رکھے خفنہ

کا غلبہ اور تکان ہو۔ تین ۔ اور ڈیڑھ روز بلکہ پورے دو روز اگر ایک کھیل منہ تک گئی ہو اس کی کمزوری ہو جائے چار کہ نہیں۔ چنانچہ ہم یہ چاروں بوجھ لیے کہیں داخل ہی ہوئے تھے کہ ہم پر صلواتیں شروع ہو گئیں اور وہ ہماری رفیقۂ حیات کے نام سے موسوم ہیں انھوں نے تن تنہا ہم کو گھیر لیا اب آپ اسے ستم، جور، استبداد ظلم اور بے جا سختی نہ کہئے گا تو کیا کہئے گا۔

کسی بے کس کو اے بیداد گر مارا تو کیا مارا
جو خود ہی مر رہا ہو اس کو گر مارا تو کیا مارا

اب ہم پر گرج اور چمک کا اثر نہیں ہوتا کیونکہ نہ تو ہم بلوٹھی کے ہیں اور نہ دودھ پیتا بچہ دوسرے تیغوں کے سائے میں ہم پل کر جواں ہوئے ہیں

اس تھکا فضیحتی کے طوفانوں سے تو شادی کے بعد سے ماشاء اللہ اتنا سابقہ رہا ہے کہ وہ ہمارے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتے ہم ایسے طوفانوں کو ایک فقرے میں رد کرنے کا منتر جانتے ہیں چنانچہ ہم نے تیوری بدل کر نہایت غصہ کم کرنے والے انداز میں کہا صرف اپنی کہے جاؤ گی یا دوسروں کی بھی سنو گی، وہ بولیں "کہئے وا!" ہم نے کہا "ہم خدانخواستہ کسی بداعمالی میں مبتلا نہیں تھے کسی رنڈی منڈی کے پاس نہیں گئے تھے، کسی چوری ڈکیتی میں شریک نہیں تھے۔ بلکہ ایک سرکاری کام سے یہاں سے اٹھارہ میل بارہ بنکی الیکشن کے کام سے سرکاری طور پر بھیجے گئے تھے۔ جس کا ہم کو معاوضہ ملے گا۔ اور اب کی مرتبہ تنخواہ کے ساتھ سو روپے زائد ملیں گے جن سے تمہارے سونے کے ہار کی فرمائش پوری ہو گی۔ اس پر کھسیانی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ بولیں تو گھر میں بتا دیا کیجیے کہ فلاں فلاں جگہ جا رہا ہوں" ہم نے کہا "حکم حاکم مرگ مفاجات۔ فوراً ہی حکم ہوا چلے جاؤ چنانچہ ہم کو جانا پڑا" اس پر دوبارہ مسکرا کر بولیں "مگر آج ایک کام آپ کو میری خاطر سے کرنا ہو گا اور وہ یہ کہ فقیر محمد شاہ صاحب کے ٹیلے پر سالانہ عرس ہے اس میں بچوں سے مزار پر تبرک چڑھوا آئیے اور تھوڑا سا تبرک خود بھی لیتے آئیے۔ آخر آپ کو خدا کے گھر جانا ہے کہ نہیں۔ دنیا چند روزہ ہے۔ عبادت نہیں کرتے مزاروں ہی پر ہو آیا کیجیے۔ آخر کسی کی تو دعا لیجیے ورنہ بچے بھی آپ جیسے ہو کر رہ جائیں گے نہ جانے ان کی قسمتوں میں کیا لکھا ہے۔

ہم نے بدلتے ہوئے حالات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا کہ "بہر حال تبرک تو ہم لا دیں گے مگر

ان حالات کی روشنی میں آپ ہمارے بارے میں جو رائے بھی قائم کریں مگر برائے خدا بیوی سے والہانہ عشق اور محبت کا ایک واقعہ اور سنتے جائیے جس میں آپ کی جان سے دور کہنا چاہیے کہ ہم موت کے منہ میں جاتے جاتے رہ گئے۔

اگر خدانخواستہ آپ شادی شدہ ہیں تو یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ شادی کے ابتدائی چھ ماہ تک عورت شوہر کی نظر میں حور رہتی ہے، پھر پری کا درجہ حاصل کرتی ہے، پھر نور جہاں کا، پھر مہ لقا کا، پھر عورت کا، اس کے بعد گاندھی جی نے کستورا بائی کے لیے آخر عمر میں جو کہا تھا وہ۔ چنانچہ پری اور حور والے درجہ میں وہ اپنے شوہر سے کیسے کیسے نخرے کرتی ہے اور شوہر نامدار کس کس انداز میں فرہاد اور مجنوں کے ساتھ ریس فرمانے کی کوشش کرتے ہیں بس یہی حال ہمارا سمجھ لیجیے۔ شادی کے تیسرے روز ہماری لیلیٰ نے فرہاد سے فرمائش کی کہ ہم سکنڈ شو سینما دیکھیں گے۔ یہاں جب ابھی تک یہ عالم ہے کہ ماشاء اللہ بیوی کا ہر حکم ہم ان کے بچوں کی طرح اچھل کود کر دیا کرتے ہیں ...... تو اس وقت تو بہرحال آپ صاحب دل ہیں سمجھ سکتے ہیں۔

مگر مصیبت یہ تھی کہ ایک جان ناتوان پر تین سواریاں لادی جا رہی تھیں ان کی چھوٹی خالہ جو عمر میں ان سے چھوٹے ہونے پر بھی بہ اعتبار اولاد ان سے دو سال کھوٹی اور موٹی تھیں مع اپنے ایک دو سالہ ہاتھی صفت بچے کے جانے پر کمربستہ تھیں۔ بہرصورت یہ چاروں سواریاں جب تانگہ پر سکنڈ شو سینما دیکھنے افق سینما ہاؤس رواں ہوئیں۔ افق ان معنوں میں کہ جس سینما ہاؤس کا ذکر ہے وہ ہمارے گھر سے اتنے فاصلے پر تھا جہاں پر کہ شہر کے زمین و آسمان ایک دوسرے سے بغلگیر ہوتے ہیں۔ ڈیڑھ بجے شب کو جب فلم ختم ہوا تو ہاتھی خاں یعنی وہی صاحبزادے خراٹے لینے لگے خدا جانے کب کا رکھا ہوا خمیر تھا کہ ان کی خالہ کے یہاں پیدا ہونے کے بعد اس بری طرح پھولا تھا کہ کیا ساکھو اس طرح بن میں پھولے گا جب خود ماں کو باوجود ممتا کے اس کا اٹھانا ٹھانا دشوار تھا اور وہ پسینے پسینے ہو جاتی تھی تو ظاہر ہے کہ ہم کس شمار و قطار میں تھے۔ اس کے اٹھانے میں گھڑیاں ہیں جہاں۔

دل صاحب۔ اولاد سے انصاف طلب ہے۔

اس بوجھ کو ظاہر ہے کہ ہم اپنی سعادت مندی کے پیش نظر اپنی نئی نویلی گھر والی کو تو اٹھانے

ہم کسی بچے کو یا تم کو کھانے نہیں گے۔ کیونکہ وہ نہ جانے کتنے مہینوں کی رکھی ہوئی ریوڑیاں ہوتی ہیں جو تبرک کی شکل میں ہم تک پہنچتی ہیں۔ جو چڑھاوا چڑھتا ہے اس کا حساب کتاب تم کو معلوم نہیں ــــ ہوتا یہ ہے کہ درگاہ کے باہر جو ریوڑی والے ریوڑیاں رکھے ہوتے ہیں۔ وہ لوگ سجادہ نشین کے آدمی ہوتے ہیں، لوگ ان سے خرید خرید کر مزار پر ریوڑیاں چڑھاتے ہیں اور جب مزار پر من ڈیڑھ من ریوڑیوں کا ڈھیر لگ جاتا ہے تو برابر قسطوار دوکانوں پر چادروں میں بھر بھر دوبارہ بکنے بھجوا دی جاتی ہیں اور اس طرح جمعرات کے دن ایک ایک ریوڑی مزار سے دوکان تک کتنے پھیرے کرتی ہے۔ یہی آمدنی کے ذرائع ہیں جو مزار والوں کو ہوتے ہیں۔ یوں سمجھو کہ ان بدنصیب ریوڑیوں کو آغا خاں کے گھوڑوں کے فرائض انجام دینا ہوتے ہیں۔ وہ سال بھر تک سجادہ نشین کے اصطبل میں بندھی رہتی ہیں آغا خاں گھوڑیاں پالتے ہیں اور سجادہ نشین ریوڑیاں۔ گھوڑیاں ریس کورس میں دوڑتی ہیں۔ ریوڑیاں پھاٹک سے مزار تک ریس کرتی ہیں۔" بولیں "یہ سب جھوٹ ہے بھلا کہیں ایسا ہو سکتا ہے۔" ہم نے کہا "پچھلے سال کیا ہوا؟ ہم کو کیا معلوم اخبار ہی میں چھپا تھا کہ فلاں فلاں مزار سے واپسی پر تبرک منہ میں رکھتے ہی ایک پورا خاندان مع بچوں کے جاں بحق ہو گیا۔" اس پر کچھ خاموش ہو کر بولیں "تو میں اپنے بچوں کو ہرگز مزار پر نہ جانے دوں گی۔" ہم نے کہا "ارے کیا حرج ہے مزار پر فاتحہ پڑھ کر چلے آئیں گے۔" بولیں "نہیں اگر ان میں سے کسی نے تبرک کی فرمائش کی اور آپ نے وہی ریوڑیاں دلوا دیں تو میں بچوں سے ہاتھ دھو کر بیٹھ جاؤں گی۔ آپ کا کیا جاتا ہے۔" ہم نے کہا "تم بھی کیسی باتیں کرتی ہو یہ کیا ضروری ہے کہ تمام مزاروں پر ایسا ہی ہوتا ہے اور تبرک سڑ جانے دیا جاتا ہو۔ اتفاق تھا جو ایک آدھ ریوڑی سڑ گئی اور سجادہ نشین اور دوکاندار صاحبان کی نظروں سے چوک گئی اور وہ اس کو چھانٹ کر پھینک نہ سکے۔" مگر وہ کسی طرح نہ ماننا تھا نہ مانیں۔

بہرصورت اس طرح گویا ہماری جان بچی۔ اب ان باتوں سے اگر ہم اپنے تھکے ماندے جسم کو ذرا آرام پہنچاتے ہیں اور بیوی کو بھی خوش کر دیتے ہیں تو ہم کو فریبی کیوں کہا جاتا ہے۔ اگر اس کو مذاق ہی سمجھ لیجیے تو کون شوہر ایسا ہے جو اپنی بیوی سے ایسی باتیں نہیں کرتا۔ مگر ہمارا مذاق بھی دنیا کی نظروں میں کھٹکتا ہے۔

نہیں دے سکتے تھے اور نہ ان کی خالہ ہی کو احتراماً ہاتھ لگانے کی اجازت دے سکتے تھے قہرِ درویش برجان درویش۔

سب پہ جس بار نے گرانی کی
اس کو یہ ناتواں اٹھا لایا

چنانچہ کلمۂ شہادت پڑھتے ہوئے سب سے پہلے تو ہم نے اپنے اگلے پچھلے گناہوں کا بارگاہِ ایزدی میں صدقِ دل سے اقرار کیا۔ اس کے بعد اپنے حواس درست کئے۔ اپنے جسم کے رگ پٹھوں کا ری ہرسل کیا حسرت سے بیوی پر نگاہ کی۔ آخری بار کائنات عالم کی بے ثباتی پر غور کیا۔ آیۃ الکرسی پڑھی دو چار اور چھوٹی چھوٹی آیتیں جو بچپن سے زبان پر چڑھی ہوئی تھیں پڑھ کر اپنے اوپر دم کیں۔ اس کے بعد یہ سوچ کر مرنا برحق ہے ایک دن سب ہی کو یہ دن دیکھنا ہے۔ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے اپنے عزرائیل یعنی بچے کو دیکھا۔ اس کے بعد کچکچا کر دانت بھینچ کر اور آنکھیں بند کر کے گھما کر یا علیؑ کہتے ہوئے ہاتھی کو جنبش دی پنج گھوم تو گیا مگر موٹر اسٹارٹ نہیں ہوا۔ اب ہم نے دوبارہ پورے اخلاص کے ساتھ یا علی خیبر شکن کہہ کر جو دو تابڑ توڑ جھٹکے مارے تو لڑکا اسٹارٹ ہو گیا اور ہم نے اس کو اپنی پوری جان پر مسلط کر لیا۔ اب ہم نے اس کو نے تولیا مگر لیتے ہی ٹٹنس کے مریض کی طرح ہم کمان کی شکل میں قوس قزح بننے لگے۔ ہم پر یہ کیفیت طاری تھی کہ بیوی اور اُن کی خالہ نے بڑھ کر ہاتھ لگایا۔ ہم نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے نیچے کے لنگر کو روکنے کے لیے لگائے اور اس آب گرم کی پروا نہ کی جس سے اس کا پاجامہ تر بتر تھا۔ اس طرح آہستہ آہستہ چوتھی کی دولہن کی طرح ہم جو پندرہ منٹ میں ہال سے باہر تک دس گز زمین طے کر کے ہال کے بیرونی ورانڈے میں آئے سڑک پر صرف دو تانگے والے دکھائی پڑے جس پر شہد کی مکھیوں کی طرح لوگ ٹوٹے پڑ رہے تھے اور تانگے والے زمین و آسمان کی اُڑا رہے تھے۔ برقعہ پوش عورتیں لعنت ہو اس سماج پر تانگے والوں سے ہم کلام ہونا تو بڑی چیز مردوں سے دور دور شجرِ ممنوعہ بنی کھڑی تھیں۔

اور ہم چوں کہ فلک سے میدان بدے ہوئے تھے اس لیے ہم پر سکرات کا عالم طاری ہو رہا تھا۔ اب سوال یہ تھا کہ ان تانگے والوں تک کیونکر پہونچا جائے اول بھیڑ کا چیرنا۔ پھر

تانگے والوں کو بھیڑ سے چھٹانا۔ یہ ہفت خوان طے کرنے کے لیے اچھے بھلے انسان کی ضرورت تھی نہ کہ ہماری۔ ہم بار بار سوچ رہے تھے کہ ہائے چلتے وقت کیسی چوک ہو گئی جو والدہ سے دودھ نہ بخشوا آئے۔ ہم اسی غور و فکر میں رینگتے رینگتے ایک نہری کے برابر پہونچ گئے۔ ہاتھی نے ٹھنڈک سے بچنے کے لیے کچکچا کر ہماری گردن میں سانپ کی طرح دونوں ہاتھوں سے گونڈلی ماری۔ ہماری سانس جو جسم سے بھاگ کر حلق میں پناہ گزین ہوئی تھی گھٹنے لگی۔ مگر جب ایسٹرن گیئر پر بھی دشمن کا دباؤ پڑنے لگا تو ہماری آواز میں کچھ ہیں ہیں کا سا ترنم پیدا ہو گیا اور پاس کھڑے ہونے والوں کو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے کہیں دور پر کسی بدنصیب چھچھوندر کا گلا گھونٹا جا رہا ہے۔ ہمارے نتھنے بیک وقت اتنی سانس نکالنے کے کبھی عادی نہ رہے تھے۔ ان کا یہ عالم تھا کہ پھٹے جا رہے تھے عورتیں دو۔ کھڑی تانگوں پر سمر ریزم کی مشق کر رہی تھیں۔ ہماری آنکھوں کے نیچے اندھیرا آیا جا رہا تھا۔ دل نے زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہوتے ہوئے کہا۔ ابے پورے لنگر کو سنبھالتے ہوئے بیٹھ جاؤ ورنہ ہم تیرے بیٹھنے سے پہلے ہی بیٹھ جائیں گے۔

چنانچہ ہم نے اس حکم کی تعمیل کی اور آہستہ آہستہ پیروں کو گھٹنوں کی مدد سے کمان بناتے ہوئے نہری کے کگر پر جہاں پر کہ ہم کھڑے ہوئے تھے بیٹھنے کی کوشش کی اتنے میں ہاتھی نے جو کنمنا کر کروٹ لینے کی کوشش کی تو ہمارے ہاتھوں پیروں کے سارے کے سارے لنگر ٹوٹ گئے اور جب ہماری آنکھ کھلی تو بدمعاش تانگے والا ہم کو گھر پر تانگے سے اتارتے ہوئے کہہ رہا تھا: میاں کے سارے کپڑے لت پت ہو گئے ہیں جس میں پتلون تو بالکل ہی نجس ہو گیا ہے۔ چیونٹی پر جب ہاتھی کو لادو گے تو چیونٹی کا پتلون نجس نہ ہو گا تو کیا بھی پر چڑھ کر بے داغ اتر آئے گا؟

اور جب ہم بی۔ اے۔ پاس ہوئے

فرقت کاکوروی

آپ چاہے مانیں یا نہ مانیں اور اس حقیقت کو تسلیم کریں یا نہ کریں مگر موجودہ دورِ جمہوریت کا یہ ایک اٹل اور متفقہ فیصلہ ہے کہ علم و ادب کے تمام مدارج طے کر لینے کے بعد بھی سب سے بڑا جاہل وہ ہے جو گریجویٹ نہیں، اور اپنی جملہ جہالتوں کے باوجود سب سے بڑا عالمِ وقت وہ ہے جس نے کسی یونیورسٹی سے بی۔ اے کی سند حاصل کی ہے، بات یہ ہے کہ اب سے چالیس پچاس برس قبل بی۔ اے کی ڈگری ایک ایسا کارآمد تعویذ اور ایک ایسی جادو کی پڑیا ثابت ہو چکی ہے کہ آپ نے اِدھر اس کو استعمال کیا اُدھر کھل جا او سم سم کی آواز کے ساتھ ملازمت کے دروازے کھل گئے اور آپ کی مٹھیاں بھر بھر کر اپنے دامنِ افلاس کو رشوتوں اور مقررہ تنخواہوں سے پُر کرنا شروع کر دیا بی۔ اے کی ڈگری معیارِ علم، معیارِ قابلیت اور معیارِ ذہانت تصور کی جاتی تھی یہی ڈگری گھر والوں اور بزرگوں سے ہر معاملے میں مشورہ طلب کرواتی تھی اور اسی پر سوسائٹی میں عزت و ذلت کا دار و مدار تھا والدین نے صاحبزادے کے ہاتھ میں بی۔ اے کی ڈگری دیکھی اور سمجھ گئے کہ صاحبزادے اپنی جملہ جہالتوں کے باوجود قابل ہو گئے۔ اس کے بعد اگر خاندان میں کوئی کٹھن سے کٹھن مسئلہ پیش ہوا تو سب نے آنکھ بند کر کے مشورہ دیا کہ

شفاء الملک حکیم بی۔ اے پاس صاحب سے رجوع کیجیے۔ اس معاملے میں صحیح مشورہ وہی دے سکتے ہیں کیونکہ وہ بی۔ اے پاس ہیں چنانچہ ان کو بُلا کر سب سے پہلے ان کی بی۔ اے پاس رائے دریافت کی جاتی تھی، وہ باوجود گھریلو اور شادی بیاہ کے معاملے میں ناتجربہ کار اور ناواقف ہونے کے معاملے کو آنکھیں بند کر کے اس طرح سنتے کہ گویا سمجھ بھی رہے ہیں پھر دو ایک مرتبہ متفکرانہ انداز میں سر کھجاتے اور شادی کے معاملے کو بجائے عقل سے بتانے کے علم ریاضی سے حل کر کے کہ اگر لڑکی فلاں فلاں خاندان اور فلاں فلاں امتحان پاس ہے اور ان ان صلاحیتوں کی حامل ہے تو اس کو فلاں فلاں لڑکے کے گلے منڈھ جائے تو اس سے اس کی آئندہ زندگی خوش حالی اور فارغ البالی سے بسر ہو گی اور اس سے ایک ایسا مرکب بن جائے گا جو ہر کانٹے کا نشتر ہو گا چنانچہ ان کی اس رائے کو ایک فلسفی، ایک مفکر اور ایک نجومی کی رائے سمجھ کر قبول کر لیا جاتا، اور ہر شخص واہ واہ اور سبحان اللہ کی آوازیں بلند کرتا رفتارِ زمانہ نے اس چیز کو ایک رسم کی شکل دے دی۔ اور اب اس دورِ جہالت میں بھی وہ جوں کی توں سینہ بسینہ چلی آ رہی ہے اور آج کل بھی بی۔ اے پاس صاحبزادے کی دستار بندی اسی پرانی وضع پر ہوتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ بی۔ اے پاس لڑکیاں اور لڑکے اپنے آپ کو افلاطونِ وقت اور سقراطِ دوراں سمجھتے ہیں اور بی۔ اے پاس کرنے کے بعد ان کا دماغ خراب ہو جاتا ہے۔

چنانچہ اب سے پندرہ سال کی مسلسل کوشش کے بعد بی۔ اے پاس کیا تو اس وقت بی اے کی ڈگری ایک بھاری بھرکم چیز سمجھی جاتی تھی، بی۔ اے پاس کی شہرت کس طرح اس زمانے میں ملیح آباد کے آموں کی شہرت سے کم نہ تھی اس لیے اس وقت سے پہلے کے بعض گریجویٹ اب تک اپنے نام کے آگے بی۔ اے لکھنا فخر سمجھتے ہیں چنانچہ جب ہمارے بی۔ اے کا نتیجہ شائع ہوا اور ہمارا نام اخبارات میں آیا تو دل چاہا کہ اس اخبار کا ایک بُش شرٹ بنوالیں اور درزی کو ہدایت کر دیں کہ دیکھ اخبار میں جس جگہ ہمارا نام چھپا ہے وہ ہمارے سینے کے بیچوں بیچ آئے تاکہ چلتے پھرتے لوگوں کو اندازہ ہو کہ یہ انسان کم اور بی۔ اے زیادہ ہے۔ گھر میں ہفتوں جب کوئی ہمارا اکہرا نام لے کر ہم کو پکارتا اور بی۔ اے کا لفظ چھوڑ دیتا تو ہم اس شخص کی آبرو کے درپے ہو جاتے اور دل چاہتا کہ کسی طرح ہم اس کا منہ کھسوٹ لیں۔ اس کی بوٹیاں نوچ ڈالیں۔

اس کی زبان کھینچ لیں، اور اُس کو یقین دلادیں کہ اس زمین و آسمان کے نیچے اور اس چمکتے اور جگمگاتے سورج کی روشنی میں جس کی چمک سے چمگادڑوں کی آنکھیں خیرہ ہوجاتی ہیں، اس اخبار کو پڑھے جس میں ہمارا بی۔ اے کا نتیجہ شائع ہوا ہے۔ اور آئندہ سے بغیر بی۔ اے کے ہم کو پکارنا ایک بہت بڑا اخلاقی مذہبی سیاسی اور سماجی جرم ہے اور آخراب کون چیز مانع ہے جو وہ ہم کو یہ کہہ کر مخاطب نہیں کرتا جناب بی۔ اے صاحب سلام عرض کرتا ہوں مجرا قبول ہو تسلیمات بجالاتا ہوں۔

غرض امتحان کا نتیجہ کیا شائع ہوا مراد آباد میں مردہ اندہ ہوگیا ہم نے سب سے پہلے بازار جاکر ایک نہایت نازک اندام قسم کی چھڑی خریدی اور روزانہ شام کو چھڑی لے کر ایک خاص متفکرانہ اور بی اے پاس انداز میں چھڑی گھماتے ہوئے مجموں میں چیرتے پھاڑتے ایک خاص شانِ استغنا کے ساتھ نکلنے لگے۔ اس اُمید پر کہ شاید کوئی اللہ کا بندہ دوست یا ملاقاتی ہم کو بی اے کہہ کر پکارے۔ اور ہم بڑے رعب سے اس کی آواز پر لبیک کہہ کر دُنیا پر واضح کردیں کہ اگر کسی بی۔ اے کو اس طرح کھلی حالت میں دیکھنا ہو تو دیکھ لو ورنہ اس کی زیارت کو ترس جاؤ گے۔ بی۔ اے پاس آواز کی ہنک اور چمک دمک سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محروم ہوجاؤ گے۔

برسوں لگی ہوئی ہیں جب عمر بھر کی آنکھیں
تب ہم سا کوئی بی اے اس ارض پر بچا ہے

شروع شروع میں دل چاہا کہ اگر ہمارے بی۔ اے پاس کے پوسٹر یا ہینڈ بل شہر کے ہر در و دیوار پر چسپاں ہوجاتے تو اچھا تھا، اور اگر یہ نہیں تو اخبارات اور رسائل میں ہمارا فوٹو ہی شائع ہوجاتا تاکہ آپ سے ملیے جنھوں نے امسال بی۔ اے کا امتحان پاس کیا ہے، آپ بی اے ہیں اور بہت ہی بی۔ اے ہیں۔ غرض دو ڈھائی مہینے ہم پر یہی کیفیت طاری رہی اس کے بعد مختلف جگھوں کے لیے ہم نے درخواستیں دینے پر غور کرنا شروع کیا تنہائی میں کاغذ پر اپنے نام کے ساتھ بی اے لکھ کر اور کاغذ کو نوٹ کی طرح گھما کر پورب پچھم اور اتر دکھن کر کے دیکھتے رہے اور سوچتے رہے کہ جب ہم کو یہ چیز اتنی بھلی لگتی ہے تو نہ جانے دوسروں کا اس کو پڑھ کر کیا حال ہوتا ہوگا۔ خاص پایۂ تخت لندن سے نکلنے والے انگریزی اخبارات میں وانٹس کے کالموں کو پڑھ کر بڑی بڑی

جگھوں کو اپنی بی اے کی ڈگری پر منطبق کر کے دیکھتے رہے کہ کس پر ہماری بی اے کی ڈگری پوری اترتی ہے مگر اس مقابلے میں بیشتر جگھیں ہم کو تنگ اور ہلکی محسوس ہوئیں کوئی واحد جگہ ہم کو اپنی ڈگری کی متحمل نہیں دکھائی پڑی۔ اس کے بعد کسی اُردو اخبار میں ایڈیٹر یا جوائنٹ ایڈیٹر ہونے کے خیال نے ہمارے دل کو گدگدانا شروع کیا۔ اخبار کا خیال اس وجہ سے آیا کہ اس میں ہمارے نام کے ساتھ بی اے شائع ہوتا رہے گا اور کبھی ہم اور کبھی ہماری بی۔ اے کی ڈگری یکے بعد دیگرے ضربیں لگاتی ہوئی پبلک کے دل و دماغ پر سوار ہوتی رہے گی، اور دنیا ہمارے بارے میں یہ رائے قائم کرنے پر مجبور ہوگی کہ یہ کوئی کم اور بی۔ اے زیادہ ہے۔ مگر تین چار سال اسی ادھیڑ بن میں گزر گئے۔ اور ہم بی اے کی ڈگری اپنے گھر کے پلنگ پر لیے پڑے رہے اب ہم نے سوچا کہ چلو اس بی اے کی ڈگری ایٹمک انرجی کو کسی اُردو اخبار پر جاکر آزمایا جائے۔

سب سے پہلے ہم نے اپنا وزیٹنگ کارڈ چھپوایا، اور پریس کے کمپوزیٹر کو ہدایت کردی کہ دیکھو ہمارے نام سے زیادہ جلی حروف میں بی۔ اے کا لفظ ہونا چاہیے، ورنہ ہم ایک پیسے کے روادار نہ ہوں گے۔

ان وزیٹنگ کارڈوں کا ایک پورا پیکٹ جیب میں ڈال کر ہم ایک اُردو روزنامے کے دفتر پہنچے۔ اور ایڈیٹر صاحب کو بہ آواز بلند گڈ مارننگ کہہ کر ہم نے اونچے انداز میں اپنا تعارفی کارڈ پیش کیا اور بغور دیکھتے رہے کہ ہماری بی اے کی کرنٹ اُن کے کتنی زور سے لگتی ہے۔ مگر ہم کو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے اُن پر کوئی اثر ہی نہ ہوا۔ دل نے کہا کہ یا تو یہ لکڑی پر بیٹھنے کا اثر ہے یا وہ ہمارے کارڈ میں بی۔ اے کا لفظ پڑھنے سے قاصر رہے۔ انھوں نے قدرے معذرتی انداز میں ہم سے یہ ضرور کہا کہ تشریف رکھیے یہ فقرہ ختم کرلوں تو آپ سے بات کروں۔ اس کا مفہوم ہم یہ سمجھے کہ یہ تشریف رکھنے کا لفظ انھوں نے ہم سے مرعوب ہوکر کہا ہے اور نصف حصہ کارڈ یعنی صرف ہمارے نام ہی سے جب یہ شخص اتنا زیادہ مرعوب ہے تو مع بی اے کے اگر وہ پورا کارڈ پڑھ لیتے تو نہ جانے ان پر کیا اثر ہوتا غالباً سہما سہما کر انھوں نے متحمل ہونے کی کوشش میں یہ سب کچھ کیا۔ انسان جب گرم چائے پیتا ہے تو بھی بہت پھونک پھونک کر پیتا ہے پھر ہماری صلاحیتیں کسی طرح آتش نمرود سے کم نہیں۔ بہر صورت ہم نے اُن کے اس

فقرے کو اُن کے نحیف الجثہ ہونے پر محمول کیا اور بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد انھوں نے ہم سے ہمارا صحافتی تجربہ پوچھا۔ جس میں ذرا ہم رعب کھا گئے مگر ایسا رعب نہیں جس سے ہماری بی۔ اے کی ڈگری پر خدا نخواستہ آنچ پہنچی ہو۔ ہم اُن کے ہر سوال کے جواب میں اپنے بی۔ اے پاس ہونے پر زور دیتے رہے۔ آخر میں انھوں نے ہم سے کہا کہ ہم کو ایک مترجم کی ضرورت ہے دو ایک روز کام کرکے دیکھئے، پھر معاوضے کے بارے میں آپ سے گفتگو ہو جائے گی۔ دل نے اندر سے کہا کہ دیکھو ہم نہ کہتے تھے کہ آدمی بی۔ اے پاس ہو ایڈیٹر صاحب پر رعب پڑا نا۔ غالباً دفتر تنخواہ کا بیک وقت متحمل ہوتے اور اس کا یقین کرتے ڈرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ کس اُردو اخبار میں دم ہے جو ایک بی۔ اے پاس ہاتھی ایکا ایکی باندھے گا۔ یہ سوچ کر ہم نے دفتر کے اوقات دریافت کیے اور گھر واپس آئے۔

دوسرے روز نوک پلک سے درست، پان اور سگرٹ کی ڈبیا جیب میں ڈال کر ہم منٹ منٹ پر سگرٹیں سلگاتے اور کش پر کش لگاتے مقررہ وقت پر دفتر پہونچے۔ اس دفتر کا ادارۂ تحریر تین افراد پر مشتمل تھا۔ ایک ایڈیٹر صاحب خود دوسرے ایک ریٹائیل بزرگ جو شاہ صاحب کہلاتے تھے یہ شاہ صاحب حضرت نوح کے ہم عصر محض مڈل تک انگریزی پڑھے تھے تیسرے صاحب ادھیڑ عمر اور ہائی اسکول تھے۔ صرف ایڈیٹر صاحب جو عمر میں پچاس پچپن کے لگ بھگ ہوں گے۔ بی۔ اے تھے۔ گویا ہمارا مدمقابل اگر کوئی اس دفتر میں تھا تو وہ ایڈیٹر صاحب تھے، اور وہ بھی کیا عمر سے ڈھلے اور اِدھر اُدھر سے نکلے، جوں کہ ہم بوجہ سنّ سے تازہ ولائت تھے اس لیے اُردو زبان میں انگریزی بولتے تھے۔ ہر کاغذ انگریزی لب و لہجہ میں طلب کرتے کاتب اور عملے کے دوسرے لوگ ہم کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے اور ہم اپنی جگہ پر یہ سمجھتے کہ غالباً ہم دوسرے بی۔ اے ہیں جو آج اس دفتر میں اس طرح کھلی حالت میں دکھائی پڑے ہیں ورنہ عام طور پر بی۔ اے برسوں گھر سے کب نکلتے ہیں پہلے دن ایڈیٹر صاحب نے انگریزی اخبار میں دو تین غیر ملکی خبروں پر نشان بنا کر دیا اور کہا کہ آپ ان کا ترجمہ کیجیے۔ ہم نے قلم برداشتہ ترجمہ کرنا شروع کر دیا مگر ہمارے ترجمے کو عام ترجموں پر یہ افضلیت حاصل تھی کہ ہمارے یہاں زیادہ الفاظ انگریزی کے تھے جن کو ہم نے اُردو

رسم الخط میں لکھ چھوڑا تھا، بقیہ اُردو کے الفاظ بھی وہ تھے جو عام طور پر اُردو اخبارات میں استعمال نہیں ہوتے، چونکہ اخبار میں ترجمہ کرنے کا یہ پہلا اتفاق تھا، اور زیادہ تر انگریزی ہی کی کتابیں زیر مطالعہ رہی تھیں۔ اس لیے ہم اُس ترجمے کو یہ سمجھے تھے کہ اب ہمارے ترجموں سے اُردو صحافت میں بی۔ اے پاس ترقی پسندانہ ترجموں کے ایک نئے باب کا اضافہ ہوگا، بہرصورت ہم نے بغیر جھجک محسوس کیے تینوں خبروں کے ترجمے ایڈیٹر صاحب کے حوالے کر دیئے۔ ایڈیٹر صاحب ایڈیٹوریل لکھنے میں مصروف تھے۔ جب وہ اپنا کام ختم کر چکے تو انھوں نے ہمارے پہلے پرچے پر نگاہ کی ہم آنکھیں بچا بچا کر اُن کی طرف دیکھتے جاتے تھے کہ دیکھیں ہماری ڈگری کا کس کس عنوان سے اُن پر رعب پڑ رہا تھا۔ ہم نے دیکھا کہ ان کی آنکھیں جوں جوں ہمارے ترجمے کو پڑھتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھیں وہ زیادہ سے زیادہ کھلتی اور پھیلتی جاتی تھیں۔ اور ساتھ ہی ساتھ ان کے لبوں کی سنجیدگی مسکراہٹ سے ہم کنار ہوتی جاتی تھی ہم سمجھے کہ خبر ختم ہونے کے بعد وہ پُرزور الفاظ میں ہماری قابلیت کا اعتراف کریں گے اور کہیں گے کہ آپ تو مادر زاد مترجم ہیں، مچھلی کے بچوں کو تیرنا کون سکھائے، مگر انھوں نے سرخ روشنائی والا قلم اُٹھا کر ہمارے ترجمے پر خط تنسیخ پھیر دیا اور بقیہ دو خبروں کو بغیر پڑھے ہماری طرف بڑھاتے ہوئے کہا کہ اب دو ایک روز اُردو اخبار پڑھ کر انگریزی کے مترادف الفاظ لکھنے کی مشق کیجیے: اس کے بعد صحافت کے پیشے سے ہمارا دل کھٹا ہوگیا۔ کیونکہ ہم یہ چاہتے تھے کہ ہلدی لگے نہ پھٹکری مگر رنگ چوکھا آئے۔ لہٰذا اب ہم غور کرنے لگے کہ ہماری بی۔ اے کی ڈگری کہاں کہاں بغیر کسی زحمت کے پوری پوری فٹ ہو سکتی ہے۔ سوچتے سوچتے یہ سمجھ میں آیا کہ ملازمت کا خیال ترک کرکے پہلے شادی کر ڈالو۔ شادی بیاہ میں ہماری بی۔ اے کی ڈگری ہمارے حسب منشا براہ راست فٹ بیٹھے گی۔ یہ خیال آتے ہی ہم اچھل پڑے ہم نے کہا کہ بس اب طے کر لیا کہ پہلے شادی کریں گے۔ اولاد کم پیدا کریں گے اور روپیہ زیادہ۔ مگر پھر سوال یہ پیدا ہوا کہ بی۔ اے پاس ہیں۔ اس لیے اگر ملازمت کی صورت انگلستان میں نکلی تو یوں تو بہرصورت مزے رہیں گے۔ مگر اس صورت میں بیوی بچوں کا الاؤنس بھی ملتا ہے۔ لہٰذا دوسرا خیال ترک کیا یعنی یہ کہ اولاد پیدا کرنے میں احتیاط سے کام لیں گے۔ بلکہ چاہیے یہ کہ شادی کرتے ہی پہلے کھلکھا کر بچے

پیدا کر ڈالیں۔ اس کے بعد غیر ملکی ملازمتوں کے لیے درخواستیں دیں۔ اسی غور و فکر میں ہم کو نیند آگئی۔
اور ہم نے خواب میں دیکھا کہ جیسے ہماری شادی ہو گئی ہے اور شیطان کی آنت سے بڑا بجوں
کا ایک کیو ہمارے پیچھے پیچھے چل رہا ہے، ہمارے آگے ہماری بیوی ہے۔ اور بچے پیدا کرتے
کرتے وہ کچا لو کا مکا ہو کر رہ گئی ہے اور ہم پھٹے حالوں اس کے پیچھے پیچھے چل رہے ہیں۔
ہمارے شیر خوار بچے کے مُنہ میں ایک چوسنگا ہے جس سے بی اے کی آوازیں نکل رہی ہیں ہماری
بیوی اور ہمارے بچوں کو کئی روز سے کھانا نہیں ملا ہے۔ سب سے چھوٹا شیر خوار بچہ جس کو کئی
بیوی اور ہمارے بچوں کو کئی روز سے کھانا نہیں ملا ہے۔ سب سے چھوٹا شیر خوار بچہ جس کو کئی وقت
سے دودھ نصیب نہیں ہوا ہے رو رہا ہے اور اس کو بہلانے کے لیے ہم نے اپنی بی اے کی ڈگری کی ایک بتی
بنا کر اسے دے دیا ہے جسے گڑبڑا کر اور دودھ سمجھ کر اس نے چوسنا شروع کر دیا ہے اس سے اس
کا رونا بند ہو گیا ہے بیوی ہم سے پوچھ رہی ہیں کہ کیا کوئی چیز مل گئی ہے جو بچے نے رونا بند
کر دیا ہے۔ ہم نے کہا بولو مت۔ وہ ہماری ڈگری چوس رہا ہے اس پر وہ جھپٹ کر چوسنگا اس
کے منہ سے نکالنے لگیں اور ہم نے اُن کا زور سے ہاتھ جھٹکنے کی کوشش کی تو ہماری آنکھ کھل
گئی ــــ ہم نے کہا لاحول وَلاقوت، کتنا بھیانک خواب تھا۔

بیتی بات

سید آوارہ

بات اگرچہ پرانی ہے، مگر اتنی نہیں کہ مجھے اپنی وہ رات بھول گئی ہو۔ جب میں پہلی بار دِلی
گیا اور اپنے ایک عزیز کا مہمان ہوا۔ دوسری جنگِ فرنگ کا آخری دَور۔ دُور سمندر پار گھمسان
کا رن پڑا تھا۔ گورے گورے لڑ رہے تھے اور اس پار ہم نون تیل لکڑی کو ترس رہے تھے۔
زندگی کی ہر ضرورت پر راشن کی مُہر لگی تھی۔
یہ شاید عیسوی سن چوالیس ۴۴ء تھا جو ایک دن بیٹھے بیٹھے تلوے کھجلائے، سر پر شیچر سوار ہوا دِلی کا
سفر سُوجھا۔ پروگرام بنا ہی تھا جو یہ سوال کانٹے کی طرح کھٹکا کہ اجنبی جگہ ٹھہریں گے کہاں؟ ہوٹل کا
خیال جیب کی گنجائش سے باہر تھا۔ ٹھٹھر کے رہ گیا۔ قریب تھا کہ بنی بنائی اسکیم پر اوس پڑ جائے جو
گھر والوں میں سے کسی نے گُتھی سُلجھا دی۔ جس کا حل نکلے ایک عزیز بتایا گیا کہ میرا ان کا رشتہ ایسا دُور
کا نہیں کچھ پیڑھی اوپر جا کے ہم دونوں آدم زاد بھائی تھے۔ چنانچہ اس طرف سے اطمینان کر کے جواب
طلب رجسٹری سے بہت بنا چُنا کر خط لکھا گیا۔ اور جواب کے انتظار میں وقت بے وقت ڈاک گھر کے چکر
کٹنے لگے۔

جواب آیا۔ بڑی اپنایت سے لکھا تھا: کرامت نامہ آیا، چوما چاٹا، آنکھوں سے لگایا۔ بسم اللہ تشریف لائیے۔ میں آپ کا، گھر آپ کا، اسٹیشن پر شاید حاضر نہ ہو سکوں۔ تانگے والے کو پتہ دیجیے گا۔ کوٹھی کے پھاٹک پر مجھے دیدہ و دل فرش راہ پائیے گا۔ سوکھے دھانوں پانی پڑا۔ سفر کی تیاری شروع کر دی۔

سواری کی مد میں چند یکے ہیں جن کے بل پر سارا قصبہ چلتا ہے۔ انھی میں وہ فرمائشی دو تین عدد ہیں جنھیں ریل پر جانے کا دوامی حق حاصل ہے اور نچوڑ کر ان کی تعریف یوں کی جا سکتی ہے کہ انھیں تسلیم کرنے کے لیے آپ فرض کر لیں کہ یہ یکے ہیں، ورنہ صورت شکل اور ہیئتِ کذائی کے اعتبار سے ان کی یکیت کا ثبوت درکار ہو تو حکیم بطلیموس یا فیثا غورث کے دوسرے جنم لینے تک انتظار کرنا ہوگا۔ راقم یکہ بازی کے فن میں ایک بہرے سے نادار ہے۔

یہ یکے قانون حرکت کے عام اصول سے ہٹ کر ایک مستثنیٰ قاعدے کے تحت چلتے ہیں یعنی آپ ایسے یکے کا تصور کریں جس کے دونوں پہیوں میں ایک' اور 'پون' کی نسبت ہو۔ پھر ان پونے دو پہیوں کی حرکت دوری کو بموں کے واسطے سے اپنے ٹٹو تک منتقل کر دیں جو پنج عیب شرعی تو کیا پنجاہ عیب شرعی رکھتا ہو۔ چابک کی پھٹکار اور یکہ بان کی ٹٹکاریوں کا جواب پہلے جھرجھریوں اور دولتیوں سے دے، پھر چلے تو اس حساب سے کہ اگلے قدم جتنے بڑھیں، اس سے سوائے پیچھے ہٹیں۔ رستے میں اودوائن یا پرانی نواڑ کا ساز ٹوٹتا جائے تو اس کا فائدہ ٹٹو اٹھائے۔ خود ٹٹو صاحب کا حلیہ بھی سن لیجیے۔ یہ کہنا کافی ہوگا کہ ان یکوں کے ٹٹو، ٹٹو تو کیا، ٹٹو کا شبہ ضرور ہیں۔ ان کے بارے میں ایک تھیوری یہ بھی پیش کی جاتی ہے کہ گٹھری بھر سوکھی ہڈی پسلی جوڑ کر، ٹٹو کے سانچے میں ڈھالی گئیں، اس پہ کھال منڈھ کے ہوا بھر دی گئی، ہو گیا ٹٹو۔

چنانچہ اگلی مردم شماری میں اپنے "ہونے" کے خیال سے یکے کی سواری کو سلام اور گھر سے اسٹیشن کے درمیانی دو میل اپنے پیروں چلنے کا فیصلہ کیا گیا۔

اُن دنوں ریل کا سفر، وہ بھی کسی نچلے یا منجھلے درجے میں کچھ اسی من چلے کو پھبتا تھا جس کی ہڈیاں چونے کے بدلے فولاد کی بنی ہوں اور جسم کے ہر جوڑ بند میں پیل پیل کے سیسہ بھرا گیا ہو، یا پھر ایسے پُر زر مسافر کو راس آتا تھا جس کے ڈبے میں واجبی کرایہ دینے کے ساتھ ساتھ

بابو جیوں کے حق حقوق ادا کرنے کی صلاحیت بھی پائی جائے ورنہ ہوتا یہ کہ بیچارے کا ٹوٹا ڈھانچہ ریل پر لد گیا، اور آتما ٹکٹ گھر کی کھڑکی پہ منڈلاتی رہی یا جسم پلیٹ فارم پر رہا اور روح منزل مقصود کو پہنچ گئی۔

بعد اس تمہید کے نیت کی میں نے واسطے سفر کے منھ میرا طرف شاہجہاں آباد دلّی کے۔ بسلامت روی و باز آئی۔

ایرجنسی ٹائم ٹیبل کے مطابق سوا تین کے بعد کسی وقت بھی ریل کے آنے اور معتبر راویوں کی سند سے خدا نے چاہا تو آج اسٹیشن پر ٹھہرنے کا بھی امکان تھا۔ اس لیے احتیاطاً بارہ بجتے ہی گھر کو خدا کے سپرد کیا اور تاروں کی چھاؤں میں میرا جلوس اس ترتیب سے اسٹیشن کی جانب راہی ہوا کہ سب سے آگے لکھا، قوم چمار، ہات میں لالٹین۔ اس کے پیچھے رمدینا قوم ایضاً۔ آتا جی در بغل، پھر للتا پاسی، ہولڈال بر سر۔ اس کے بعد خود بدولت یعنی میں بہ نفس نفیس اور میرے نقش قدم پر میاں خاں زماں خاں پٹھان، بار برداری کے کوتل جوان۔

جوار باجرے کے کھیتوں میں ہری ہری بو سے مست ہو کر جھینگروں کی جھنکار اور مینڈکوں کی ٹرٹر سے برسات کی رت بول رہی تھی۔ جگنوؤں کی جھم جھم سے گویا تارے زمین پر اتر آئے تھے پچھلے پہر کی بھیگی فضا میں یہ خاموش جلوس رواں تھا جو اندھیری رات کے اس سرے پر ایک بجھی سی روشنی دکھائی دی، ساتھ ہی لال لال دیدوں کا سفید سگنل، اور قصبے کا غریب سا اسٹیشن نمودار ہو گیا۔ میں نے وہیں کھڑے کھڑے سجدۂ شکر ادا کیا کہ بارے سفر کی پہلی منزل کسی سانحے یا ماجرے کے بغیر طے ہو گئی۔

اسٹیشن میں میرے اور جلوسیوں کے سوا باقی سناٹا تھا البتہ مٹھائی کے جھوٹے چپ چپے دونوں پر فراغت سے سر رکھے ایک چت کبرا الیفنٹی ضرور پڑا تھا۔ شاید یہ اسٹیشن ویٹنگ روم کے لیے موزوں نہیں، یا ویٹنگ روم کے لیے اسٹیشن بے محل ہے ناچار تیسرے درجے کے مسافر خانے میں اناج کے بوروں پر براجنا پڑا۔ دستے میں دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز۔ تار گھر کا دروازہ کھلا اور سنائی دیا جیسے کسی بھیڑ کے ادھ کٹے نرخرے سے "چور چور" نکل کر زمین کی چھت سے ٹکرا رہا ہو۔ اس ہنگم صدا کے آتے ہی دونوں چمار بورے کی آڑ میں سرک گئے۔ پٹھانوں نے لٹھ سنبھالے،

لالٹین کی بتی چاق کر کے دیکھا، لپٹی ہوئی جھنڈیاں تانے پٹ کی آڑ میں تار بابو کھڑے بید کی طرح
لرز رہے تھے۔ جسم کے فوری سکڑ جانے سے دھوتی کی بندش کھسک کے پنڈلیوں پر جا پڑی تھی
اور اس کی تہوں میں سے پانی کا سانپ جیسا نہ جانے کیا نکل کے فرش کے ڈھلاؤ کی طرف بھاگا
جا رہا تھا۔

بابو جی میری پارٹی کے بونا فائیڈز کی طرف سے مطمئن ہو چلے تھے جو تار کی "گرگٹ" نے ریل
کی آمد کا سندیسہ دیا۔ دیکھا تو پسنجر کا انجن تاریک افق پر برقی ہیڈ لائٹ کی تیز کرنیں لیں پر بکھیرتا
ہوا چلا آ رہا تھا۔ انجن تو خیر برادری باہر ہونے سے اندھا بھی دیکھے مگر مرتگ گاڑیوں کی درجہ
بندی، اس حالت میں کہ یہاں سے وہاں تک پورے پلیٹ فارم کا نام ظلمات ہو سنگ آمد و سخت
آمد تھا۔ ریل رکتے ہی خان صاحبوں کی پٹھانی دیکھنے کی چیز تھی۔ جنھوں نے خاصے پانچ فٹ چار
انچ کے آدمی کو جلدی جلدی تہہ کر کے بقچی بنایا اور ایک ہائسو کے ساتھ جھولا دے کے پھینکتے
ہیں تو کھڑکی رستے ایک درجے میں، ایسے کیا جیسے گوپھن سے پتھر۔ اوپر سے اٹاچی اور بستر۔
ریل چل دی۔

پڑے پڑے اپنا سراپا دیکھ کے خیال آیا کہ "دودھوں نہاؤ" کی دعا دیتے ہوئے گھر کی
نانی دادیوں کو اپنی ذمہ داری یا موقع مناسب کا مطلق احساس نہیں ہوتا۔ جس جوہیئے میں
خاں صاحبوں نے مجھے جھونکا تھا، اس میں مسافروں کی جگہ دودھ بھرے کلسے دھرے تھے
اور دعاؤں کی اجابت کے سلسلے میں ہم سر سے پیر تک سنے پڑے تھے۔

میل پر میل کھاتی، ریل فراٹے بھرتی چلی جا رہی تھی۔ اوپر گھیرے بادل تھے نیچے کالا دھواں
اسی میں تار کے کھمبے چائیں مائیں کرتے آتے اور آنکھ سے اوجھل ہو جاتے۔ آنے والے
جنکشن پر ہمیں اترنا اور ریل کے ساتھ کپڑے بھی بدلنا تھے۔ ڈبے میں دودھ کی نہریں
بہہ رہی تھیں۔ چار پانچ کلسے اوندھے پڑے تھے۔ جو رہ گئے تھے وہ بھی ٹکرا ٹکرا کے ہلکے ہو رہے
تھے۔ مجھ پر مکھیوں کی یورش تھی۔ اب گاڑی ایک بلندی پر رینگ رہی تھی۔ جنکشن دکھائی دے
رہا تھا۔ کٹ کٹ! یہ قینچی آئی۔ کٹ کٹ وہ قینچی آئی، پٹری بدلی اور ریل تھم گئی۔

"ویٹنگ روم۔ فرسٹ کلاس" میں نے کہا۔

"بے ٹنگ روم ہاں نہ جائے پہیو۔ ہواں گورا لوگ پہڑے ہیں۔ نساماں کو ٹو ایک ڈگ
دھر دیہے، پران بکس جہیں۔ ہم تم کا گنواں پہ چھانڑے دیت ہیں۔ مجے ہاں کلا دتوں کرو ڈلی
کیر اکس پرس آئے بریا ہم تم کا ئے جائے کے چڑھائے دیبا۔ رپیا ایک لگہے جانو۔" پڑبے
قلی نے فرمایا۔

مجبوری کا نام صبر ہے۔ حکم کی تعمیل کرنا پڑی۔

تانگہ رکا اور ایک شاندار کوٹھی کے پھاٹک پر سراپا انتظار میرے میزبان دکھائی دیے۔ عام
علیک سلیک اور مزاج پرسی کے بعد ایک دوسرے کا نظری جائزہ لیتے ہوئے آگے بڑھے۔
کوٹھی کے سامنے نہایت سر سبز اور شاداب لان تھا جس کا حاشیہ کھلے ہوئے گلابوں کا گلستان
بنا ہوا تھا۔ چلتے ہوئے ان برادر نے میری تاریخی معلومات میں یہ کہہ کر اضافہ کیا کہ یہ کوٹھی دارا شکوہ
کے ایک محل کی بنیادوں پر بنائی گئی ہے۔ اب قدامت کی یادگار صرف ایک حمام رہ گیا ہے جس
میں اب صاحب خانہ کا باورچی خانہ ہے۔ کوٹھی کی پشت پناہ شاہجہاں آباد کی فصیل ہے جس
کے پاؤں کبھی جمنا چومتی تھی۔ کوٹھی کے بائیں پہلو پر دس بارہ سیڑھی اتر کے ایک عمارت میں
پہنچے جس کی سطح کوٹھی سے بہت نیچی تھی۔ یہاں ٹھہرا کے ان بھائی نے فرمایا:

"ماحضر لاتا ہوں اس سے فارغ ہو کے آپ کو وہاں لے چلوں گا جہاں آپ جب
تک جی چاہے بے تکلف قیام فرما سکتے ہیں۔" یہ کہہ کر گئے تھے اور کوٹھی کی بھول بھلیاں میں غائب
ہو گئے۔ میں اتنے میں سجے ہوئے ڈرائنگ روم، بیڈ روم اور نہ جانے کتنے ضرورت بے ضرورت
روموں کے نقشے اور اپنے آرام و آسائش کی خیالی تصویریں بناتا بگاڑتا رہا۔ دس پندرہ منٹ
گزرے ہوں گے کہ وہ آئے اور میرا سوٹ کیس اٹھاتے ہوئے پوچھا "آپ سگرٹ تو
نہیں پیتے شاید؟" جواب میں "نہیں" سن کر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے انھیں بڑے خطرے
سے نجات مل گئی۔ اب مجھے لیے وہی پہلی سیڑھیاں، پھر چمن طے کر کے کوٹھی کی داہنی سمت چلے
اور چلتے ہی رہے، یہاں تک کہ وائٹ ہاؤس کی وضع کی ایک عمارت آ گئی۔ میرے سامنے
ایک مقفل دروازہ تھا۔ کہا گیا کہ یہی میری آرام گاہ ہے۔ اور اب انھوں نے ایک عجیب سا
سوال کیا: "آپ کے پاس ماچس کی ڈبیہ ہے؟" اس کا جواب بھی نفی میں پا کر انھوں نے

ہم سنجیدگی بن کے فرمایا: "یہ کارخانہ ہے جس میں چھپی ہوئی کتابوں کی کاٹ چھانٹ اور جلد بندی ہوتی ہے۔ میں کارخانے کا فورمین ہوں۔" یہ کہہ کر انھوں نے قفل کھولا۔ دروازے کے پار اس کال کوٹھری میں کیا تھا، پتہ نہیں چلا۔ میزبان برادر نے باہر ہی باہر دیا سلائی کھینچی اور اس کی مدھم روشنی میں اٹاچی اور ہولڈال لیے ہوئے میں نے آگے قدم رکھا ہی تھا جو کوئی دو فٹ نیچے زمین میں دھنس گیا۔ توازن قائم رکھنے کے لیے دوسرا قدم اٹھایا تھا کہ سارا جسم بے قابو ہوگیا، اور اٹاچی ہولڈال دونوں گڈمڈ ہوکر من تو شدم تو من شدی، مجھ سمیت قلابازی کھا گئے۔ بھلے کو زمین تنگی نہیں تھی، ورنہ جو ہوتا وہ آپ کے نہیں، میرے اور ڈاکٹر کے سمجھنے کی بات تھی۔ میں کھسیانا ہوگیا۔ اس پر میزبان برادر نے ہنسی بھینچتے ہوئے فرمایا: "کچھ نہیں، کاغذ کی کترن ہے اور یہ کٹنگ مشین کا کمرہ۔" کمرے میں بجلی نہ تھی۔ کہا گیا کہ "اس کمرے میں کیا پوری عمارت میں بجلی یا لمپ، لالٹین، دیا سلائی یا بیڑی سگرٹ سلگانے کی سخت ممانعت ہے، اور اس ضابطے کی خلاف ورزی اور ہماری برطرفی ایک ہی بات ہے۔" میں نے بھی ان کی ہاں میں ہاں ملائی۔ اور سوچا کہ بستر و ستر کیوں کھولا جائے۔ بچھی ہوئی کترن لحاف توشک دونوں کا کام دے گی۔ مگر تکلف کے مارے کچھ نہ کہہ سکا۔ سامنے بہت بڑی کٹنگ مشین کا ڈراؤنا ڈھانچا اس کال کوٹھری میں ایسا جان پڑتا تھا گویا انقلاب فرانس کے خونیں دور کی 'گلوٹین' کھڑی ہے اور ہو سکتا ہے کہ میرے ہی گلے کے لیے ہو۔ اسی اُدھیڑبن میں تھا جو میزبان صاحب نے "خدا حافظ" کہہ کر مجھے اس ظلمات کے سپرد کیا اور رات بھر کے لیے رخصت ہوگئے۔ کترن کی گرمی نے جسم کے کل پرزے ڈھیلے کر دیئے۔ نیند آنے لگی۔ کیا کرتا، اٹاچی کا تکیہ بنا کر لیٹا اور سو گیا۔

اللہ جانے کیا بجا تھا جو اچانک پیر کے انگوٹھے میں جیسے کسی نے سُوئی چبھو دی ہو۔ اُف کر کے پاؤں جھٹکا تو گدے کوئی گدگدا جسم اُچٹ کر سینے پر آگرا۔ ہلکا سا بوجھ محسوس کر کے ہاتھ سے جھٹکا۔ ساتھ ہی چوں چوں کرتا کوئی چھاتی کا بوجھ ہلکا کر گیا۔ یہی حملہ ایک بار ناک کی نوک پر ہوا۔ یہ جگہ نازک اور انگوٹھے کی کھال سے زیادہ حساس تھی، درد اور چبھن بھی اسی نسبت سے ہوئی۔ تیسرے کے کان کی لَویں آن دیکھے حملہ آور کی زد میں آئیں۔ یونہی رات بیتتی گئی۔ اٹھا

بیٹھا، لیٹا، جسم کے کُھلے حصے چھلنی ہوتے رہے۔ اب نیند فیرو ہو گئی تھی۔ کترن گھڑ دوڑ کا میدان تھی۔ کھڑ کھڑ، چوں چوں کا سلسلہ جاری تھا۔ چاہا کہ اٹھ کے دروازہ کھول دوں، ان گھاتیوں کا زور کچھ تو کم ہو۔ اُٹھا ہی تھا، اندازہ نہیں ہوا۔ مشین کا ایک ہتھا کٹاک سے ماتھے پر لگا۔ آنکھوں تلے تارے چھٹک گئے۔ پیشانی سہلاتا ٹٹول کر اُٹھ بیٹھا۔ یہاں تک کہ ٹَٹّیوں کی درازوں سے صبح کی ہوا چھنی اور کچھ دیر بعد باہر کی زنجیر کھٹ کھٹ ہوئی، قفل کُھلا۔ میزبان صاحب کُھلی فضا میں ناشتہ کی کشتی لیے کھڑے تھے۔ میں نے جلدی جلدی سامان بغل میں مارا اور اس کال کوٹھری سے نکل کر کوٹھی کے پھاٹک کی طرف لپکا۔ پیچھے پیچھے صدا آتی رہی: "سنئے تو، بھائی صاحب، سُنئے تو، پہلے پہل یہ ناشدنی مہمان یوں ہی ستاتے ہیں۔" مگر میں کہاں تھا۔

مونچھیں

سید آوارہ

میں اب تک اِس غلط فہمی میں تھا کہ یہ مونچھیں جو آج لگ بھگ تین بیسی ساٹھ برس سے دم کے ساتھ چلی آرہی ہیں، میری اپنی جائداد ہیں، اور نائی کو چھوڑ کر جسے صرف اتنی چھوٹ ملی ہے کہ ہر دوسرے تیسرے، وہ بھی اپنی رائے سے نہیں، میری مرضی کے مطابق ان کی نوک پلک ٹھیک کردے، اور کسی کو ان کی کتر بیونت، کاٹ چھانٹ میں دخل دینے، مین میخ نکالنے کا حق نہیں۔ ان کا اَن داتا ہوں تو میں، پالن ہار ہوں تو میں، اور میرے اس پیدائشی حق میں کوئی ساجھی نہیں، یہ میری ہیں اور صرف میری ہیں۔

چنانچہ میں اِن مونچھوں کی شکست و ریخت میں اپنی من مانی کرتا رہا، اور کسی بڑے سے بڑے افلاطون خاں کو کبھی ان کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھنے کی جرأت نہیں ہوئی، اب ایک خدائی فوجدار، دخل در معقولات، مان نہ مان میں تیرا مہمان قسم کا گروہ نکلا ہے، جو اور تو اور اِن مونچھوں پر بھی اپنا عملہ دخلہ جتاتا ہے۔

جب سے میں برت رہا ہوں، ان مونچھوں پر کئی دَور بیتے ہیں۔ برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن

جو اوپر کے ہونٹ پر ریشمی رواں چمکا اور مسیں بھیگیں، تب شُبھ گھڑی نیک ساعت دیکھ کر کنبے برادری کی بیویوں کو بُلاوا دیا گیا۔ سورج ڈھلنے سے پہلے کورے کونڈوں میں گرم گرم جلیبیاں بھر کے چوکیوں پر جمایا گیا، مہمانوں میں سب سے بڑی بوڑھی سہاگن نانی دادی نے نیاز دے کر پہلی جلیبی کھائی، پھر باقی بیویاں جُٹ پڑیں اور دم کے دم میں کونڈے صاف کرکے مبارک سلامت کہتی رخصت ہوگئیں۔

اِس رسم نے گویا اعلان کردیا کہ صاحبزادے نام خدا جوان ہوگئے چڑھتا خون، مونچھوں کی فصل دن دونی رات چوگنی بڑھنے لگی اور میں سوچتا رہا کہ انھیں کس سانچے میں ڈھالوں' اور چہرے کا کینڈا دیکھتے ہوئے کس فیشن کی پالوں۔ پڑوس میں ڈول کا اڈا تھا، مونچھوں کے فرق سے اپنی اور ایک کہار کے چہرے کی کاٹ ملتی جلتی پائی۔ دس پندرہ دن کی لگاتار اَینٹھن میں اپنی مونچھوں کا رُوپ بھی وہی بن گیا، میری اور بلتو کہار کی مونچھیں جڑواں بہنیں دکھائی دینے لگیں۔ وہی کڑوے تیل سے چکنائے چمکیلے بال، وہی نوکیں چھلّے دار۔

کچھ دن بعد ایکا ایکی ان سے جی بھر گیا۔ جانتے ہیں اب کیا کیا میں نے؟ ان چھلّوں کو پورس گیر میں ڈال دیا۔ انگلیوں کے پَور سے سُن پڑ گئے تب کہیں اِن کے بل نکلے۔ نئے نمونے کی تلاش میں تھا جو اپنے ایک اسکول ماسٹر کی مونچھیں پسند آئیں۔ ماسٹر صاحب پڑھاتے کم تھے۔ کاسمٹک کی لپٹ دی ہوئی چوہیا کی دم مونچھوں کا رعب زیادہ جماتے تھے۔ یہ وضع نبھ نہ سکی۔ کاسمٹک کی بُو سے بار بار چھینکوں کی ڈاک بیٹھنے لگی۔ آچھیں! آچھیں! کی باڑھ چلنے لگی، اور زکام نے ناک میں دم کردیا، ناچار انھیں سلام کرنا پڑا۔ اب جو فیشن میں نے بدلا اس سے مونچھوں کی شکل مَڈل بریکٹ جیسی بنی تھی۔ اس کے لیے دونوں نوکیں اُٹھا کر کلّوں پر چپکانا، اوپر سے پٹی باندھنی پڑی۔ یہ تو کسی نے جانا نہیں کہ پٹی تلے کیا بھید تھا، ہونٹ بال توڑ نکلا سمجھ کر کسی نے پلٹس باندھنے کی صلاح دی تو کسی نے آپریشن کرانے کی۔ پٹی بندھتی رہی، کھُلی تو نئے نمونے کی مونچھیں تیار تھیں، نہایت شاندار بڑے رعب داب کی قیصر ولیم کی مونچھوں سے ٹکّر لینے والی۔

ارے صاحب ایک قانونئے دوست سے ملاقات ہونے پر یہ خطرناک نکتہ کھلا کہ لٹھی نوکوں کی یہ اُٹھی دار مونچھیں انسانی کمزوری کے کسی نازک لمحے میں فرشدید کا سبب

اور جرم قابل دست اندازیٔ پولیس بن سکتی تھیں، اور میں بیٹھے بٹھائے تعزیرات کی دفعہ فلاں کی رُو سے پہلے حوالات، پھر ترقی پاکر جیل خانے بھیجا جاسکتا ہے۔

سوچا۔ بات لگتی ہوئی تھی، آؤ دیکھا نہ تاؤ، ایک دم اُسترہ پھروا دیا۔ یہ عمل مدتوں جاری رہا۔ شامت جو آئی دفعتاً من میں اچنگ اُٹھی کہ مونچھیں پھر سے پالی جائیں۔ اس فیصلے کا اعلان کرنا کیا تھا بھڑوں کے چھتے کو چھیڑنا تھا۔ نہیں نہیں کرکے دس بارہ ساتھی چمٹ ہی تو گئے۔ سب نے ایک آواز ہوکر کہا: "بسنت کی کچھ خبر ہے جناب کو! آپ ہم پنچوں میں بیٹھے ہیں، اب آپ اپنے بس میں نہیں، پرائے بس میں ہیں۔ جگت بھاتا پہننا تو پڑتا ہی ہے، اب من بھاتا کھانے پر بھی ہم پنچوں کی مہر ہوگی تب نوالہ توڑنا ہوگا۔" "آپ کو پنچ بنایا کس نے ہے؟" میں پوچھا۔ جواب ملا: "بناتا کون، ہمیں خود بننا نہیں آتا۔" ان میں سے ایک نے فرمایا: "بارہ برس سے منڈنے والی مونچھیں اب ٹائم بار ہوچکیں۔ آپ نے رکھ لیں تو ہم پنچوں کی آنکھ میں پھانس کی طرح کھٹکے گیں اور بھی سنئے آپ نے مونچھیں پال لیں تو بہتر جگہ اپنا حلیہ بدلوانا پڑے گا پچاس جگہ بیان حلفی بیان دینا ہوگا کہ آپ وہی ہیں جو بارہ برس سے ہیں پھر محلے بھر کے جانے پہچانے گئے آپ کو اجنبی جان کر بھونکیں گے، کوئی کوئی محتاط لوگ آپ پر جاسوس ہونے کا شبہ کریں گے۔ بچے آپ کو دیکھ کر بھاگنے لگیں گے۔" اس پر سب نے مل کر ایک دوسرے کی ہاں میں ہاں ملائی اور نہ بھی مجھ میں ایک بڑی کمزوری ہے وہ یہ کہ میں ایک امن پسند شہری ہوں، ان پنچوں کی دھونس میں آگیا، مگر رہ رہ کے سوچتا ہوں کہ آخر یہ مونچھیں ہیں کس کی، میری یا ان پنچوں کی۔

آنے کو تو پنچوں کی دھونس میں آگیا مگر اپنی بے بسی پر اندر ہی اندر پیچ تاب کھاتا رہا۔ سوچا تھانے میں رپٹ کردوں اور مونچھوں میں خواہ مخواہ دخل در معقولات کے ارتکاب یا اور کسی دفعہ کے تحت نجی کرا کے ان پنچوں کی ٹنڈیاں کسوا دوں۔ کچہریوں کے کیڑے ایک منشی جی سے مشورہ کیا جنھوں نے حق المحنت کے پیشگی دو چہرہ شاہی ہتیا کے بتایا: "مداخلت بے جا کا کیس ہوتا تو آپ کا کیس سولہو سے ہرا تھا مگر دخل در معقولات کے بارے میں قانون ساکت ہے۔ آپ پنچوں کا بال بیکا نہ کرسکیں گے۔" پھر بڑی اپنائیت سے شہری تعلقات کا رشتہ جتا کر فرمایا: "اس مشورے کی فیس نہ لوں گا آپ ہمارے۔۔۔ صاحب سے مل لیں۔

وہ مخالف کو زیر کر دینے کے بادشاہ ہیں۔ ایسے ایسے قانونی گر اور نایاب چٹکلے انھیں ازبر ہیں کہ ایک نہ ایک داؤں پہ رکھ کے حریف کو یوں چاروں شانے چت کردیں گے کہ پریوی کونسل تک آپ کا بول بالا رہے گا۔ اور آپ خم ٹھونک کے اپنی من مانی مونچھیں پالنے میں آزاد ہوں گے منشی جی کی بات کچھ جچی نہیں۔ "۔۔۔ صاحب" کے جنگل میں پھنس کر جیب ہلکی ہونے کا مزید خطرہ تھا انتقام کی آگ بھڑکتی رہی، اور میں مونچھوں کے غم میں جھلستا رہا۔ جو ئندہ یابندہ۔ اب کے ایک بڑے مقدمہ باز، بلکہ یوں کہیے کہ مقدمہ ساز سے اپنا دکھڑا رونے کا موقع ملا۔ ساری داستان گہری آنکھوں سے سن کر بے ساختہ فرمایا: "پنچوں کے فیصلے پر خاموش بیٹھنے میں تمادی عارض ہونے کا اندیشہ ہے۔ فوراً احتجاج کیجیے، احتجاج!" اگرچہ خاصا بھاری بھرکم لفظ ہے مگر ہم بہو بیٹیاں یہ کیا جانیں۔ اسے برتنے اور عمل میں لانے کے حذباب میں بالکل کورا ہوں۔ وضاحت چاہی، طریقہ پوچھا۔ کہنے لگے: "اپنے حق کے لیے آواز اٹھانے، رفع حاجت کے لیے بتڑ مچانے کو احتجاج کہتے ہیں۔ دو گرہ کالے کپڑے کی دھجی بازو پر باندھیے اور گلی کوچے کوچے، مونچھیں زندہ باد کے نعرے لگاتے پھریے۔ اپنا مہرہ دو زورہ کرنا ہو تو دو چار روپیہ کا منہ دیکھیے۔ آس پاس کے دس بارہ مادر پدر آزاد لونڈوں کو چیچی دے کے اپنا ہمنوا بنائیے اور سمجھ لیجیے کہ بازی جیت لی۔"

تجویز بظاہر سولہ آنے کارگر تھی مگر امن عامہ میں خلل ڈالنے، یا دماغی توازن کھو بیٹھنے کی پاداش میں اپنی پیدائشی آزادی سے ہاتھ دھونے کی ہمت نہیں ہوئی۔ آدمی تھے جہاندیدہ تیور دیکھ کے تاڑ گئے کہ یہ میرے بس کی بات نہ تھی۔ بولے "اچھا، احتجاج کی کڑیاں آپ نہیں جھیل سکتے، جانے دیجیے، دوسرا سستا نہایت مجرب نسخہ بتاتا ہوں۔ بھوک ہڑتال سورج نکلنے سے پہلے ڈٹ کر ناشتہ کرنا اور پنچوں کی چوپال کے سامنے چولہے پر آلتی پالتی مار کے چپ چاپ بیٹھ جانا۔ دن چڑھتے چڑھتے شہر میں بات پھیل جائے گی، اپنے پرائے ہمدردی کرنے لگیں گے۔ فاقہ شکنی کے لیے پنچوں پر دباؤ پڑے گا اور شام ہوتے ہوتے آپ پھر سے مونچھیں پالنے کا پروانہ لے کر ہار پھول سے لدے ہوئے گھر آجائیں گے۔"

میں نے کہا: "یہ بھی تو سن لیجیے میں بھوک کا کچا، ہاضمے کا اچھا ہوں، دوپہر تک ٹھیک

نہ سنبھال سکوں گا۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ کھانا دیر سے ملنے پر بچّوں کی کہن سال ماں کے لیے طلاق ہونٹوں تک آکے ٹولی ہے۔" اپنے مشورے کی یوں توہین ہوتے دیکھ کر جھلا گئے اور بولے۔ "یہ نہیں، وہ نہیں تو مونچھیں جائیں جہنم میں۔ میں تمھیں اِتنا کچ پنیدیا جانتا تو اپنا اشرفی تولے کا قیمتی وقت کبھی نہ ضائع کرتا۔"

الغرض دن سرکتے گئے اور گتھی نہ سلجھی۔ اب طرفہ ماجرا سنیئے۔ ایک دن جیسے اِلقا ہوا۔ دیوان حافظ نکالا اور دل میں کہا کہ لاؤ ان رحمۃ اللہ علیہ سے بھی مشورہ کر دیکھوں۔ شاید کہ یہیں بیضہ بَرَد پر وبال۔ بڑے خشوع خضوع سے فاتحے کا ہفت خواں سر کیا اور شاخ نبات کے ہزاروں واسطے دے کر فال طلب کی۔ دل دھڑک رہا تھا۔ ہاتھ میں لرزش تھی جو دیوان کھُلا اور صفحے کی پہلی ہی سطر میں "مردے از غیب بروں آید و کارے بکند" کی خوش خبری دیتا ہوا یہ مصرع نکلا۔

مردے از غیب کے انتظار نے دماغ میں ہل چل ڈال دی۔ یعنی جو کوئی بولا صدا کانوں میں آئی آپ کی کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ "وہ آیا" کہہ کے لپکا۔ ڈاکیہ تھا، بیرنگ خط لایا تھا۔ لاحول ولاقوت۔ پھر زنجیر کھڑکی۔ اس بار حلال خور تھا، دوپہر کی روٹی لینے آیا تھا۔ اسی طرح کئی بار مردے از غیب کے سلسلے میں گھن چکر بنا رہا۔ قریب تھا کہ صبر کا پیالہ چھلک جائے اور حافظ جی کا دیوان دریا برد کر دوں جو دروازے پر کسی نے دستک دی مُنہ سے کچھ اول فول نکلنے کو تھا جو سُنائی دیا: "دہائی میاں کی۔" باہر آیا، میرا شگنی کا شتکار کریما کھڑا تھا "کیا ہے کریم بخش؟" "دہائی ہے میاں کی۔ بیگھے بھر گوبھی کی پود لگائی تھی گانوں کا مکھیا کنویں پر لٹھ باندھے بیٹھا ہے پانی روک رکھا ہے۔ پودے مُرجھا کے زمین ناپنے لگے ہیں۔ چل کے پانی دلوایئے۔" مکھیا شورہ پشت تھا۔ فوجداری کی نوبت آئی تو اپنا دامن بھی اُلجھنے کا ڈر تھا۔ بارے قضیہ رفع دفع ہوا تو اور کئی کام نکل آئے اور حافظ جی کا "مردے از غیب" ذہن سے اُتر گیا۔

شہر میں کہاں تو مونچھوں کو ترس گیا تھا یا اب گاؤں کی فضا میں اُدھر کریما کے گوبھی کا کھیت شاداب ہوا، اِدھر میری مونچھیں چمکیں۔ پانی کو دیکھ کے جیسے مرگی کا دورہ پڑتا ہے ویسے ہی نیچوں کو نہ دیکھ کر مجھے بھی نئے سرے سے مونچھیں پالنے کی ہوک اُٹھی اور اس بار نئے ماڈل کی سوجھی۔ یعنی نتھنوں کے عین نیچے اوپر کے ہونٹ کے بیچوں بیچ ٹھا سا جو گڑھا ہوتا

ہے اسے چھوڑ کر نائی سے اِدھر اُدھر دو خط لگوا دیئے۔ نہ پوچھیے اس دن کی بے پایاں مسرت جب آئینے میں ہونٹ کا گڑھا بالوں سے بھرپور پایا۔

گھر آیا۔ رات تھی۔ اطمینان کی نیند سویا۔ سویرے منہ ہاتھ دھو کے بنا سنورا اور بازار سے گزرتے ہوئے یہ مژدہ سنا کہ پرانے نیچوں کی ٹولی ٹوٹ گئی۔ دو ایک سے بھینٹ ہونے پر جھینپے جھینپے کترا کے نکل گئے۔

ایک گلی میں کئی لونڈے گلی ڈنڈا کھیل رہے تھے۔ ایک نے ہاتھ روک کے غور سے مجھے دیکھا اور پکار کے اپنے ساتھی سے کہا: "ابے چھدّا، دیکھ مونچھ منڈے آ گئے۔" چھدا بولا "اندھا ہے بے، تو نے کیا دیکھا۔ ان کی مونچھ نے بچہ دیا ہے۔" اس پر سب نے قہقہہ لگایا اور میں یہ کہتا ہوا آگے بڑھ گیا کہ "منھ پھٹ لونڈے ہیں پَچ تو نہیں۔"

اب ایک سوال جواب ہے کہ "کارے بکند" کریما کٹرپا تھا یا گوبھی کے روپ میں "مردے از غیب" نے جنم لیا تھا؟

پانچواں منظر

شراب

محمد حسن

تھرتھراتے ہاتھوں اور سرفروشانہ ارادے کے ساتھ، جب کوئی پہلا جام اٹھاتا ہے، تو ہمارے شاعروں اور ادیبوں کے پروپگنڈے کی بدولت سب سے پہلا مغالطہ شراب سے خوش عقیدگی کی شکل میں یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ ہمارے دکھ درد کو بھلا سکتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ شعر و ادب نے دو چیزوں کے ساتھ سخت بے انصافی کی ہے۔ ایک عورت دوسری شراب۔

"دکھ درد"؟ غالباً بہت سی غلط فہمیاں اس سے پیدا ہوتی ہیں، کہ ہمارے ذہن میں دکھ درد کا صحیح تصور نہیں ہوتا۔ دکھ انسانی ذہن اور قوت کی اس منزل کا نام ہے، جہاں وہ حالات کے مقابلے میں خود کو عاجز پاتی ہے۔ لہٰذا بنیادی مسئلہ خارجی ماحول کے ساتھ ہمارے داخلی کیفیات تک بڑھتا چلا جاتا ہے۔ چنانچہ جہاں ہم خارجی حالات کو سازگار بنانے کی تدبیر کرتے ہیں۔ وہاں خود کو مقابلے کے لیے تیار بھی کرتے ہیں۔

دکھ کے احساس کے بعد دو قسم کے تاثرات پیدا ہوتے ہیں۔ ایک استعجاب، اور ایک حادثے کے یکایک واقع ہو جانے کا احساس، اور دوسرے عاجزی اور مجبوری کا احساس۔ اس افراتفری

میں ہوتا بھی ہے، کہ ہم ایک عجیب و غریب مسکراہٹ کے ساتھ غم کے اس احساس کو جھٹک کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ قہقہے اور مسکراہٹ میں فرق ہے۔ قہقہہ ایک پاکیزہ اور صحت مند جذبے کا پتہ دیتا ہے۔ اس میں تروتازہ دماغ اور نفسیاتی توانائی کے ساتھ ساتھ ایک چیلنج کا سا انداز پایا جاتا ہے۔ جو کسی قسم کے کچلے ہوئے جذبے یا گھٹے ہوئے تاثر سے پاک ہوتا ہے۔ کچلی ہوئی شخصیتیں اور زمانہ کے بوجھ سے دبے ہوئے انسان محض مسکرا سکتے ہیں۔ پتلی، بے جان، اور مریض مسکراہٹ ہنس نہیں سکتے۔ پاک صاف اور صحت مند قہقہے نہیں لگا سکتے۔ دبی دبی مایوس اور تلخ مسکراہٹیں ہر گلی کوچے میں بکھری ہوئی پایئے۔ یہ مسکراہٹ کیا ظاہر کرتی ہے؟ نفسیات نے اس پر غور و خوض کیا ہے۔ اور صدہا نتیجے بھی نکالے ہیں۔ میرے نزدیک اس مسکراہٹ کا لازمی سبب نفرت ہی ٹھہرتا ہے نفرت ایک مکمل، اور اگر آپ اجازت دیں، تو ایک مقدس جذبہ ہے۔ مکمل اس لیے کہ اس سے قبل اور اس کے بعد جذبات اور تاثرات کا ایک پورا باب موجود ہے۔ مقدس اس لیے، کہ اس باب میں اکثر چیزیں شخصیت کے مبارک نشو و نما میں مدد دیتی ہیں۔ نفرت کا سلسلہ مضحکہ سے شروع ہوتا ہے۔ اور مضحکہ کی بنیادیں روایات میں دبی ہوئی ہیں۔ روایات نے ہمارے ذہن میں خاص قسم کے تصورات بنا دئے ہیں۔ ایک چیز ایک ہی خاص انداز میں ہونا چاہیے۔ انسانوں کے چہرے چال ڈھال طرزِ زندگی، طور طریقے، ایک ہی خاص طریقے پر ہونا چاہیے اور اسی لیے جب کوئی خوبی نما افیونی ایک منحنی جسم کے ساتھ ہر بار قوالی نکالنے کی دھمکی دیتا ہے، اپنے ناتواں جسم کو طرح طرح سے بل دے کر پینترے بدلتا ہے، تو ہم ہنس پڑتے ہیں، اس لیے نہیں، کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے، غلط ہے، بلکہ صرف اس لیے کہ ہم نے اس سے قبل ایسا ہوتے نہیں دیکھا، یا ہماری رائے میں عام طور پر ایسا نہیں ہوتا، یا نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ اکثر غیر معمولی حرکاتِ استعجاب کے ساتھ ساتھ مضحکے کا باعث ہوتی ہیں۔ اس ایک لمحہ میں کوئی بھی غیر معمولی کردار نفسیاتی طور پر ہم سے کہیں نیچا ہو جاتا ہے۔ اس قدر نیچا، کہ ہم اچھی خاصی بلندی سے اس پر ہنس سکتے ہیں لیکن ہم کس پر ہنس رہے ہیں؟ اس کی پستی اور عجب پر، یا اپنی بلندی، بلکہ تعصباتی ذہنیت پر!!

اور جب دکھ درد، اور اس احساس سے بھاگتے ہوئے ہم عجیب و غریب مسکراہٹ کے ساتھ آگے بڑھتے ہیں، تو اس مسکراہٹ کے معنی کم و بیش "اونہہ" کے ہوتے ہیں۔ اور یہ "اونہہ"

حالات میں کسی قسم کی تبدیلی کیے بغیر ہماری اپنی بلندی پر ایک کاری ضرب لگاتی ہے گویا حالات کی ستم ظریفی میں ہم نے خود کو اجنبی اور بے وقوف بنتا محسوس کیا ہو۔ حقیقتاً یہ مسکراہٹ، یا یہ احمقانہ احساس ذلت ایک اعتراف ہے۔ اس کمزوری کا، کہ ہم حالات کی آنکھوں میں آنکھیں نہیں ڈال سکتے۔ ہم میں اتنی قوت نہیں ہے، کہ ہم ایک لمحہ بھی ایسی حالت میں رہنا برداشت کر سکیں۔ جہاں ہم خود کو اجنبی محسوس کر رہے ہوں، اس کمزوری کا نام گھبراہٹ ہے۔

چنانچہ جو لوگ دکھ درد سے فرار حاصل کرنا چاہتے ہیں، وہ درحقیقت اسی گھبراہٹ میں پناہ پانے کے خواہشمند ہیں۔ یہ نہ صرف یہ ایک بزدلانہ اقدام ہے۔ بلکہ ایک سعی لاحاصل بھی ہے۔ اور یہ سن کر حیرت بھی ہوتی ہے کہ اس سعیٔ لاحاصل میں معاون ہونے والوں کی فہرست میں شراب کا نام بھی لیا جاتا ہے، جو غالباً سب سے زیادہ بے گناہ ملزم ہے۔ دکھ درد کی جذباتی نوعیت محض اس قدر ہے کہ وہ ہماری توقعات کے خلاف جاتے ہوئے ایسے واقعات ہوتے ہیں۔ جو ہمارے ماضی حال اور مستقبل کو ایک ساتھ گزند پہنچانے کے دعویدار ہوں۔ ان مفروضات کی قیمت شاید ہماری پوری زندگی ہے۔ زندگی کی بنیادیں غالباً ہوا اور پانی میں بھی اس قدر استوار اور گہری نہیں ہیں، جتنی ہماری مفروضات میں۔ کسی نہ کسی مغالطے کے سہارے کے بغیر زندگی بسر کرنا، نہ صرف عملاً ناممکن ہے، بلکہ ناقابل فہم بھی ہے۔ تلاشِ حق، مذہب، تصوف، فلسفہ، فنونِ لطیفہ اور اخلاقی قدریں، سب کے سب کم و بیش زندگی کے مفروضات کو پختہ اور قابل قبول بنانے میں پیش پیش رہے ہیں، اور اسی لیے وجود میں آئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان مفروضات پر کیسی ضرب کے معنی ہوں گے ہمارے ماضی حال اور مستقبل۔ غرض پوری زندگی پر بھرپور ضرب پڑے گی۔ اور اس کا پہلا ممکن ردِ عمل جھنجھلاہٹ اور گھبراہٹ کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے اور اس جھنجھلاہٹ، گھبراہٹ میں جس قدر تلخی اور بے بسی ہوگی، وہ نہایت واضح ہے۔ ایسے خلاف توقع، بلکہ کبھی کبھی خلاف فطرت دھوکوں کے مقابلے پورے نفسیاتی ڈھانچے اور اعصابی ترتیب کا درہم برہم ہو جانا لازمی ہے اور اس گڑبڑ میں ہوش و حواس اور اس کے ساتھ قوتِ عمل صحت مندانہ نظریۂ زندگی اور ذہنی اور اعصابی توازن درست رکھنا غیر معمولی بات ہے۔ لہٰذا ضرورت اس چیز کی نہیں ہوتی کہ ہم اس گھبراہٹ میں الجھ کر ہمیشہ کے لیے وہیں رہ جائیں۔ بلکہ کسی ایسے عنصر کی ہوتی ہے جو ہمیں اس طرح سکون دے سکے کہ اس گھبراہٹ میں محصور ہونے کی بجائے

دوسرے جذبات خود اس گھبراہٹ اور وقتی جھنجھلاہٹ کو محسوس کر کے فکر و احساس کے نئے راستے کھول سکیں۔

نئے راستوں کا نام آتے ہی ایک نیا اور کٹھن طریقہ شروع ہوتا ہے انسان کا ذہنی نشوونما کسی ایک خاص طریقے پر ہوتا رہتا ہے۔ آہستہ آہستہ اس کے سوچنے سمجھنے کے طریقے بن جاتے ہیں، اور ہر مسئلہ ایک ہی طرح فکر اور ادراک پر چڑھتا چلا جاتا ہے۔ اس کے لیے بھی ہم روایات کے رہین منت ہیں جتنے مسائل ہمارے بنے بنائے ڈھرے پر چڑھتے چلے آتے ہیں۔ ان کے بارے میں ہمیں کسی قسم کی کوئی دشواری نہیں ہوتی۔ لیکن جب کوئی مسئلہ ہمارے پرانے ڈھرے پر چڑھنے سے انکار کرتا ہے تو اس کے کٹھن ہونے کا احساس ہونے لگتا ہے۔ اور اس دشواری پر دو ہی طرح قابو پایا جا سکتا ہے۔ یا تو کسی طرح اس قدر فرصت حاصل کی جائے۔ کہ مسئلہ خاطر خواہ طور سے ہمارے طریقۂ فکر پر حل ہو جائے اور یا خود ہمارے طریقۂ فکر میں اس قدر لوچ ہو کہ نئے مسئلہ کا ساتھ دے سکے۔ ورنہ ہمیں سرے سے اپنے طریقۂ فکر کو ہی غلط اور بے کار سمجھ کر از سر نو تبدیل کرنا پڑے گا۔

کسی مسئلہ کو خاطر خواہ طور سے سمجھنے کے لیے یا اپنے طریقۂ فکر میں لچک پیدا کرنے کے لیے ایک گہری نظر، اور اندر دھنس جانے والی تجزیاتی فکر کی ضرورت ہے۔ اور یہ دونوں چیزیں صرف اس وقت کام کر سکتی ہیں، جب کہ آپ کو اپنے دکھ درد کا احساس پوری شدت سے ہو۔ اور اپنی ذہنی الجھنوں کو واضح طور سے دیکھ سکتے ہوں، اور (۲) جب آپ خود اعتمادی اور توانائی کی لہر اپنے میں محسوس کر رہے ہوں، جو ایک ہی وقت میں مایوسی کی جگہ لے لیتی ہے۔ اور نئے راستے دکھلانے لگتی ہے۔ دکھ درد کا پورا اور واضح احساس صرف اعصابی اور ذہنی توانائی کی صورت میں ہو سکتا ہے۔ کسی صدمے کے فوراً بعد اعصاب اور ذہن ایک شدید حملے سے اثر انداز ہلکی ہلکی لہروں میں غم عشق، غم روزگار، غم امروز، غم فردا، غم حیات، غم نجات، سبھی کچھ ناچتا نظر آتا ہے۔ یہ سب دو خاموش انسانی لبوں اور ایک تھکے ہوئے انسانی دماغ پر مسکراتے ہیں۔ سوڈے کے ہلکے ہلکے بلبلے اٹھ اٹھ کر چلاتے ہیں: "ہم تمہیں پاگل بنا دیں گے۔ ایک چھوٹی موٹی انسان، دو چار ہڈیوں سے بنا ہوا انسان دنیا کی تسخیر کے خواب دیکھنے چلا ہے غموں کا یہ انبار، مایوسیوں کی یہ عظیم فوج، اور تاریکیوں کا امڈتا ہوا سیلاب، تم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ تم ان پر فتح نہیں پا سکتے۔ اس دنیا پر حادثات کی حکومت ہے۔ انسان غلام ہے

حادثات کا حلقہ بگوش کا، حالات کا بندہ ہے فطرت کے نظام کا۔ آؤ۔ قدرت کے اس قانون کے آگے سر ٹیک دو۔ یہی راہ نجات ہے۔" بلبلے بنتے اور پھوٹتے رہتے ہیں۔ لہریں اٹھتی اور خاموش ہوتی رہتی ہیں اور اسی ایک جام میں زندگی کسی تھکی ہوئی دوشیزہ کی طرح رقص کرتی رہتی ہے۔ اور اکیلا، تنہا اور بے یار و مددگار انسان خاموشی سے دیکھتا رہتا ہے۔ اس "بازیچۂ اطفال" کو تکتے تکتے اکتا جاتا ہے، تو ایک گھونٹ لے لیتا ہے۔ تلخی دور تک سرایت کرتی چلی جاتی ہے۔ یہ ہے زندگی کا زہر، مایوسی کا زہر، تھکن کا زہر۔

اور یہ پہلا گھونٹ گویا جواب ہے فطرت کے چیلنج کا۔ ناامیدیوں اور مایوسیوں کی لہر ایک اٹھ کر افق کو ہمیشہ کے لیے تاریک کر جاتی ہے کوئی امید نہیں۔ زندگی اور امید کی ذرا سی رمق بھی باقی نہیں۔ لڑائی ہاری جا چکی۔ غم و اندوہ مسلط ہو چکے۔ مایوسی اور ناکامی تقدیر بنے۔ اور اندھیرے کے اس انبار سے سر نکال کر شراب سے تر دو لب مسکراتے ہیں۔ ابھی ہم زندہ ہیں۔ ہم زندہ رہیں گے۔ اور شراب کا پہلی بار ان تک پہنچنا گویا ایک پیمان ہے دنیا اور اس کے انتہائی مصائب کے ساتھ مقابلہ کرنے کا۔

اور پہلا گھونٹ گویا اعتراف ہے دنیا کی درشتی، کرختگی، اور بیہودگی کا، اور شراب کی تلخی اس کا پہلا SYMBOL ہے۔ یقین مانئے، شراب کے پہلے گھونٹ کا حقیقی جذبہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا، جسے شیکسپیئر کے ایک کردار نے یوں بیان کیا تھا کہ،

"میں ہر منظر سے غم اس طرح چوس لیتا ہوں جیسے...." اور شراب کے پہلے قطرے کو چوستے ہوئے SIP انسان محسوس کرتا ہے کہ شیو کی طرح سمندر، پہاڑوں سے کائنات کا زہر پئے جا رہا ہے، سارا زہر، ماضی کی یادیں، حال کی الجھنیں، اور مستقبل کے اندیشے، اور شراب کی تلخی اور وہ مسکراتی ہوئی آنکھوں سے پکارتا ہے: "کیا اب دونوں عالم میں کوئی تلخی باقی نہیں، کیا کائنات کے پاس کوئی اور زہر باقی نہیں رہا۔ کیا فطرت کے سارے حربے شکست پا گئے۔" اور خاموشی سے سارا جام اپنے حلق میں انڈیل لیتا ہے۔

سکون کا یہ پہلو ہے جسے شراب فراہم کرتی ہے۔ یہ فرار نہیں مقابلہ ہے۔ موت نہیں زندگی ہے۔ مسائل کا تحلیل کرنے کی نہیں۔ ان کے حل کرنے کی طرف دعوت ہے۔ لہٰذا شراب

افسردگی اور بے دلی کے مقابلے میں زندگی کا زبردست حربہ ہے افسردگی اور بے دلی فطرت کی بے رحمیوں اور اپنی ناکامیوں سے گھبرا کر بے پناہ اُمنگ اور بے کنار حوصلے کا دامن چھوڑ دیتی ہے۔ اور دوسروں کی طرف نہیں دیکھتی، قدرت کے فیصلے سنتی ہے، اور فطرت کے چیلنج قبول کرنے کی بجائے اس کے آگے سر ٹیک دیتی ہے۔ شراب اس کے مقابلے میں زندگی کا پرچم اڑاتی حوصلے کی گرمی اور امنگ کی تیزی سے داخل ہوتی ہے۔ اور ماحول کی ساری تلخی، گرد و پیش کی تمام ناکامی کو اکٹھا کر کے پوری خلاقانہ قوت کے ساتھ اس پر قہقہے لگاتی ہے۔ بھرپور صحت مند اور فاتحانہ قہقہہ!

شراب کا بڑھتا ہوا نشہ اس تاریکی کو اور گہرا کرتا چلا جاتا ہے۔ اور اس گہری تاریکی کے ساتھ ساتھ زندگی کی وہ عظیم المرتبت کرن، حوصلے کا وہ لپکتا ہوا کوندہ بے قراری سے سینے میں مچلتا رہتا ہے۔ کبھی مسکراہٹ کی شکل میں، کبھی کھلی ڈھلی باتوں کی شکل میں اور کبھی دل کی پہنائیوں سے نکلے ہوئے آنسوؤں کی شکل میں ظاہر بھی ہو جاتا ہے۔ اور اسی سے اس بے پروا، اور آہنی خود اعتمادی کی لہریں پھوٹتی ہیں جن کے ماتحت دُنیا کو بازیچۂ اطفال، اور زیر و بم، ہستی و عدم کو ہرزہ قرار دیکر انسان اپنی خلاقانہ قوت کے آگے سر ٹیک دیتا ہے۔ اور اپنی قوت سے آشنا ہو کر چیخ اُٹھتا ہے۔

کہو تو آسماں کو پست کر دوں
خودی کیا خود خدا کو مست کر دوں

اور اس قوت کا سب سے پہلا بے باک نعرہ ہوتا ہے: "اس کلبہ احزاں کا ایک دروازہ ہے اور یہ دروازہ، میں دیوار میں سر ٹکرا ٹکرا کر پیدا کروں گا لیکن پیدا کروں گا ضرور۔"

اپنی قوت سے آشنا ہو جانے کی اس منزل کو عرف عام میں "نشہ" کہا جاتا ہے۔ آصف الدولہ کے جلوس کو روک کر ایک مہتر کا آگے بڑھ کر ہاتھی کی قیمت لگانا کوئی معمولی بات نہیں، اور یقیناً اس وقت اس کے اندر انسانی زندگی کا سب سے زیادہ مقدس جوہر بول رہا ہو گا۔ جسے قوت تخلیق کہتے ہیں۔ اور جو چیز انسان کے زاویہ نظر کو مجبوریوں، مایوسیوں اور ناکامیوں سے گھیر کر بھی اس میں زندگی کی تڑپ اور حوصلے کی قوت کو بے نقاب کر دے جو ہماری زندگی کا جوہر ہے۔ اسے تخریبی اجزاء کے ساتھ رکھنا تعمیر کی سب سے بڑی ہتک ہے۔

شراب کے اثر سے چیختا چلاتا گرجتا گونجتا آدمی بھی حوصلے کی بات کرے گا۔ اپنی قوت سے

انداز سے، اپنی جرأت کے مظاہرے، اور اپنی فتح کے نعرے لگائے گا۔ اور عناصر کی مخالفتوں سے ٹکراتا، حالات کے سارے حدود کو پار کرتا، واقعات کے سارے پردوں کو مسکاتا، زندگی کی دہکتی ہوئی "آتش نمرود" میں اسے گلزار ابراہیمی بنا دینے کے ولولے سے کود پڑے گا۔ اور قدرت کی تمام چیرہ دستیاں، اور مشیت کی ساری قوتیں اسے جلانے میں کامیاب بھی ہو گئیں، تو انسانیت مدتوں تک اس جگہ کا طواف کرتی رہے گی۔ "آؤ اور دیکھو۔ یہاں ایک خدا دوسرے خدا سے ٹکرا کر ہمیشہ کے لیے چکنا چور ہو گیا تھا۔ یہاں انسانیت اور مشیت کی پہلی جنگ ہوئی تھی اور یہ پہلی جنگ آخری جنگ نہیں ہے۔"

بڑھتے ہوئے نشے کے ساتھ ساتھ، جہاں ماضی کے سارے زخموں کے ٹانکے کُھل پڑتے ہیں، اور ہر زخم میں بری طرح درد و کسک ہونے لگتی ہے۔ وہاں ان سب سے بڑھ کر اپنی قوت، صحت مندی اور توانائی کا بے پناہ احساس ہمالیہ شکن قوت کے ساتھ کروٹیں لینے لگتا ہے۔ اور اگر شراب کا یونانی خدا BAECHUS کو قوت اور توانائی کا خدا بھی قرار دیا جائے۔ تو یقیناً ایک واجب الادا تعلیم ACOMPLIMENT LONGDUE ہو گا۔ اور جب صبح کو خمار سے بوجھل پلکیں نسیم سحری کی ہلکی اور نرم لمس سے جدا ہوتی ہیں۔ تو دکھ درد، اور اپنی خود اعتمادی کا یہ سارا جہاں جل کر راکھ ہو جاتا ہے۔ انسانی ذہن خود حادثات اور حالات، نہیں بلکہ کائنات کے اس خاکستر میں پڑا ہوا کہیں کلبلا رہا ہوتا ہے۔ اور کلبلاہٹ جنبش سے حرکت کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ انسان بچے جیسی معصوم مسرت سے چیخ اٹھتا ہے۔ جیسے ہوا کے ایک ہلکے سے جھونکے سے تنکوں کا بنا ہوا یہ گھر گر پڑا تھا۔ اب ۔ پھر سے ان ہی تنکوں سے ایک نیا مکان بنائے گا۔ ایک تازہ جہاں کی نیو رکھے گا۔ اور اس جہانِ تازہ کی نیو "فکر نو" پر رکھی جائے گی۔ سینکڑوں طوفان آئے۔ آندھیاں اٹھیں، بگولے اُڑے۔ لیکن بادۂ دوشینہ کے مضبوط محاصرہ میں یہ فکر نو، یہ خود اعتمادی کی جھلملاتی شمع کوندے کی طرح لپکتی اور بجلی کی طرح چمکتی رہی۔ اور صبح کو یہی فکر خاکستر آلود خاموشی میں اُٹھتی ہے۔ اور انسان کے غیر فانی جذبۂ تخلیق کی قسم کھا کر کہتی ہے۔ کہ ایک نئی دنیا بنے گی اور ضرور بنے گی، مسرت خوش دلی اور سکون کی دُنیا!

نئی زندگی

محمد حسن

نہ جانے کے ہزار اور کتنے لاکھ برس سے اس سرزمین پر رہتے آئے ہیں، اسی طرح سانس لیتے، گاتے روتے رہے ہیں لیکن واہ رے حضرت انسان کہ ابھی تک زندگی بسر کرنے کا فن نہ سیکھا۔ کبھی کچھ عرصہ کے لیے ذرا اطمینان سے بیٹھے بھی اور کچھ حاصل کیا بھی تو اسے بہت جلد ہی بھلا بھی دیا۔ ہر صبح نئی صبح اور ہر شام نئی شام۔ جیسے نہ اس سے پہلے دنیا ہی بنی ہوئی تھی اور نہ ہم اور آپ کو اس میں زندہ رہنے کا ہی کوئی تجربہ لاحق ہوا تھا۔ اتنی بڑی کائنات میں کروڑوں آدمی محض سانس لینے کی علت میں گرفتار اور ایک ہی نہج پر برس ہا برس سے سانس لیے جا رہا ہے۔ اس میں برناڈشا ہوں یا مہاتما گاندھی یا حضرت بدھ ہو لیکن یہ مرض سب کو اس طرح لاحق ہے کہ خدا کی پناہ۔ سب سے حیرت ناک بات تو یہ ہے کہ ان میں سے کوئی نہ اس کی اہمیت کو پرکھتا ہے اور نہ اس کے بیکار ہونے پر جاتا ہے بے سوچے بے کچھ کہے سنے ہانپ رہے ہیں۔ بھلا تصوّر تو کیجیے اس وسیع و عریض جم غفیر کا جو بس یوں ہی دھونکنی دھونکتا چلا جا رہا ہے۔ موت آئے گی تو کچھ عرصے تو ڈاکٹروں اور دعاؤں کے ذریعے اس کا علاج کرے گا۔ اس کے بعد مر بھی اسی طرح

جائے گا جس طرح زندہ رہا ہے۔ اُن میں سے کوئی بھی اپنے ساتھی انسانوں کی طرح زندگی کی عبادت پر سوچنے پر یقین نہیں رکھتے آخر سانس لینے کی ضرورت اور اہمیت ہے کیا اور ایک خاص لمحے کیوں زندہ ہیں یا زندہ رہیں۔ یہ سوال ان کے ذہن میں کبھی اُٹھتا ہی نہیں۔ ہم سب عادت کے سہارے زندہ رہنے کا فلسفہ اس طرح سیکھ گئے ہیں کہ ہماری بہت سی مشکلیں حل ہو گئی ہیں۔ مثلاً اگر آپ بستر سے اُٹھنے سے پہلے غالب کا ایک مصرعہ گنگنانے یا ایک گلاس ٹھنڈا پانی پینے کی عادت ڈال لیں تو بستر مرگ پر بھی آپ غالب کا مصرعہ گنگنانے اور ٹھنڈا پانی مانگتے پائے جائیں گے اس لیے نہیں کہ آپ کو اس میں کسی خاص سرور یا کیف کا احساس ہوتا ہے بلکہ اس لیے کہ آپ کو یہ کرنا سانس لیتے رہنا اور بالکل اس طرح جیسے ایک نہایت سعادت مند اور خوش اطوار بچہ اسکول کی چھٹی کی گھنٹی کا انتظار کرتا ہے اسی طرح موت کا راستہ تکتے رہنا جب وہ آئے اور عزرائیل اپنی بھاری بھرکم آواز میں دعوت دیں آپ اس کو بھی ٹھنڈے پانی کے گلاس کی طرح قبول کر لیں گے اور تشریف لے جائیں گے۔

ہائے یہ زندگی بھی کیا زندگی ہے اور یہ موت بھی کیا موت ہے جس میں نہ آپ کو پسند کا حق ہے اور نہ اختیار۔ اس بے بسی کی حالت سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے حضرت انسان نے اپنے کو مختلف قسم کے تعصبات میں گرفتار کیا ہے کہ انسانیت پر شیت کا یہ بے رحم اور ذلت آمیز عمل پورا ہو سکے۔ مثلاً یہ مفروضہ کہ یہاں بہت کام کرنا ہیں اور انسانیت کے دوش پر فرائض کا ایک کوہ گراں رکھا ہوا ہے دنیا کو سمجھنے اور اس کے بدلنے کی تدبیریں کرنا ہیں زندگی کو بہتر بنانا ہے اسے کم سے کم وقت میں پوری لذت اور خوش آئند تصورات میں گذارنا ہے وغیرہ وغیرہ لیکن آپ سے پوچھیے کہ دنیا کا درد آپ ہی کے جگر میں کیوں جمع ہو گیا ہے اس وسیع و عریض کائنات میں اور مخلوق خدا بستی ہے دوسرے حیوانات بھی بستے ہیں دُنیا اور زندگی کا کچھ حصہ ان کے لیے چھوڑ دیجیے ان بے چاروں کو بھی کچھ کر لینے دیجیے آخر سوتیلے ہی سہی لیکن وہ لوگ بھی آپ کے بھائی ہیں اب آپ ہی کیوں نہ شب بخیر کہیں اور باہر تشریف لے آئیں میرے خیال میں آپ اسی خیال پر جمے رہیے کہ وہ آپ سے کم تر ہیں۔ آپ سے حقیر ہیں بہت ذلیل اور کمینے ہیں لیکن محترم یہ زندہ رہنے کی لعنت اور ذلت ان ہی کمینے اور ذلیل ہستیوں کے شایان شان ہے بھی آپ

کہاں اس جنجال میں آ پھنسے دونوں ہاتھوں سے دستار سنبھالیے اور سیدھے سیدھے نکل چلیے بھلا
یہ بھی کسی شریف کے بس کی بات ہے کہ لا متناہی عرصے تک کے لیے زندہ رہے اور مشیت کے
مذاق کو برداشت کرتے ہوئے اپنی موت کا انتظار کرتا رہے۔ آپ جب عید قرباں کے موقع پر
جانور ذبح کرتے ہیں تو کچھ دن پہلے انھیں لا کر انھیں باندھتے انھیں چارہ دیتے اور دانہ پانی
ڈالتے ہیں ان کو فربہ اور خوش کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن خود آپ کے ساتھ تو یہ مراعات بھی
ارزانی نہیں ہوئی لیکن آپ ہیں کہ اڑے ہوئے ہیں۔ صاحب! اس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کیے،
یہ بھی غیرت والے ہیں۔

ایک عرصے تک میں اس بات کو دوسرے نقطۂ نظر سے دیکھتا رہا حضرت انسان اور مشیت
کی زور آزمائی کی طرف نظر کیجیے تو پہلے پہل آپ بھی اس طرح سوچنے لگیں گے۔ جب انسان
نے اس کائنات کو گھوم پھر کر دیکھا تو سوائے ننگی تلی زمین اور پانی کے اور کچھ نظر نہ آیا حضرت آدم
کی طرح انھوں نے بھی غنیمت سمجھا ہوگا کہ چلو دو گز زمین کے بدلے بیاباں گراں نہیں۔ جنت کی
زمین کتنی ہی شاداب اور سکون بخش کیوں نہ سہی پھر بھی بہت مختصر سی۔ اب یہاں اگر ذرا آنکھیں کھلیں
لق و دق صحرا، جنگل، پہاڑ، دریا، میدان، سمندر، چلو کچھ ہوا تو سہی تنگنائے سے نکل کر سانس لینے
کی جگہ تو ملی اس کے بعد قدرت سے چوٹیں شروع ہوئیں اس نے زمین دی تھی انھوں نے اس
میں پھل پھول اگائے، اس نے ننگا پیدا کیا تھا انھوں نے کپڑے بنائے اور تن ڈھانکا اس نے
وحشی بنایا تھا۔ انھوں نے خوش پوشاکی خوش گفتار، خوش رفتار کے بل پر تمدن اور معاشرت کے
سبق پڑھے اور زیادہ سے زیادہ ٹکریں لے کر اس کرّے کو کیا سے کیا بنا دینے کے فراق میں وہی
حرکت کرتے رہے یعنی سانس لیتے رہے مشیت بھی اپنی حرکتوں سے باز نہ آئی۔ روڑے اٹکاتی
ہی رہی۔ ہر جگہ خطرات اور ہر منزل پر دشواریاں پیش آئیں اور انسان کی ذہانت اور فراست
کو کئی بار لوٹ کر پیچھے کی طرف جانا پڑا۔ لیکن یہ اس منزل سے بھی آگے رواں رہے اور کسل و
رنج و راہ اور راہوں کے پیچ و خم سے کچھ زیادہ اثر پذیر نہیں ہوئے۔ اگر اس قسم کے ہمت شکن اور
حوصلہ پست کرنے والے حالات میں یہ ناتجربہ کار جانور ارتقائی منزلوں پر پنجے گاڑے ڈٹا رہا اور
آگے بڑھتا رہا تو کیا یہ اہم اور قابل مبارکباد نہیں ذرا اس کی ہمت اور حوصلہ دیکھیے کہ فولاد

پتھروں سے ٹکرا کر بھی جی چھوڑ دینے سے انکار کرتا ہے ممکن ہے پہلے نسلوں میں سے کسی نسل نے
اپنے حوصلے اور ہمت کے بل پر زندگی کی ہو اور خوش آیند منصوبوں کے بل پر زندہ رہنا
قبول کیا ہو لیکن بنیادی طور سے انسانیت ایک قسم کی بے دلی اور ہاتھ پیر چھوڑ دینے کی طاقت
کے سہارے زندہ رہی ہے میں تو یہاں تک سمجھوتہ کرنے کے لیے تیار ہوں کہ کم از کم ہماری
نسل ان ہی دو برکتوں کے سہارے زندہ ہے ان کے سامنے حوصلہ۔ ہمت۔ یا بے حوصلگی
اور پست ہمتی کا کوئی سوال سرے سے اٹھتا ہی نہیں۔ اپنے ہاتھ سے سگریٹ اٹھانا اور
دیا سلائی جلانا ان کے نزدیک محنت اور توجہ کے کام ضرور ہیں لیکن جہاں تک زندہ رہنے کا سوال
ہے اس میں رنگ چوکھا آئے یا نہ آئے ہلدی پھٹکری تو لگتی نہیں۔ پھر ہرج ہی کیا ہے بے بسی
اور بے دلی کا یہ خول دن رات ہماری نسل کے گرد گہرا اور موٹا ہوتا جا رہا ہے حالانکہ کسی نہ کسی
موٹائی اور گہرائی میں یہ ہر نسل کے گرد رہا ضرور ہے یا اسے آپ یوں کہہ لیجیے کہ ہماری نسل شعور اور
علم کی اعلیٰ ترین منزلوں پر ہونے کی وجہ سے اس کا احساس اور پہلی نسلوں سے زیادہ
شدید طریقے پر کر پائی ہے دوسروں کے لیے ممکن تھا کہ وہ اپنی دنیا کو مہر و ماہ کی طواف گہ
سمجھتے رہتے اور خود اشرف المخلوقات ہونے کے ناطے دنیا پر حکمراں جانتے اب جب کہ علم کے
سوتے نے یہ بتا دیا کہ ہماری دنیا بھی دوسرے سیاروں کی طرح سورج کے گرد گھومتی ہے اور
ہم اس دنیا پر حکمراں ان کے بجائے اس کے دوسرے رہنے والوں ہی کی طرح درندے اور جانور
ہیں اور نیز یہ کہ ہم اپنے اختیار میں ہیں نہیں ماحول اور اس سے بنا ہوا تحت الشعور بس لیجیے
سارا کھیل ختم مٹی کا گھروندا پھر مٹی میں ہم اپنے اباؤ الشعور کے تصورات پر بھی کیسے زندہ
رہیں لیکن عادت اور حرکت ہے کہ برابر جاری ہے کہ سانس لیے جاتے ہیں۔

میں کہتا ہوں انسان کو اپنی طاقت جتانے کی ضرورت ہے اس کھیل میں محض شاہ
شطرنج ہو کر رہ جانے سے کام نہیں چلے گا یہ شکوہ و شکایت اور بس اشک شوئی سے زیادہ
اہمیت نہیں رکھتی اور اشک شوئی بزدلوں اور بے ہنروں کا کام ہے با مذاق آدمی ایسا نہیں کرتے
ہیں جہاں چاہے رکھ دیجیے جہاں دل چاہے بٹھا دیجیے اور ہم ہیں کہ سانس لیے جا رہے
ہیں اور مزید برآں آیندہ نسل کو دنیا میں لا کر اس کے اعصاب اور ذہن پر بھی جیتے رہنے کا

ضبط سوار کرنا چاہتے ہیں اس سلسلہ میں کیا کیا توہمات برتے جاتے ہیں کچھ نہ پوچھیے محبت،
خلوص عشق گناہ اور ثواب کی نفی ہیں وہ شکار کھیلے جاتے ہیں اور جنس کا تذکرہ کیے
بغیر سرمدیت اور ابدیت کے راگ گاتے ہوئے ہم کائنات میں بالکل بے سوچے سمجھے اندھا
دھند طریقے سے اپنے پیش روؤں کی طرح انسانیت کا نیا ایڈیشن پیش کر دیتے ہیں زیادہ
سے زیادہ اس امید میں کہ یہ بھی ہماری طرح زندہ رہیں گے ہماری طرح اس وقت تک
سانس لیتے رہیں گے ..... جب تک انھیں موت نہ آجائے کائنات کو اسی طرح رہتے بستے
چلتے رہنے دینا بھی کوئی زندگی ہے آخر اس ذلت کو نوع انسانی کب تک برداشت کرتی رہے
گی اور یہ کھیل اسی بیہودگی اور بے دلی سے کھیلا جاتا رہے گا!

مجبوریوں کا ڈھونگ اب ختم ہونا چاہیے اب ہمیں اس دھوکے بازی اور شعبدے بازی کے
چکر سے باہر نکل کر کھلی فضا میں سانس لینا چاہیے اگر رنگ زمانہ بھی ہے اور زندگی ان ہی
چیزوں کا نام ہے۔ اور اس میں جو رنگ لاتا ہی وہ محض اپنی ذات میں شک کر رہا ہے اور جو
اس کے بدلنے کے خواب دیکھتا اور ہمیں ان پچھلے توہمات کی خوش آیندگی میں گرفتار کرنا چاہتا ہے
وہ انسانیت کو جان بوجھ کر دھوکا دینے کا مجرم ہے۔ تو ہمیں اپنی طاقت جتانا ہی پڑے گی موت
کا یہ انتظار مشیت کے آگے یہ سر تسلیم کا خم ہونا اب ہے ختم آیندہ سے یہ کھیل اس طرح نہیں ہوگا
یہ مشیت کے طے کرنے کی بات نہیں ہے کہ ہم کب تک زندہ رہیں اور کب مر جائیں اب ہم
لا متناہی مدت تک مشیت کے اشارے کا انتظار کرنے کے لیے تیار نہیں ہم زندہ رہنے کے لیے
مختار ہیں کیا ہوا اگر ہم اس انداز سے زندہ نہ رہ سکے اگر رہنا چاہتے تھے۔ ہم مرنے کے لیے بھی مختار
ہیں اور قدرت کے اشارے کا انتظار کرنے کے بجائے اب قدرت کو ہمارے اشارے کا انتظار کرنا ہے
ایک خاص لمحہ آنے دیجیے اور ہم کائنات کا یہ ڈرامہ ختم کیے دیتے ہیں ڈراپ سین انسانی نسل کا خاتمہ ہے
آیندہ کوئی بچہ اس وسیع و عریض اور وحشی دھرتی کی گود میں نئی آفتوں کا انتظار نہیں کرے گا کوئی ماں
مشیت کے لئے شکاروں کو جنم نہیں دے گی۔ محبت عشق انسانیت سارے فریبوں سے نکل کر
انسانیت جشن آزادی کے انداز میں مرگ انبوہ کا فرض ادا کر سکتی ہے یہ ہے ہمارا اختیار یہ ہے
ہماری طاقت۔

یہ بات ہماری انفرادی زندگیوں کے لیے اسی طرح باون رتی اور پاؤ رتی کی ہے اور باتوں
کی طرح یہ بھی بہت بڑی حد تک اپنے اپنے عقل و شعور پر منحصر ہے جب تک زندگی کے
کارخانے کو اپنے ہاتھ سے اپنی پوری تازگی اور شادابی کے ساتھ چلایا جائے چلایئے جب
تک آپ اس کھیل میں ذرا بھی کوئی دلچسپی اور دل بستگی محسوس کرتے ہوں کام چلاتے رہیے مقابلہ
کیے جایئے حالات و حادثات کے مقابلے میں سینہ سپر ہو جایئے۔ سینہ تو بہر حال اس میں آپ ہی
کا ہوگا لیکن سپر آپ کسی کو بھی بنا سکتے ہیں جی چاہے تو بادہ کہن اور بت نوخیز کو انتخاب کیجیے
یا آرزومندی کے جہاد کو بہر حال جب تک زندگی کر سکیں اور جب تک اپنے کو منزل محسوس کر سکیں
کیجیے اور پھر ان گھروندوں کو مٹا کر کائنات کے اس ڈرامے کا بھی ڈراپ سین کر ڈالیے۔

خودکشی کے بارے میں لوگ نہ جانے کن کن تعصبات کا شکار رہتے ہیں عجیب و غریب قسم
کے تعصبات۔ اس کی وجہ ہے کہ انسان اپنے تعصبات کے سہارے اپنے کو اس سے علیحدہ کر سکتا
ہے اور اس حل کو حل کے بجائے مرض تصور کرنے پر مجبور کیا جا سکتا تھا۔ آج بھی ہاں، ہما ہمی اور ہاں
شور اشوری ان میں اپنے مقابلے میں کھڑا ہونا اور خود اپنے سامنے جواب دہ ہونے کی سکت کہاں؟
آیئنے کے سامنے کھڑے ہو کر کون ہے جو زندگی کے اس کھیل کو برداشت کر سکے توہمات کے پرت
بشمول فنون لطیفہ آرٹ فلسفہ۔ سیاست اور تہذیب کے فریبوں کو ایک طرف کر کے کس میں دم
ہے جو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر زندہ رہنے کا دعویٰ کر سکے اور اپنی ہمت جتانا اپنی طاقت
منوانا تو ظاہر ہے کہ اس سے بھی زیادہ مشکل کام ہے اور یقیناً اس میں انسان اور فرشتہ دونوں
بننے سے زیادہ محنت پڑتی ہے مشیت سے بغاوت یا یوں کہیے کہ مشیت کے منھ پر دنیا الٹ
کر مار دینا کوئی آسان کام ہے بھی نہیں اگر انسانیت کو اپنی قدرت اور شائستگی کے ساتھ زندہ
رہنا ہے تو وہ دن آئے گا وہ ضرور آئے گا جب حضرت انسان ایک اسٹیج کے ایکٹر کی طرح نہایت
ادب سے جھک کر شب بخیر عرض کریں گے اور اسٹیج خالی کر دیں گے اور صاحب سلام میرا کہہ کر ایک
طرف ہو جائیں گے۔

محبّت کی زبان۔ مسکراہٹ

اندرجیت لال

بچپن میں اُردو کا قاعدہ پڑھا کرتے تھے جس کا ابتدائی درس کچھ اس طرح تھا کہ "ماں بچے کو گود میں لیے بیٹھی ہے۔ باپ پاس بیٹھا حقہ پی رہا ہے جب بچہ بار بار مسکراتا ہے تو باپ کا دل باغ باغ ہو جاتا ہے" وغیرہ وغیرہ۔ گویا بچے کی مسکراہٹ پر ماں باپ دونوں جان تک چھڑکنے کو تیار ہو جاتے ہیں —— یا یوں کہیے کہ انہیں بچے کی مسکان میں دونوں جہاں کی خوشیاں نصیب ہو جاتی ہیں۔ ذاتی طور پر میں سمجھتا ہوں کہ کوئی بچے کی مسکراہٹ پر فدا بھی ہو جائے تو آپ اسے نیک فال کہیے۔

مسکراہٹ بچے کی ہو یا بڑے کی۔ یہ زندگی کی ایک بہت بڑی سعادت ہے جو ہر فرد و بشر کے حصے میں نہیں آتی۔ ہر مسکراہٹ سمندر کی لہروں کی طرح آگے پھیلنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ ماہر نفسیات کا قول ہے کہ خنداں انسان دوسروں کو بھی خنداں رہنے کی دعوت دیتا ہے۔ اور خندگی کا دوسرا نام ہے مسکراہٹ۔ جس کی ہر جہت —— ہر حالت میں اپنی ملائمت اور نرمی کے سبب دلکش اور دل نواز ہوتی ہے اور میں نے اس کو اپنی زندگی میں کئی بار آزما کے دیکھا پرکھا ہے۔

مصوّر اور سنگ تراش اپنے شاہکاروں میں بنائی یا تراشی ہوئی تصویر کو لازماً مسکراتا پیش کرتے ہیں اور بغیر مُسکان کے مجسمے یا شبیہ کی قدر قیمت ہی کیا ہے؟ یہی وجہ ہے کہ مہاتما بدھ اور مونالیزا کے مجسموں میں چھپی مسکراہٹ آج ایک تاریخی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ ان دونوں کے زیر لب مسکراہٹ میں جو دلکشی اور حُسن پنہاں ہے۔ اس کی گہرائی تک آج تک کوئی قدرداں نہیں پہنچ سکا۔ مسکراہٹ دراصل مصوری اور سنگتراشی میں ایک فنی کاریگری کا کام کرتی ہے۔ جب کسی تصویر یا مجسمے کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلا دی جائے تو اس میں جان پڑ جاتی ہے۔ بھگوان بدھ کا مجسمہ ہو یا سرسوتی کی تصویر ذرا غور سے دیکھیں تو آپ کو ایک نیا حُسن اور وقار ان کی مسکراہٹ میں ملے گا۔ جو بڑے بڑے کمال فن پر بھی بھاری ہونے کا حکم رکھتا ہے۔ ویسے مسکراہٹ مونالیزا کی ہو یا مدھوبالا کی سرسوتی کی ہو یا لکشمی کی۔ نتھو کی ہو یا رضا کی۔ اس کا ایک ہی رنگ ہے۔ ایک ہی انداز ایک ہی حُسن۔ اور وہ یہ کہ یہ ہر ایک کا دل موہ لیتی ہے افسردہ کو شگفتہ بنا دیتی ہے۔ اس لیے ہر قیمت پر اس مسکراہٹ کو بنائے رکھنے کا ہی نام زندگی ہے۔ بلکہ یوں سمجھئے۔ کہ اگر دنیا میں زندگی بسر کرنی ہے۔ اُسے ہر طرح سے خوشگوار بنانے کی مساعی کرنی ہے۔ تو ہر طرح کے طور طریقوں سے مسکراہٹ پیدا کرنا ہوگی۔

مسکراہٹ کے لیے جب دو لب وا ہوتے ہیں تو ایک لکیر سی اُبھر آتی ہے۔ یہ لکیر یوں ہی پیدا نہیں ہو جاتی۔ یہ آپ کی ذات کے اندر کی خوشبو اور خوشگوار نظریہ حیات سے پیدا ہوتی ہے۔ اس لکیر کو ہم صرف مسکراہٹ کہہ سکتے ہیں کبھی بار یہ لکیر پھیلتے پھیلتے بڑھ جاتی ہے۔ اور ایک قہقہے کی صورت میں بدل جاتی ہے۔ اس صورت میں کچھ آواز بھی پیدا ہوتی ہے جس میں آہنگ تو نہ سہی ایک اونچی آواز ضرور ہوتی ہے۔ یہ آواز باچھوں کے بوجھ سے دفن ہو جاتی ہے یہ جب ہوتا ہے جب مسکرانے والے کی باچھیں تو پوری طرح کھل جاتی ہیں لیکن قہقہے سے آواز پیدا نہیں ہوتی۔ اسے بے آواز قہقہہ کہہ سکتے ہیں اور جب آپ گلا کھول کر بلند آواز میں ہا ہا کرنے لگیں۔ یہاں تک کہ آپ کی بتیسی بھی نظر آنے لگے۔ تو اسے مسکراہٹ دنداں نما کہہ سکتے ہیں۔ ایک ہلکی لکیر سے دنداں نما تک مسکراہٹ کے کئی روپ ہیں۔ کچھ خوش باش لوگوں کا خیال ہے کہ مسکراہٹ تکلف اور قہقہہ بے تکلفی کی علامت ہے۔ اور یہ قول

ایک حد تک صحیح بھی ہے۔

مسکراہٹ بڑا اثر رکھتی ہے۔ اس میں کچھ خرچ نہیں ہوتا اور مخاطب آپ کی مسکراہٹ یا آپ مخاطب کی مسکراہٹ سے گرویدہ ہو جاتے ہیں۔ اگر آپ کسی اجنبی انسان کے پاس جو آپ کا کچھ فائدہ کر سکتا ہو۔ بڑی توقعات لے کر چلے جائیں۔ تو آنحضرت آپ کی بات یا دلیل یا عرضداشت پر مسکرا دیں۔ تو سمجھ لیجیے کام بن گیا۔ مسکراہٹ کا وار شاذ ہی خالی جاتا ہے۔ بلکہ یہ عموماً حلال کر کے ہی دم لیتی ہے۔

ستم یہ ہے کہ مسکراہٹ ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ صبر و قناعت، ضبط اور توکل بر خدا والا انسان ہی مسکراہٹ پیدا کر سکتا ہے۔ ورنہ ہر انسان اگر دنیاوی جھمیلوں میں کھو جائے۔ تو اسے اپنی ہی سُدھ بُدھ نہیں رہتی۔ ایسا بھلا مانس کیا مسکراہٹ پیدا کرے گا۔ کچھ یہ بھی صحیح ہے کہ انسان جتنا زیادہ ذہین، ذی حس اور لکھا پڑھا ہو گا۔ کچھ متین اور خشک رویہ اپنائے گا۔ جب کسی سے مخاطب ہو گا تو اس کی پیشانی پر سنجیدگی و سکوت کے بل پڑنے لگیں گے۔ گفتگو کرے گا۔ تو منہ بسور کر، کبھی ناک چڑھا کر اور بالعموم یوں صورت بنائے گا کہ آپ بیساختہ کہہ اٹھیں "کیوں صاحب آپ کیا رو رہے ہیں۔ یا اداس ہیں"؟

اس لمحے اگر کوئی منچلا پاس بیٹھا ہو گا تو فوراً جواب دے گا۔ جناب یہ رو نہیں رہے۔ ان کی شکل ہی ایسی ہے۔" تو ایسی شکل والے افراد ہمارے سماج میں بھرے ہوئے ہیں جن کا مسکراہٹ سے خدا واسطے کا بیر ہے۔ ان پر فقط مسکرا دینا مناسب ہو گا۔

ابن الوقت۔ خود غرض اور مفاد پرست لوگ مسکرانا نہیں جانتے۔ جب تک ان پر یہ واضح نہ ہو کہ ان کی مسکراہٹ سے انہیں کچھ خاطر خواہ اور فوری فائدہ نہیں ہو رہا ہے چنانچہ اگر پھیکی یا جھوٹی مسکان سے اگر ایسے صاحب کچھ مسکراہٹ کا تاثر پیدا کرنا چاہیں تو آپ شکسپیئر کے مقولہ کو ذہن میں تازہ کر لیجیے۔ جو فرماتے ہیں: "کوئی مسکرائے اور مکرر مسکراتا ہی جائے۔ تو سمجھ لیجیے کہ وہ آدمی ضرور ولین ہے"

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ مسکراہٹ زندہ دلی کی علامت ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر انسان زندہ دل نہیں ہوتا۔ دوسروں کے واسطے مسکراہٹ کے ذریعے خوشی کے احساس

کو زندہ و جوان رکھنا بڑے ظرف کا کام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سنتوں، مہاتماؤں اور صوفیوں نے اسے بڑی خوب صورتی سے نبھایا ہے۔ ایسے پہنچے ہوئے لوگ بلکہ مہا پُرش دل و جان سے مسکراتے ہیں۔ سماج کے ہر فرد کو خوش رکھنے کی خاطر اور اُسے نفسیاتی توانائی دینے کے لیے ضرور مسکراتے ہیں۔ ہر قیمت پر، ہر مرحلے پر اور ہر حالت میں۔ ایسے مہا پُرشوں کی کوئی شبیہ ملاحظہ کر لیجیے۔ ان کی مسکراہٹ پر آپ فدا ہونے کو تیار ہو جائیں گے۔ سنت کبیر داس تو ایک قدم اور آگے بڑھنے کے حق میں تھے۔ وہ تو مست ملنگ تھے ہی اور ان کا نظریہ حیات بھی دنیاداری سے کوسوں دور تھا۔ اسی لیے انھوں نے فرمایا ہے: "ہر حال میں مسکرانا تو چاہیے ہی خواہ آدمی کی بساط ہو یا نہ ہو۔ ہاں اگر بن پڑے تو مسکرانے کی بجائے ناچنا چاہیے"

ایک ماہر نفسیات کا کہنا ہے کہ مسکراہٹ رُوح کی طرح ہر طرح کی ملاوٹ سے پاک و صاف رہتی ہے اس میں بناوٹ کو دخل بہت زیادہ نہیں ہوتا۔ یہ بالعموم سونے کی طرح کھری ہوتی ہے جس پر بناوٹی ملمع کاری ممکن ہی نہیں، کچھ لوگ کاروباری یا سماجی مصلحت کی وجہ سے شکنوں کی کھینچا تانی سے اگر مسکراہٹ کا انداز یا رنگ پیدا بھی کر دیں تو دزدیدہ نگاہیں اصلیت بھانپ لیتی ہیں، بالفرض اگر ایسا نہ بھی بھانپ سکیں تو مسکراہٹ کی ہمہ گیریت پر کوئی آنچ نہیں آتی۔ سونا آخر سونا ہوتا ہے اور اس کی اصلیت سونا ہی رہتی ہے۔ بُنیادی طور پر یہ باور کرنا پڑے گا کہ مسکراہٹ کا خمیر رُوح کے سکون اور قلب میں رواداری کے مادے سے ہی تیار ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے اللہ والے لوگوں کے ہونٹوں پر اُداسی یا مایوسی کی بجائے مسکراہٹ ثبت ہوتی ہے۔ اور یہی پہچان ہے اللہ والوں کی روحانیت کی معراج کی، ان کے صدقِ دل کی، اُن کے عرفان و آگہی کی، اور اُن کی طہارت و پاکیزگی کی۔ سوا ای وویکانند ایک جگہ لکھتے ہیں۔ اگر آپ ہر وقت خوشگوار موڈ میں مسکراتے رہیں تو اس طرح کا رویّہ آپ کو خدا کی قربت نصیب کرائے گا۔ اس طرح کی قربت بڑی سے بڑی ریاضت، پاکیزگی اور بندگی سے بھی حاصل نہیں ہو سکتی۔

فلم ہو یا ناول، سماجی زندگی ہو یا گھریلو زندگی جب ایک محبت بھرے دل سے محبت

کا اظہار مقصود ہو تو یہ اظہار مسکراہٹ کے ذریعے ہی ہوتا ہے۔ خصوصاً دو اجنبی کرداروں یا دو محبت کرنے والوں میں مسکراہٹ اولین تعارف کا حق ادا کرتی ہے۔ اور پھر یہ مسکراہٹیں بڑھتی جاتی ہیں اور مسکراہٹوں سے ہی ایک دن محبت کا تاج محل تعمیر ہو جاتا ہے یہ جدا گانہ بات ہے کہ ہر عاشق اپنی محبوبہ کے لیے اور ہر خاوند اپنی بیوی کے لیے تاج محل تعمیر کرانے کی توفیق نہیں رکھتا۔ اگر شاہجہاں یہ توفیق رکھتا تھا تو اس کی مسکراہٹ توام ہو گئی اور تاج محل میں ڈھل گئی۔ آج اسی تاج محل کی دیواروں کی سائے میں شادی شدہ جوڑے حتیٰ کہ بوڑھے مرد اپنی بوڑھی رفیقۂ حیات کے ساتھ مسکراتے ہوئے اپنی تصویر کھنچواتے ہوئے فخر محسوس کرتے ہیں کہ انھوں نے محبت اور مسکراہٹ کی ایک یادگار اپنی تصویر کی صورت میں محفوظ کر لی۔ مسکراہٹ کو ریکارڈ کرنے کا کیا جواز نکالا ہے آج کے لوگوں کی مسکراہٹ یوں بھی معمولی ادا نہیں رکھتی ہومر کے الفاظ میں "مسکراہٹ محبت کی زبان ہے"۔

کچھ سنجیدہ اور کج فہم لوگ مسکراہٹ کو بے وقوفی دنیاداری یا لاپرواہی کی پہچان قرار دیتے ہیں آپ نے کبھی پاگل کو قریب سے پرکھا تولا ہے۔ اس کا مشاہدہ کیا ہے وہ ہر وقت آپ کو کھلکھلاتا ملے گا، لیکن پاگل کی مسکراہٹ جداگانہ انداز کی ہوتی ہے اسے اپنی یا سماج کی زندگی یا کسی قدر کی سمجھ ہی نہیں، دراصل بات یہ ہے کہ اگر آپ ہر بات دل پر لگانا چھوڑ دیں تو مسکرانے کا سکوپ بڑھ جاتا ہے۔ دل پر لگانے کی بات بھی نقطۂ نظر کی بات ہے۔ جو لوگ زندگی کے نشیب و فراز میں مسکرانے کی اہمیت جانتے ہیں وہ ضرور مسکراتے ہیں۔ انہیں زندگی میں آئے دن کے حادثات و دشواریاں حواس باختہ نہیں کر سکتیں۔ وہ قیدِ حیات میں بندِ غم کو ایک ضروری حصّہ تصور کرتے ہیں۔ ایسے جیالوں میں لوکمانیہ بال گنگا دھر تلک کی ایک خوبصورت مثال پیش کرتا ہوں۔ وہ زمانہ برطانوی سامراج کا تھا۔ کچھ کانگریسی دیش بھگتوں نے پونا میں موصوف کی ساٹھویں سالگرہ کی تقریب کا اہتمام کیا، جب جلسہ پورے جوبن پہ تھا اور خود لوکمانیہ جی حاضرین سے خطاب کر رہے تھے۔ اس لمحہ ایک پولیس آفیسر ان کے وارنٹ گرفتاری لے کر آ پہنچے، لوکمانیہ جی کو اشارہ سے بلایا گیا۔ انھوں نے حاضرین سے معذرت پیش کرتے ہوئے دو چار منٹ کے لیے رخصتی لی اور سٹیج سے نیچے اُتر کر پولیس آفیسر سے اپنے وارنٹ حاصل کیے،

اُسے بڑے خلوص سے کرسی پیش کرتے ہوئے اپنے خطبہ کو ختم کرنے کی اجازت چاہی اور فوراً ہی لوکمانیہ جی ڈائس پر پہنچ کر اپنی تقریر میں دوبارہ لگ گئے۔ اس طرح انھوں نے اپنی تقریر بڑے اطمینان سے ختم کی اور جب فارغ ہو لیے تو ڈائس سے مسکراتے ہوئے نیچے اُتر آئے اور پولیس آفیسر کو خطاب کرتے ہوئے کہا "چلیے صاحب میں حاضر ہوں"۔ قیاس کیجیے ایسے حالات میں کتنے آدمی مسکرا سکتے ہیں۔

مسکراہٹ اور تہذیب ہم سفر ہیں۔ اگرچہ ان کا اپنا انداز، اپنی کیفیت اور اپنا رنگ ہے ویسے آج کے سائنسی دور میں انسانی تہذیب بہت آگے نکل آئی ہے۔ ہزاروں میل کی مسافت طے کر چکی ہے۔ اور پھر کئی سنگِ میل بھی پار کیے ہیں، کئی منازل کو عبور کر کے اس کی پیش رفت جاری ہے، یہ صرف اس وجہ سے کہ آج کا انسان اپنی انفرادی و مجلسی زندگی کو ترقی و تعمیر پذیر دیکھنا چاہتا ہے۔ ایسی ترقی و تعمیر کی دوڑ میں انسان نے اپنی مسکراہٹ تو بڑی حد تک قربان کر دی ہے۔ نہ وہ ستانا جانتا ہے نہ سانس لینا۔ اس لیے اس کے لیے یہ بہت ضروری ہے کہ اپنے موڈ کو موافق و خوشگوار رکھنے کے لیے مسکرائے ضرور، اس طرح کی مسکراہٹ سے ایک نئی تازگی، شگفتگی اور توانائی نصیب ہو سکتی ہے اور یاسیت کی جگہ اُمید افزا فضا اور نظریہ پروان چڑھ سکتا ہے۔

آج کے انسان کو زندگی بسر کرنے کا آرٹ بھی آنا ضروری ہے۔ صرف ہماہمی اور مشینوں کی طرح بھاگ دوڑ ہی زندگی کا جواب نہیں۔ اور زندگی کا آرٹ روپے پیسے۔ جلال و حشمت یا علم و حکمت سے نہیں آتا۔ مسکراہٹ قائم رکھنے اور اسے نبھانے کے لیے دالتہ سماعی اور اور اپنے تئیں نیک نیتی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب یہ فرد کے اختیار و مرضی پر رہا کہ وہ مسکراہٹ سے زیادہ توانائی اور تازگی حاصل کرنا چاہتا ہے یا نہیں؟

ایک طبقے کا خیال ہے کہ مسکراہٹ زندگی میں دھوپ چھاؤں کی طرح چلتی ہے اور گولڈ اسمتھ مسکراہٹ کو ایک سراب سے تشبیہ دیتے ہیں جو عمر اور علم کے ساتھ زوال پذیر ہوتی رہتی ہے۔ ویسے بیشتر ادیبوں اور مفکروں نے مسکراہٹ کے حق میں بڑے بڑے دلائل پیش کیے ہیں اور سنجیدہ فلسفیوں۔ مذہبی رہنماؤں اور مفکروں نے یہ جتلانے کی سعی کی ہے کہ

مسکراہٹ ہماری شخصیت کے نہاں خانے میں موجود ہوتی ہے۔ ہاں یہ ان لوازمات سے حاصل نہیں ہوتی جو ہماری تفریح کا سامان پیدا کرتی ہیں، لیکن ایک بات صاف ہے کہ اگر ہماری روح مسکراہٹ کا جواز ڈھونڈے تو ہمیں زندگی کی ہر شے، قدرت کے ہر منظر، سماج کے ہر فرد سے تفریح و سکون میسر ہو سکتا ہے۔ اور دکھ نام کی کوئی چیز ہماری زندگی میں نہیں رہتی۔

روحانی مشاہیر اور اہلِ باطن نے مسکراہٹ کے لیے یہ نسخہ تجویز کیا ہے کہ جس طرح اہلِ باطن اسی دنیا ہی سے اپنی مسکراہٹ کا جواز نکال لیتے ہیں۔ اسی طرح عام انسان کو بھی اپنی مسکراہٹ کا جواز تلاش کرنا ہوگا۔ ہر حال میں مسکرانا اور راضی بہ رضا اگر ہر انسان کا مطمعِ نظر ہو جائے تو مسکراہٹ انسان کے قدم چومتی ہے پر راضی بہ رضا مطمعِ نظر اپنانے کے لیے بڑے ضابطے صبر، استقلال اور حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے اور شاید اسی وجہ سے مسکراہٹ کی ڈگر کٹھن معلوم ہوتی ہے بقول علامہ اقبال ؎

یہ کام ہیں انہی کے جن کے حوصلے ہیں زیادہ

بالفرض اگر آپ عادتاً مسکرانے میں قدرے کنجوس ہیں بھی تو ذرا حوصلہ رکھ کر مسکرا ہی لیں۔ اس میں بھی بڑی برکت و سعادت ہے کیوں کہ ڈاکٹروں کی رائے میں مسکرانے سے آدمی صحت مند رہتا ہے۔ بس یوں سمجھیے کہ مسکراہٹ صحت اور طاقت کی بہترین ٹانک ہے۔ جو بڑی بڑی آزمودہ دواؤں پر بھی بھاری ثابت ہو سکتی ہے۔ اس لیے مسکراہٹ کو نبھانا ہی ہوگا۔ یہ انفرادی ہی نہیں۔ بلکہ قومی اور مجلسی تقاضا ہے کہ اگر ہم ایک طاقت ور، ترقی پذیر اور صحت مند قوم بننا چاہتے ہیں۔ تو ہمیں مسکرانا سیکھنا پڑے گا۔

ایک ستم یہ ہے کہ ہم سینکڑوں برسوں سے بدنام ہیں کہ ہم ایک رونے والی قوم ہیں۔ کوئی نفسیاتی، سماجی، اقتصادی یا اعصابی مسئلہ آن پڑے تو ہم فوراً بھکاریوں کی طرح رونا شروع کر دیتے ہیں، نہ جانے مسائل کا مقابلہ کرنے کی ہمیں عادت ہی نہیں اور ہم فقط رونا ہی جانتے ہیں۔ کبھی اپنوں کے سامنے، کبھی دوسروں کے روبرو اور ایسے پاؤں پھیلا کر گھگیا گھگیا کر اس طرح روتے ہیں، کہ ہر کوئی ہم پر ترس کھانے لگتا ہے۔ ایک

ماہرِ نفسیات کے الفاظ میں: "ہماری قوم پچھلے دو ہزار برس سے ہنسی [illegible] ہی نہیں"۔ چنانچہ خوددار، معزز اور حساس قوم کی حیثیت سے ہمیں مسکرانا سیکھنا پڑے گا۔

رہی خوشحالی کی بات تو ہمیں اپنے معاشرے میں خوشحالی لانے کے ساتھ ساتھ مسکرانے کی عادت ڈالنی چاہیے۔ بلکہ سیانے کہتے ہیں کہ ہمارا آسمان اور باتوں کے علاوہ اسی لیے بنا ہے اور اس دن کے لیے دلی تمنا بھی رکھتا ہے۔ جس دن انسان بلاوجہ اپنی معصوم ہنسی ہنسے گا۔ اُمید کی جانی چاہیے کہ اگر ایسا ہو گیا۔ تو خدا بھی اس دن ضرور ہنسے گا۔ اس سے اس وسیع و عریض کائنات میں ایک نئی جولانی، شگفتگی اور توانائی آ جائے گی۔ اور یہ کائنات ایک لطیفے کی طرح کھل کر سدا بہار ہو جائے گی۔

جانور سے انسان تک

اندرجیت لال

آدمی کو حیوانِ ناطق کہا گیا ہے۔ صرف اس لیے کہ دوسرے جانوروں کے مقابلے میں یہ گرامر، صرف و نحو اور الفاظ کو اپنے اظہارِ خیال کے لیے استعمال کرتا ہے۔ مشرقی ملکوں کا یہ نظریہ ہے کہ یہ آدم کی اولاد ہے۔ اس جانور نے دانۂ گندم کی لذت سے خود کو آشنا کیا جس پر اس کو ایسی سزا بھگتنی پڑی یا یوں کہیے کہ ایسی بد دعا لگی کہ روزِ قیامت تک یہ جانور قیدِ حیات و بندِ غم میں جکڑا رہے گا۔ اور بہشت کی بجائے اس دُنیا ہی کا باسی ہو کر رہ جائے گا۔

یہ جانور ایک اعتبار سے ایک درخت کی طرح ہے جو دھرتی کے بدن سے اپنی صحت و زندگی کے لیے غذا حاصل کرتا ہے۔ غذا حاصل کرنا بھی اتنا آسان نہیں۔ اس لیے اپنی روزی روٹی کے لیے یا تسخیرِ ملک کے لیے اپنا گھر بار چھوڑ کر یہ دوسرے ملکوں کی طرف ہجرت کرتا ہے ہجرت انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی یعنی غول کا غول ہزاروں میل کی مسافت طے کر کے سردی گرمی اور تکان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے دوسروں ملکوں میں ہجرت کرتا ہے۔ تاریخ کے اوراق اس جانور کی ہجرت سے بھرے ہوئے ہیں۔ ہزاروں سالوں سے یہی ہوتا رہا کہ یہ دوپایہ ہجرت کرتا

چلا آ رہا ہے۔

یہ کوئی نئی بات نہیں کہ آریہ لوگ ہندوستان پہنچے اور پھر یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ یہی حال کئی دوسری نسلوں۔ قوموں اور قبیلوں کا بھی ہے۔ دراصل ہر ہجرت سے نئے نئے رشتے قائم ہوتے ہیں نئے معانی اُجاگر ہوتے ہیں ایک نیا امریکہ دریافت ہوتا ہے۔ ہجرت سے صدیوں کا زنگ اُترتا ہے۔ ہجرت والا ایک نئی تازگی و شگفتگی سے دوچار ہوتا ہے۔ اگر یہ جانور شروع ہی سے ہجرت نہ کرتا تو اس کی ساری اُپج اور انفرادیت میں نہ رہ سکتی تھی۔ دوسرے اگر یہ جانور ایک خطۂ زمین سے اپنے گھر بار کو خیرباد کہتے ہوئے کسی دیارِ غیر میں اپنی جڑیں اُتارتا ہے تو اس کا ایک خاطر خواہ فائدہ بھی ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ اپنے بدن اور رُوح کو ایسے نئے اوصاف سے رُوشناس کراتا ہے جو نئی خطۂ زمین کے دُودھ نمک اور پانی کی تاثیر سے عبارت ہوتے ہیں۔

یہ قدرتی ہے کہ جو اوصاف نئی خطۂ زمین کے دُودھ پانی اور نمک کی ہوگی وہ نئے وارد ہونے والے باسیوں میں بھی پیدا ہو جائے گی۔ دھرتی ماں کا اثر ہر بسنے والے پر ہوتا ہے خواہ وہ باسی آبائی ہو یا نیا آباد ہُوا ہو۔ یُوں سمجھیے کہ نئی زمین پر بسنے والا رفتہ رفتہ اُسی رنگ میں رنگ جاتا ہے۔ یہ دھرتی ماں کا کرشمہ ہی ہے کہ وہ دو الگ تہذیبوں کے باشندوں کو خود سے اس طرح چمٹا لیتی ہے کہ "من تو شدم تو من شدی" کا عالم پیدا ہو جاتا ہے۔

سائنس کی اِصطلاح میں انسان بندر کی اولاد ہے۔ اسے چارلس ڈاروِن نے لگ بھگ سوا سو سال پہلے یوں ایک نظریہ کے تحت تسلیم کیا تھا۔ اور آج کا آدمی بندر ہی کی ارتقائی کڑی ہے، ادیب، فلسفی، مورخ، سائنس داں، ماہرِ معاشیات، ماہرینِ تعلیم، غرض ہر قسم کے اہلِ فکر کو اپنے اپنے مخصوص نقطۂ نظر سے اس مسئلے میں دلچسپی رہی ہے کہ بندر کی یہ اولاد (جسے ہم آدمی کہتے ہیں) کس طرح ذہنی اور اخلاقی شعور کی منزلیں طے کرتا ہوا ارتقا سے گزرا ہے۔

یہ دوپایہ جانور آدم زاد یا آدمی انٹارٹیکا کو چھوڑ کر دُنیا کے ہر خطے میں پایا جاتا ہے اس کی رنگت میں بڑی رنگا رنگی پائی جاتی ہے کسی کا رنگ سُرخی مائل ہے تو کسی کا زردی مائل سفید ویسے مشرقی ممالک میں پایا جانے والا یہ دوپایہ عموماً گندمی رنگ کا ہوتا ہے۔ اس کی اوسط لمبائی

پانچ فٹ چھ انچ سے پانچ فٹ دس انچ تک ہوتی ہے۔ مادہ کی لمبائی یا قد قدرے چھوٹا ہوتا ہے اور نر کے مقابلے میں نازک اندام اور لطیف ہوتی ہے۔

یوں آدمی دوپایہ ہے لیکن چوپایوں کی طرح یہ ممیل ہے یعنی انڈے دینے کی بجائے بچے دیتا ہے اور بچوں کو اپنا دودھ پلاتا ہے۔ مادہ نو دس ماہ میں ایک بار بچے دیتی ہے جس میں موسم کی کوئی قید نہیں، ہاں مادہ ایک باری میں عموماً ایک بچہ دیتی ہے۔ لیکن کبھی کبھار دو بچے بھی ہو جاتے ہیں اور بعض مثالیں تو ایسی بھی ملتی ہیں جہاں ایک ہی وقت میں دو سے زائد بچے پیدا ہوئے ہیں۔

آدمی کو دوسرے جانوروں کے مقابلے میں قدرت نے ایک فضیلت بخشی ہے حواس خمسہ کی۔ حواس خمسہ کے وسیلے سے حیوانات کو اپنی صحت و تندرستی اور خارجی اشیاء کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن جانوروں کے احساس خمسہ آدمی کے حواس خمسہ کے مقابلے میں کم حساس اور قوی ہوتے ہیں یعنی جانوروں کی دیکھنے کی، سونگھنے کی۔ چھونے کی۔ سننے کی۔ چکھنے کی طاقت اتنی قوی نہیں ہوتی۔ یوں جانوروں میں بھی ان کے احساس خمسہ میں کچھ نہ کچھ فرق ضرور ہوتا ہے۔

خدا نے یا قدرت نے ایک بہت بڑی نعمت بھی آدمی کو عطا کی ہے۔ آپ اسے عقل کا نام دیجیے، آدمی کے سب کام کاج عقل ہی کی بدولت پورے ہوتے ہیں عقل کا دارومدار زیادہ تر حواس خمسہ کی تندرستی اور خصوصاً دماغ پر ہے جسم کی حفاظت۔ دل کی پاکیزگی روزانہ زندگی کا نقل و حمل۔ معاش کی دوڑ دھوپ معاملات کی خبرگیری۔ محفلوں میں شرکت۔ مشاغل میں مصروفیت سب حواس خمسہ ہی سے عمل میں آتا ہے۔ دوسرے اگر آدمی میں عقل کا جوہر نہ ہوتا تو یہ چرند پرند یا شجر و حجر کی مانند ایک کمتر مخلوق ہوتا۔ یہ عقل کے سہارے علم حاصل کرتا اور زندگی کے شعبے میں ترقی کے زینے پر چڑھتا چلا جاتا ہے اور دوسری مخلوقات سے ممتاز رہتا ہے۔ آخر آدمی آدمی ہے اور دوسری مخلوق دوسری مخلوق ہے۔

ان دنوں یورپ کے مشہور سائنس دانوں نے آئین سٹائن کے دماغ پر تحقیق شروع کر رکھی ہے اس زاویے سے کہ وہ کون سا جوہر آئین سٹائن کے دماغ میں مخفی تھا جس کی بدولت وہ اتنا عظیم تحقیقی و سائنسی کام کر سکا۔ آخر دماغ ہی تو ہے جو ایک آدمی کو بھی دوسرے آدمی سے اور دوسرے کو تیسرے سے اور اسی طرح تیسرے سے چوتھے کو ممیز کرتا ہے۔ ویسے آدمی تو ایک لیبل ہے صرف پہچان کے لیے باقی آدمی آدمی میں فرق رہا ہے۔ اور یہ فرق صرف اقتصادی سماجی

یا نسلی نہیں یہاں مُراد نفسیاتی و ذہنی فرق سے ہے جو ہر فرد میں اُس کی شخصیت کا ایک لازمی جُزو کی حیثیت رکھتا ہے۔

آدمی قدرت کی کائنات میں بڑا افضل درجہ رکھتا ہے۔ اور اشرف المخلوقات اور سرورِ کائنات کہلاتا ہے۔ یہ صاحب علم و بصیرت ہے کہ یہ اسی کا حصہ ہے کہ گذشتہ پانچ ہزار سال میں اس نے بے پناہ ترقی کی ہے۔ آج اس نے قطبین کے بُعد کو بے معنی بنا دیا ہے۔ اور کرۂ ارض پر شرق و غرب کے فاصلوں کو سمیٹ دیا ہے۔ اس نے مادے کی خفیف ترین اور ناقابلِ تقسیم یعنی ایٹم کو توڑ کر ایسی توانائی حاصل کر لی ہے۔ جو خزاں دیدہ گلستانوں کے لیے نوید بہار بن سکتی ہے۔ اس نے جسمانی کمزوریوں اور بیماریوں کا علاج ہی نہیں بلکہ ناکارہ اعضائے بدن کو تبدیل کر سکنے کا فن بھی دریافت کر لیا ہے۔ آدمی نے سائنس کی کنجی سے ان بے شمار بھیدوں کو کھولا جن کی حفاظت کا فطرت کو سودا رہا ہے۔ اس نے زمین اور آسمان اور ان کے درمیان کی طاقتوں کو تسخیر کیا۔ ذہن کی کاوش سے فلسفہ، طب، جغرافیہ، تاریخ۔ فلکیات۔ ارضیات۔ ریاضی کی بنیاد گزاری کی اور ہر دور میں علوم و فنون کی دُنیا میں نئے گل کھلائے۔

آج کے آدمی نے اپنے محسوسات و جذبات کے اظہار کے لیے شاعری، ادب، موسیقی۔ مصوری۔ تعمیر، سنگ تراشی اور رقص کے حسین روپ میں کیا۔ اس نے بیماری، جہالت اور بے کاری کو کم کرنے کی کوشش کی۔ آدمی واقعی عظیم اور مقتدر ہے اور حقیقی معنوں میں اولیٰ بالتصرف ہے کیونکہ ارض و سماوات میں جو کچھ ہے تو تگ بھگ سارا کچھ اس کے لیے مسخر کیا جا چکا ہے جگر مراد آبادی کے الفاظ میں ؎

گھٹے تو بس اک مُشتِ خاک ہے انساں
بڑھے تو وسعتِ کونین میں سما نہ سکے

اتنے افتخار کے باوجود آج کا آدمی خود ساختہ نظریات و اختراعات میں پھنسا ہوا ہے ہنگامۂ ارتقا، میں وہ اپنے جذبات و احساسات کی تکمیل میں آج کی تکنیکی ایجادات کے ہجوم میں گم ہو کر رہ گیا ہے۔ دوش فردائے انقطاع زمانی اور حال کی بے حالی آج کے آدمی کو گرداب

اضطراب میں ڈال دیتی ہے۔ اور آئندہ لمحات سے بے خبری اُسے بے یقینی اور مایوسی کے ظلمت کدے میں اسیر کر دیتی ہے۔ وہ خود کو بے بس و مجبور سمجھنے لگا ہے۔ کیونکہ آج کا آدمی خارجی حالات پر قابو پانے کی سکت نہیں رکھتا۔ دراصل اقتصادی، مالی و مادّی ترقی ہی سے آدمی زندگی بھر مطمئن نہیں رہ سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ آج دُنیا کے انتہائی ترقی یافتہ اور خوشحال معاشروں میں بھی نمی دانم کجا رفتم، کی سی کیفیت طاری ہوگئی ہے کہیں بے زاری اور اضطرار نے 'ہپّی ازم' کی شکل اختیار کر لی ہے تو کہیں مراجعت کا رجحان اسے پھر غاروں میں پناہ لینے پر اُکسا رہا ہے۔ کتنا عجیب لگتا ہے کہ آج کی اتنی آسائشوں کے باوجود آج کا آدمی اتنا بے قرار کیوں ہے۔ عوام و خواص دونوں بے قرار ہیں۔ مضطرب ہیں دکھی ہیں۔

آیئے اب تصویر کا دوسرا رُخ بھی آپ کو دکھائیں، کہ آج کا آدمی اتنا کچھ پا لینے پر بھی پریشان کیوں ہے۔ ہر وہ آدمی جو سماج سے، ملت سے حکومت سے پا لینے کے ارادے پر ایمان رکھتا ہے ضرور پریشان رہے گا۔ آدمی کو پا لینے پر خوشی منانے کی بجائے کچھ دینے پر خوشی منانی چاہیے۔ اگر سماج میں ہر فرد صرف پا لینے کا اصول بنانے تو آدمی کو سہارا۔ ہمدردی۔ امداد کہاں سے فراہم ہوگی۔ سماجی زندگی میں پانے کے اصول کے مقابلے میں دینے کا اُصول اپنائے تو سماج ترقی اور خوشحالی کی طرف بڑھ سکتا ہے۔ ورنہ نہیں۔ جذبہ خدمات کا جوان کرنا چاہیے نہ کہ تصرف کا لیکن آج حالت اُلٹ ہے۔ آج کے آدمی کی تصویر ایک دانشور یوں کھینچتا ہے۔

"انجیلِ مقدس میں لکھا ہے کہ خدا نے آدمی کو اپنی شبِیہ بنایا۔ اور اس میں زندگی کی روح پھونک دی۔" مگر اس اشرف المخلوقات کی شکل و صورت تو دیکھنا۔ وہ کُتے سے زیادہ شہوت پرست۔ لومڑی سے زیادہ مکار۔ شیر سے زیادہ خونخوار ہاتھی سے زیادہ پیٹو۔ گدھے سے زیادہ بے دماغ۔ خچر سے زیادہ ضدی۔ سانپ سے زیادہ زہریلا۔ اونٹ سے زیادہ کینہ ور۔ مگرمچھ سے زیادہ نسل کُش۔ بلّی سے زیادہ چور۔ بکری سے زیادہ بُزدل۔ اور بچھو سے زیادہ نیش زن ہے۔ ان جانوروں میں یہ برائیاں انفرادی ہیں۔ کسی میں ہیں، کسی میں نہیں۔ مگر یہ اشرف المخلوقات خدا کا بیٹا سب برائیوں کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ اور نسلاً بعد نسل اپنی اولاد کو ورثے

میں دے جاتا ہے۔ خدائے کریم نے دوسرے جانوروں کے لیے نہ کوئی رسول بھیجا اور نہ کوئی پیامبر۔ ان کے گناہوں کے کفارے کے لیے نہ کوئی مصلوب ہوا نہ کوئی شفاعتی آیا۔ مگر اس لاڈلے کے لیے خدا نے نہ جانے کتنے پیغمبر بھیجے۔ یہاں تک کہ خود بھی اس نے انسانی جامے میں آنے کی زحمت گوارا کی اور اپنے "اکلوتے بیٹے" کو بھی دار پر کھنچوایا۔ اس اشرف المخلوقات نے دُنیا کی ہر بلا کو فروغ دیا۔ زمین و آسمان کو زیر و زبر کیا اور سمندروں کو متھ کر رکھ دیا۔ اس کے ہاتھ چرند، پرند، اشجار حتیٰ کہ کل ارض و سما گریاں و نالاں ہے خود زمانہ بھی اس کے ہاتھوں تنگ ہے۔ اگر یہی اشرف المخلوقات ہے تو خدارا سوچ کر بتاؤ کہ ازلی مخلوق کس کو کہو گے۔

غالباً اقبال نے اس کیفیت کو یوں شعر میں ڈھالا ہے ؎

ہو نقش اگر باطل تکرار سے کیا حاصل
کیا تجھ کو خوش آتی ہے آدم کی یہ ارزانی

اصل مدعا یہ ہے کہ آج کے آدمی کو انسان بننا ضروری ہے۔ کہتے ہیں قطرے سے گوہر بننا آسان ہے لیکن آدمی سے انسان بننا بہت مشکل۔ غالب بھی یہ کہتے کہتے تھک گئے "کہ آدمی کو بھی میسر نہیں انسان ہونا"۔ اب قطرے سے گوہر ہونے تک آج کے آدمی کو بڑی محنت کرنی ہوگی کوئی نئے انسان گھڑنے کی نوبت نہیں آئے گی۔ نہ مصوروں کی، نہ سنگ تراشوں نہ شاعروں کی ضرورت۔ ہاں ضرورت ہے ایسے حسّاس فلسفیوں سماج سیوکوں اور مردانِ خدا کی جو آدمی کو انسان کے سانچے میں ڈھالنے کے فن و ترکیب سے روشناس ہوں اور اس کے لیے اپنا خونِ جگر صرف کرنے کو تیار ہوں۔ بغیر کٹھن کڑیاں جھیلے آدمی انسان کے عالی مقام تک نہیں پہنچ سکتا۔ آدمی تو دُنیا میں اربوں کروڑوں ہیں لیکن انسانوں کی تعداد قابلاً بہت کم ہے۔ اسے یوں بھی کہہ سکتے ہیں۔ ادھر یہ دوپایہ ارتقا کے سہارے جانور سے آدمی تو بہر نوع بن پایا لیکن اس سے آگے انسان نہیں بن سکا۔

آدمی سے انسان بننے کے لیے اخلاقی و نفسیاتی جدوجہد کی ضرورت ہے۔ محبت و خلوص کا چراغ دلوں میں روشن ہونا چاہیے جو کہ اس وقت بُجھا ہوا ہے یہی وجہ ہے کہ انسانوں کے باہمی رشتوں میں انصاف اور رواداری اور شیرینی باقی نہیں رہی۔ انسان دوستی کا تصور

بھی سماج سے مفقود ہو چکا ہے۔ آج کے سماج کو ضرورت ہے۔ ایسے انسانوں کی جو تعصب، تنگ دلی اور حق تلفی سے پاک ہوں اور جن کا شیوہ ہو فراخ دلی۔ حق پسندی، رواداری، راست بازی، بردباری اخوت اور ہمدردی۔

ایک اور بات، آدمی سے انسان کا مرتبہ لینے کے لیے باطنیت کی دریافت اور اس کے اقتدارِ عمل کو اپنانا بھی ضروری ہے۔ آج کے سائنس دانوں کے ایک طبقے کا قیاس ہے کہ سائنس اپنی ترقی کی انتہا پر پہنچ کر روحانیت اور نیچر سے مل جاتی ہے۔ سائنس دانوں کا قیاس صحیح ثابت ہو نہ ہو آج کے آدمی کو خود روحانیت کا سہارا لینا ہوگا۔ جو سکونِ قلب ہی کے لیے ضروری نہیں۔ انسان دوستی کے لیے بھی ایک لازمی جزو ہے۔ روحانیت ایک بکھیڑا نہیں۔ بلکہ سکون و اطمینان کا صحیح و سچا راستہ ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ انسان دوستی کی تکمیل و تعمیل انہی مردانِ خدا کے ہاتھوں عمل میں آئی جن کے قلوب روحانیت سے سرشار تھے۔

ترقی کی انتہا پر پہنچ کر روحانیت آتی ہے۔ سائنس دانوں کا قیاس صحیح۔ آج کے آدمی کو خود روحانیت کا سہارا لینا ہوگا۔ جو سکونِ قلب ہی کے لیے ضروری نہیں انسان دوستی کے لیے بھی ایک لازمی جزو ہے۔ روحانیت ایک بکھیڑا نہیں بلکہ سکون و اطمینان کا صحیح و سچا راستہ ہے۔ تاریخ شاہد ہے۔ کہ انسان دوستی کی تکمیل و تعمیل انہی مردانِ خدا کے ہاتھوں عمل میں آئی جن کے قلوب روحانیت سے سرشار تھے۔

جب قلب روحانیت سے سرشار ہوں گے تو خلوص۔ محبت۔ رواداری۔ ہمدردی۔ ریاضت اور پرہیزگاری کی اسپرٹ جواں سے جواں تر ہو جائے گی۔ اس رفتہ رفتہ آدمیت کی جگہ انسانیت لے لے گی۔ سماج میں آدمی سے انسان کا ارتقاء بڑا خوش آئند ہے۔ اس سے ایک صحت مند۔ حسین۔ پُرامن اور خلیق یگ کا آغاز ہوگا۔

نئے لوگ

جوگندر پال

کوئی چار پانچ دہے پہلے میرے لڑکپن کا ذکر ہے کہ بعض لوگوں کو ہماری روزمرہ کی قیام اور خوابناکی کی کیفیات بے حد کھلتی تھیں۔ اپنی گرجدار تقریروں میں وہ موقع بے موقع ہمیں تیز تیز چلنے کی تلقین کرنا نہ بھولتے اور ہر دوسرے تیسرے فقرے پر اس بات پر زور دیتے کہ خدا کے لیے اپنی آنکھیں ہمیشہ کھلی رکھو، جاگتے رہو، ورنہ جہاں پڑے ہو وہیں پڑے رہ جاؤ گے اور انہیں سنتے ہوئے ہم اپنے گرم جوش انہماک میں بار بار ہڑبڑا کر نعرہ بلند کرتے، انقلاب زندہ باد!

سن سن کر آخر ایک مقام آ ہی جاتا ہے کہ آدمی انجانے میں گنتے ہوئے پر عمل کرنا شروع کر دیتا ہے، سو اب یہ نوبت آ گئی ہے کہ ہمارے پاؤں رکنے میں نہیں آتے اور اس دوران چلتے چلتے ہم اپنے ٹھکانوں سے اتنا آگے نکل آئے ہیں کہ سمتوں کا تعین کھو بیٹھے ہیں اور تھک ہار کر جب سونے کے لیے گر جاتے ہیں تو آنکھیں چوپٹ کھول کر سوتے ہیں۔ چند ہی روز ہوئے میری بیوی اسی حالت میں پڑی ہوئی تھی اور اپنی دانست میں اُسے اس قدر منہمک پا کر سست ہوا

بنا باتیں کیے جارہا تھا۔ مجھے نا معلوم کیا سوجھی کہ یکلخت میں بڑی ملائمیت سے اُس پر جھک آیا اور عین اُسی وقت وہ چیخ مار کر بیٹھ گئی ": نہیں! "کیا ہوا ہے بھلی لوگ؟" شرمندہ ہو کر پرے ہٹ گیا وہ ابھی تک بوکھلائی ہوئی تھی۔ "میں خواب دیکھ رہی تھی کہ کوئی پرایا مرد مجھ پر جھکا چلا آرہا ہے"

یہی تو ہوا ہے۔ ہم نے اپنی آنکھوں کو کھول کھول کر اتنا چپٹا کر لیا ہے کہ اپنے بھی صاف پرائے دکھتے ہیں اور اُن سے بچاؤ کی کوشش میں ہم سوتے میں دوڑ رہے ہوتے ہیں اور دوڑ دوڑ کر جہاں پہنچتے ہیں وہاں پھر انہی کو پاکر چیخ مار کر آنکھیں کھول لیتے ہیں اور آنکھیں کھلنے پر بھی وہی بے یقینی، بیگانگی، بے مقامیت وہی بھاگا بھاگ، کہیں بھی نہ جانے کے لیے بھاگا بھاگ!

چھٹی کے دن ہمارے گھر کے افراد اکثر آؤٹنگ پر جانے کی طے کرتے ہیں، مگر مشکل یہ آن پڑتی ہے کہ جایا کہاں جائے۔

"چلو، کسی باغ میں دن گزارتے ہیں۔" میری بیوی تجویز کرتی ہے۔ "مگر نہیں، مجھے تو ہرے گھاس سے الرجی ہے۔" وہ سوچنے کے لیے ذرا رُکتی ہے۔ "چلو تمہارے ماموں کے یہاں چلتے ہیں۔" "اگر اپنی بھابی سے اُس کی بنتی ہو تو وہ چوبیس گھنٹے وہیں بتایا کرے۔"

"بھیا بہت اچھے ہیں۔" وہ شاید مجھے چڑانے کی خاطر کہتی ہے۔

مجھے اچھے لوگوں سے الرجی ہے۔ میرا سائنس داں بیٹا اُسے ٹوک کر سب کو بتاتا ہے کہ اُسے فیملی کے ساتھ کہیں نہیں جانا ہے، کیونکہ اسی وقت اُسے اپنی لیبارٹری پہنچ کر مائیکرو سکوپ کے نیچے کسی بیماری کے کلبلاتے جراثیم کا مطالعہ کر کے اپنی رپورٹ تیار کرنا ہے۔

اس کے لیے مائیکروسکوپ کی کیا ضرورت ہے؟ حالانکہ مجھے معلوم ہے میری اُلم غلّم سے اُسے کوئی دلچسپی نہیں، پھر بھی میں بولنے سے باز نہیں آتا۔ سیدھے دو آنکھوں سے ہمیں دیکھ لو۔

میرا بیٹا مجھے کچھ جواب دینے کی بجائے اپنی بہن سے کسی بات پر جھگڑنے لگتا ہے۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے ہم سبھی اُن کے بے سبب جھگڑے میں اُلجھ جاتے ہیں اور اپنا آگے پیچھے کا حسا

چکانے لگتے ہیں اور پاؤں پٹختے ہوئے اپنے کمروں کی طرف ہو لیتے ہیں اور بستروں پر دراز، سر سے پاؤں اور پاؤں سے سر تک سرپٹ بھاگتے ہوئے کیا پتہ کہاں پہنچنے کے لیے آؤٹنگ پر چڑھ نکلتے ہیں۔

کسی اور کا تو مجھے پتہ نہیں، میں اپنے لڑکپن کے شہر میں گویا پرانے گھر کے کچے کوٹھے پر نیلی چھت کے نیچے پڑا ہوتا ہوں جہاں رنگ برنگے پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ منڈلا رہے ہوتے ہیں اور بعض مجھے اپنی طرف متوجہ پا کر ہمارے کوٹھے کی منڈیر پر اتر آتے ہیں اور مدھر بولوں میں اپنی پوری رام کہانی شروع کر دیتے ہیں جس پر کان دھرے میرے پر نکل آتے ہیں اور میں بھی اُن کی رفاقت میں اپنے کچے کوٹھے کے عین اوپر چمکیلی نیلاہٹوں میں اُڑ رہا ہوتا ہوں مگر اسی دم مجھے جاگتے رہو، کا نعرہ سنائی دیتا ہے اور میری بیوی مجھے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر جگا رہی ہوتی ہے۔ "یہ وقت کوئی سونے کا ہے؟ اٹھو!"

"سونے کے وقت مجھے نیند نہیں آتی۔"

"تو گولیاں کھا کے سو جایا کرو۔ ہر کام اپنے وقت پر کرنا چاہیے۔"

ہمہ وقت کام کے عادی ہو کر اب ہمیں یہ صورت حال درپیش ہے کہ سونے کے لیے سونے اور کھانے کے لیے کھانے کی بجائے ہم سوتے یا کھاتے ہوئے گویا کوئی کام انجام دے رہے ہوتے ہیں۔ اور تو اور، ہمارے ہنسنے یا رونے میں بھی واقعی ہنسنے یا رونے کا کوئی جواز نہیں ہوتا، سوائے اس کے کہ 'یوگا فار ہیلتھ' کے کسی بار مطالعہ کے بعد ہم پر روشن ہو چکا ہے کہ ہنسنا یا رونا بدن کے لیے ایک نہایت مفید کسرت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ طلوع سے پہلے پبلک پارکوں میں دیکھنے میں آتا ہے کہ بیسیوں بوڑھے نیکریں اور بنیانیں پہنے قطار در قطار ورزش کے طور پر زار و قطار ہنس رہے ہوتے ہیں۔

کھانے کے سلسلے میں میرا سائنس داں بیٹا بڑا محتاط ہے، مگر مجھے شبہ ہے کہ اسی احتیاط کے باعث وہ سدا بیمار رہتا ہے۔ جن کھانوں سے لذت کا بھرپور احساس ہو وہ اسے قطعاً ناپسند ہیں۔ اس کی تھیوری ہے کہ کھانا مزیدار سا لگے تو کھانے والا اسے چبائے بغیر نگل جاتا ہے۔ اس لیے کھاؤ تو ہمیشہ بے لذت کھاؤ اور لذت محسوس ہوتے ہی کھانے سے

ہاتھ کھینچ لو۔ وہ قاعدوں کُلیوں کی بہت سخت پابندی کرتا ہے۔ اُس سے بخوبی واقف ہونے کے باوجود مَیں کبھی کبھی اُس کے سامنے مقاماتِ دل کے اسرار کھولنا شروع کر دیتا ہوں جس کے جواب میں وہ دل کا رقبہ عین بین بیان کر کے پوچھتا ہے، اتنی سی جگہ میں یہ سارے مقامات کیونکر سما سکتے ہیں؟ میں جب جھوم جھوم کر اُسے سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں کہ دل کتنا بڑا ہوتا ہے تو وہ مجھے اپنے جواب سے لاجواب کر دیتا ہے! "بحث مت کرو ڈیڈ، دل اگر اپنے چند انچوں کے رقبے سے ذرا بھی بڑا ہو جائے تو اُس کا فوری اپریشن لازمی ہو جاتا ہے۔"

اپنی بے معنی رفتار کی سہولتوں کے لیے آج ہم نے آکاش کو پرندوں سے خالی کر دیا ہے اور اپنی خود کار مشینوں میں بیٹھے نشے میں جنگھاڑتے ہوئے اپنے سروں پر بے سمت اُڑتے رہتے ہیں۔ ہمارے گھنے جنگل کبھی ہمارا سارا زہر چوس لیا کرتے تھے اور ہمیں اپنا آپ اتنا سُبک معلوم ہوتا تھا مانو ہمارے جسموں سے روشنیاں پھوٹ رہی ہوں مگر اس دور میں ہمارے جنگلوں میں ہرن اور ہاتھیوں کی چاپ کی بجائے ہمیں بے ضمیر مشینوں کا بے ہنگم شور سنائی دیتا رہتا ہے جو خاموش اور خوف زدہ اور معصوم درختوں کی جڑیں دن رات کاٹتی چلی جاتی ہیں۔ ہمارے سمندروں میں مچھلیوں کی بستیاں ویران ہوتی جا رہی ہیں۔ جو مچھلیاں نیوکلیائی دھماکوں سے بچ جاتی ہیں وہ بھی جان بچانے کے لیے خشکی کی طرف لپکتی ہیں۔ یہاں خشکی پر انسانوں نے زمین کے کلیجے میں تارکول بھر بھر کر اپنی کدورتوں کی راہیں خوب ہموار کر رکھی ہیں۔ اور یہ سب کچھ ہمیں اس لیے بےجا نہیں لگتا کہ انسانی دل کی کائناتی بیکرانی انچوں کے رقبے میں سمٹ آئی ہے جہاں وہ اپنے بے ذات جراثیم میں منتقل ہو کر ایک اپنی ہی رفاقت میں کلبلا کلبلا کر سوچا کرتا ہے کہ کوئی ایسی تدبیر کرے جس سے ساری دنیا نیست و نابود ہو جائے بس ایک وہی محفوظ رہے۔

ہم اپنے معاشرے میں مستقبل میں تال میل پیدا کرنے کی خاطر ابھی سے پریشان ہیں۔ کیا اس تال میل کا ماحصل یہ ہے کہ سب ایک دوسرے سے خوف زدہ ہو کر اپنے اپنے وجود کو اپنا زنداں بنا لیں؟ آنے والے دنوں میں کیا ہمیں زندگی کی اکائی سے اُکھڑ کر ڈھیریوں میں منتشر ہو جانا ہوگا، کیا ہمارے دُکھ سُکھ کا کوئی ساجھی نہ ہوگا، سبھی رشتے ٹوٹ

پھوٹ جائیں گے ہمیں کوئی اچھی خبر ملے گی تو اُسے اپنے آپ کو ہی سُنا سُنا کر خوش ہو کر بالآخر ہم رو دیں گے؟ کیا۔؟ کیا؟

میرے سائنسدان بیٹے کا کہنا ہے: "تمہیں اور کیا چاہیے ڈیڈ؟ تم لوگ سمجھتے ہو کہ موت کے بغیر ساتویں آسمان پر کیسے پہنچا جا سکتا ہے۔ ہم نے تمہیں سمجھا دیا ہے کہ یوں ابھی جاؤ جیتے جی ساتویں یا آٹھویں آسمان سے ہو آؤ۔"

مَیں اپنے بیٹے کو کیوں کر سمجھاؤں کہ ہمارے نئے لوگ سائنسی کمال کو اس حد تک چھو رہے ہیں کہ مر کھپ چکنے کے بعد بھی چل پھر رہے ہیں۔ ان کے بنائے ہوئے روبو بھی تو انہی کے مانند بے واسطہ جی جی کر اپنے معرکے انجام دے رہے ہیں۔

"میں آپ کو ایک سچی واردات سناؤں؟"

ایک دن مجھے اپنے ایک کردار کے رونے کی آواز سنائی دی۔ میں نے فوراً پہچان لیا کہ یہ تو میری کہانی "دُکھ ہرن" کی موہ مائی ہے۔ میں نے گھبرا کر جھٹ یہ کہانی کھول لی۔

"کیا بات ہے، مائی؟"

اس نے بتایا: "آج مَیں بے دھڑک تمہاری بیٹی کے ذہن میں داخل ہو گئی۔ سوچا تھا، جب سے اُس نے اپنے شوہر سے طلاق لی ہے کمرے میں اکیلی پڑی رہتی ہے، اس کا دکھ بانٹ لوں گی۔ مگر ظالم نے مجھے دو چار سطریں پڑھ کے ہی کتاب کو فرش پر پھینک دیا۔ میں دیوار سے ماتھا پھوڑ کر اوندھی پڑی رہی مگر وہ ہونٹوں کو گول کر کے سیٹیاں بجاتی رہی۔"

"پر موہ مائی، تم کس کا دُکھ بانٹنا چاہتی تھی۔ میری بیٹی نے تو اپنی خوشی سے طلاق لی۔ جب سے کمپیوٹر نے اُسے بتایا کہ تمہاری اور تمہارے شوہر کی طبیعتوں میں زمین اور آسمان کا فرق ہے، وہ اپنی مرضی سے اُس سے الگ ہونا چاہ رہی تھی۔ اُس کا شوہر بے چارا تو ہاتھ جوڑ جوڑ کر اُس سے کہتا رہا، آؤ ایک بار پھر کمپیوٹر سے پوچھ لیتے ہیں، شاید کوئی راستہ نکل آئے۔"

اب راستہ تو ایک ہی باقی ہے: جو انسان ابھی روبو نہیں ہو پائے وہ بھی جلدی سے اپنی تکمیل پر پہنچیں اور روبو ہو جائیں تاکہ آنے والی صدی کے منجدھار میں صرف خود کار مشینیں ہی مشینیں جی رہی ہوں، بے محبت اور بے واسطہ، اور وہ اپنے بچے پیدا کرنے کی بجائے حسب

ضرورت انہیں بنایا کریں۔ اور پھر مشینوں کے بوڑھا اور ناکارہ ہونے پر انہیں ڈمپ کر کے بہ جبر ضائع کر دیا جائے، تاکہ زندگی کی ٹریفک میں کوئی خلل واقع ہونے کا اندیشہ نہ رہے۔ مشینیں روئیں گی نہ ہنسیں گی، بس ہوں گی اور اُن کے ہونے سے ناقابلِ یقین معرکے سر ہوتے رہیں گے۔ خدا کو کیونکر معلوم ہوگا کہ نسلِ آدم کی جگہ اب پُرزوں کے پیکر نے لے لی ہے؟ سزا؟ روبوؤں کے لیے سزا کیا اور انعام کیا؟ انہیں نادر محسوس ہوتا ہے، نہ کرب۔ کچھ بھی ہو جائے انہیں کچھ بھی نہیں ہوتا۔ کیا؟ یہ بھی ممکن ہے کہ مشینوں کی آپس میں ٹھن جائے۔ پھر؟ پھر سب کچھ اپنے انجام پر آ پہنچے گا۔ زمین اور آسمان اور آسمان میں چمکتے ہوئے چاند تارے۔ خلاء کے سوا کچھ بھی نہ رہے گا۔ ہر سو خلا ہی خلاء۔

جب کوئی بچہ بھوک سے بلکتے ہوئے دم توڑتا ہے، یا کوئی معذور بیمار دوا دارو کے وسائل نہ ہونے کے باعث پرلوک سدھار جاتا ہے، یا اپنے آدرشوں پر اڑ جانے والے کو پھانسی پر جھلا دیا جاتا ہے تو میرے دل میں ویسا ہی کائناتی خلاء اُٹھنے لگتا ہے اور میں ڈر محسوس کرنے لگتا ہوں کہ نردوشوں کے لیے دوسری دنیا بھی محفوظ نہ رہی تو کس اُمید سے مریں گے؟ زندگی کے نہیں تو کم سے کم ہمیں موت کے امکانات کو تو بنائے رکھنا چاہیے۔ مجھے یقین ہے کہ نظامِ کائنات میں بے حساب دیکھے اور ان دیکھے رابطے کارفرما ہوتے ہیں اور زندگی کی اعلیٰ ترافزائش دراصل انہی رابطوں کے عرفان سے عبارت ہے۔

رچے بسے رشتوں کی توانائی سے خالی ہو کر ہم آپ ہی اپنے اقتدار کے بوجھ تلے ٹوٹ پھوٹ کر رہ جائیں گے۔ ہم اپنی ترقی کے جتنے بڑے وسیلے فراہم کرنے کے خواہش مند ہیں، ہماری محبتوں کی صلاحیت کا بھی اتنا ہی بڑا ہونا ضروری ہے۔ ایسا نہ ہو پائے تو عدم توازن سے بھونچال کے اسباب ہونے لگتے ہیں۔

اے ہوش مندو!

جوگندر پال

ایک دفعہ میرا ایک دوست اور میں کسی شاہراہ کے فٹ پاتھ پر چلے جا رہے تھے کہ اس نے بے اختیار ہنستے ہوئے مجھے کہنی ماری اور پہلو میں ایک راہگیر کی طرف اشارہ کیا، جو نہایت سنجیدگی سے اپنے دائیں ہاتھ کی پہلی انگلی ہلا ہلا کر بائیں ہتھیلی کو کچھ سمجھائے جا رہا تھا —— اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟ میں نے اپنے دوست سے کہا —— اپنے اندر ہی اندر ہم سبھی یہی کچھ تو کرتے رہتے ہیں۔

تو پھر کیا نارمل شخص پاگل ہے؟ —— آپ کے اس سوال کا جواب دینے کے لیے میں آپ سے یہ پوچھنا چاہوں گا کیا یہ پاگل پن نہیں کہ اپنے نارمل ہونے کا بھرم بنائے رکھنے کے لیے کوئی خواہ مخواہ پاگل ہوتا پھرے! اور تو اور جنھیں آپ پاگل سمجھ کر پاگل خانوں میں بند کر دیتے ہیں اُن کے روبرو بھی کوئی یہ دعویٰ کرے کہ وہ پاگل نہیں تو اپنی نہایت زرخیز چھٹی حس کے باعث اُن کی سمجھ میں فوراً یہ بات آ جاتی ہے کہ اُن سبھوں میں سے ایک صرف وہی ہے جو پاگل ہے —— نہیں، اس ضمن میں آپ کا خیال کہ پاگلوں کو ہوش مند ہی پاگل معلوم ہوتے

ہیں، بجا نہیں ـــــ یہ اس لیے، کہ دونوں ایک دوسرے کو یکساں طور پر پاگل معلوم ہوتے ہیں، پھر کون پاگل اور کون ہوشمند ؟

باہوش آدمی کی شناخت کو عام طور پر اس کی ٹھہراؤ کی مہذب عادت سے وابستہ کیا جاتا ہے، یعنی وہ اپنے گھر کو آگ لگنے کی اطلاع پاکر پہلے تو نہایت تحمل سے آپ کا شکریہ ادا کرے اور پھر بڑی خوش خلقی سے آپ کو چائے پینے کی دعوت دے اور اتنی دیر میں آپ کی بہم پہنچائی ہوئی اطلاع کو بھول کر آپ سے پوچھے آپ اتنے حواس باختہ کیوں نظر آتے ہیں؟ بتایئے میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں ! ـــــ خیر یہ ذی ہوش تو آپ کی خدمت بجالانے کے آداب کی خاطر اپنا ہی گھر پھنکنے کا منظر آنکھوں میں نہیں لاپاتے، آپ اس قماش کے لوگوں کا کیا کیجیے گا۔ جو آپ کا گھر پھنکنے کی خبر پاکر بڑے سبھج قدموں سے موقع واردات پر قدم رنجہ فرماتے ہیں اور جن کا چین و اطمینان دیکھ کر آپ کو اپنی آگ بجھانے کی بے چینی مضحکہ خیز لگنے لگتی ہے اور پھر آپ بھی اُن کے ساتھ بڑی پُرچین ہوشمندی سے اپنی تباہی کا تماشہ کرنے لگتے ہیں۔ ظاہر ہے اپنی تباہی کا تماشہ کیے جانے سے صرف آپ ہی تباہ ہورہے ہوتے ہیں اور آپ کو اپنی نجی حماقتوں کے تمام تر جمہوری حقوق حاصل ہیں، لہٰذا ہم آپ کو بھی نظر انداز کیے دیتے ہیں، مگر آپ ان ہوشمندوں کا کیا کیجیے گا جو ہمہ گیر تباہی کو بھی نہ صرف سکوں سے دیکھتے چلے جاتے ہیں بلکہ اس صورت حال پر واقعتاً سکون محسوس بھی کرتے ہیں اور اپنے سکون کے احساس کو بنائے رکھنے کی خاطر کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے۔

پرانے لوگوں کی بے خبری اور سادگی کو آج ہم ان کی پسماندگی سے تعبیر کرتے ہیں، مگر کُل عالم کی خبروں کی ٹوہ پا پاکر کیا ہم زندگی کے اس موڑ پر نہیں آکھڑے ہوئے جہاں ہر لحظہ ہم اس دہشت میں مبتلا ہیں کہ اگلی خبر سے نامعلوم کس نوعیت کی ہلاکت کا باب کُھل جائے! اس دہشت کے تدارک کے لیے ہمیں یہ ایکسپرٹ رائے فراہم کی جاتی ہے کہ جو بھی بیت جائے یہی سمجھو، کچھ ہوا ہی نہیں۔ بُری سے بُری خبر پاکر بھی لاپرواہ ہو۔ بلکہ خبر جتنی زیادہ بُری ہو اتنے ہی زیادہ خوش نظر آؤ، سو جب مجھے کوئی نہایت خوش معلوم ہوتا ہے تو میں گھبرا سا جاتا ہوں

کہ بے چارہ کہیں دہشت زدہ تو نہیں۔ ہمیں خبردار کیا گیا ہے کہ انسان کا دل اُس کا خون صاف کرنے کی نہایت نازک مشین ہے، اِس مشین کو احتیاط سے نہ برتنا غیر ذمہ داری کے مترادف ہے۔ مفت ایکسپرٹ ایڈوائس کی یہ سہولتیں اگلے وقتوں میں عوام کو کہاں نصیب تھیں ! ـــــ مگر اپنی اس مشین کو نہایت احتیاط سے برت برت کر ہم نے اپنے جذبوں کو بے مقام کر دیا ہے ـــــ تو کیا ہوا ! جذبوں سے لیس ہوکر ہم نے بڑے طمطراق سے جنتی منزلیں تسخیر کرنے کی ٹھان رکھی ہے ـــــ نہیں، شیطان کی کیا ہمت، کہ ہماری سائنسی قوت کے سامنے دم مار سکے ! اپنے بچاؤ کے لیے وہ جہنم کی سرحدیں پھلانگ کر ہماری مہذب دنیا میں ہی آچھپا ہے اُس نے سوچا ہوگا کہ حالات بہتر ہوتے ہی واپس چلا جاؤں گا مگر انسانی ترغیبوں کی تاب نہ لاکر اب وہ مستقلاً یہیں بس گیا ہے۔ ہماری انٹلی جنس کی پکی خبر ہے کہ وہ یہیں ہماری دنیا میں ہے ہم اُسے پکڑ تو لیں مگر ہماری اطلاع کے مطابق وہ اب اتنا جنٹلمین دکھتا ہے کہ ہمیں ڈر ہے کہیں اُس کے دھوکے میں ہم اپنے ہی معززین میں سے کسی کو نہ دھرلیں۔

ہمارے دور میں طوفانوں، بھونچالوں اور وباؤں سے کوئی خطرہ درپیش نہیں رہا۔ انسانی تدبر اور تربیت اس طرح کے قدرتی خطرات کے اسباب پر حاوی ہو چکے ہیں، آج انسان کو اپنے ایک ہی دشمن سے سارے خطرے لاحق ہیں، اُس کا تدبر جسے کام میں لاکے وہ کیا پتہ کب چشم زدن میں قیامت بپا کردے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری دنیا کی دو سب سے ہوشمند قومیں ایک دوسرے کے خوف سے پاگل ہیں اور اُن کے نمائندے کسی صلح جو مہم کے دوران جب گلے ملتے ہیں تو بیک وقت اپنی اپنی پیٹھ پر خنجر کی چبھن محسوس کر رہے ہوتے ہیں، حالانکہ وہ ایسے ایسے سائنسی کرتب کرجاتے ہیں کہ اپنی بڑی میٹھی مسکراہٹوں کے راستے ہی اپنا سارا زہر ایک دوسرے کے بدن میں اتارتے چلے جائیں۔ دونوں قوموں کا دعویٰ ہے کہ جب تک وہ ہر وقت جنگ کے لیے تیار رہیں گے، ان کے درمیان امن بنا رہے گا۔ اپنے اس دعوے کے جواز میں دونوں کے پاس اتنے مہلک ہتھیار جمع ہیں کہ وہ ایک ذرا بٹن دبا کر دو جہاں کو تہس نہس کرکے رکھ دیں، ہر دو نے اپنی حفاظت کے لیے ایسے غار بنا رکھے

ہیں کہ نیوکلیائی ہلاکت کے پرزوں کے حرکت میں آجانے سے جب سانپ اور بچھو تڑپتے ہوئے
اپنے بلوں سے باہر آجائیں تو یہ اُن کے مانند زمین دوز زندگی اختیار کرلیں اور جنگ کے
سائے چھٹ جانے کے بعد مزے سے رینگ رینگ کر جئیں۔

ان دو بڑی قوموں کی دیکھا دیکھی اقتصادی طور پر کمزور قومیں بھی اسی طرح اپنی ہوشمندی
کی تدبیروں میں ہمہ تن جٹی ہوئی ہیں۔ آپ اُن سے پوچھئے آپ کے پاس بیماروں کی طبی
امداد کا کیا انتظام ہے؟ —— وہ بڑے فخر سے جواب دیں گی، موجودہ سال میں ہماری
بری فوج میں سو فی صد، بحری میں دو سو فی صد اور فضائیہ میں ڈھائی سو فی صد اضافہ
ہوا ہے۔ تیسری دنیا کے تقریباً سبھی ممالک نے اپنی اولین ضروریات کی نشاندہی میں
اتنی مضحکہ خیز مستعدی سے کام لیا ہے گویا وہ مستعد تو ہوں مگر انھیں یاد ہی نہ رہا ہو
کہ وہ کیوں مستعد ہیں —— اپنی آزادی کے لیے! —— آزادی کیا ہوتی ہے؟ بھوک،
بیماری اور لاچاری کو گاڑھا کیے جانے کی آزادی؟ —— سیدھی سی بات ہے کہ کسی
ملک کو باہر سے خطرہ درپیش ہو یا اندر سے، اُس خطرے کے اسباب بہرصورت خارجی
ہوتے ہیں اور اُن کی مدافعت میں یکساں طور پر وہی جذبہ کارفرما ہونا چاہیئے جس کی تحریک
کسی خارجی حملے پر ہوتی ہے۔ اگر ہم اس مسئلے کا قریبی مطالعہ کریں تو اتنے لوگ کسی خارجی قوت
سے جنگ کرتے ہوئے کام نہیں آتے جتنے کسی باطنی بگاڑ سے۔ مجھے تو دنیا کے بیشتر لوگ
اسی لیے بڑی بے چینی سے ہاتھ پیر مارتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں کہ خارجی حوادث
سے دوچار ہونے کی بجائے بے چارے پیٹ کی گڑبڑ میں مبتلا ہوتے ہیں۔ مسئلہ تو گلاب
کی گولیوں سے حل ہونا ہے مگر وہ بدحواسی میں بندوق کی گولیاں کھانے یا کھلوانے کے
لیے اپنی سرحدوں کی جانب بے تحاشہ دوڑے جا رہے ہیں۔

ہوشمند لوگ اپنی خود پارسائی سے خوش ہو ہو کر اپنے آپ کو یقین دلاتے رہتے ہیں
کہ وہ بڑے گہرے غور و فکر کے عادی ہیں، حالانکہ قومی سیمیناروں پر ذرا سے بھی مشاہدے
سے آپ پر یہ بھید کھل جائے گا کہ اپنے غور و فکر کے پوز میں دراصل وہ کچھ بھی نہیں
سوچ رہے ہوتے، بس اپنے بولنے کی باری کا انتظار کر رہے ہوتے ہیں۔ چلیے یہ بھی برا نہیں

کم سے کم کچھ بھی نہ سوچنے سے وہ کسی کے نقصان کی تو نہیں سوچ رہے ہوتے۔ مگر پرابلم اتنا
سیدھا بھی نہیں۔ ہمارے عقلمندوں میں ایسے لوگ بھی بکثرت موجود ہیں جو اپنی بے جا طرفدار
سوچوں سے عام فہم معاملات کو اس لیے انتہائی پیچیدہ بنا دیتے ہیں کہ اِس سازگار کنفیوژن
میں من مانی کے لیے زمین ہموار کر سکیں۔ پچھلے دنوں مجھے چند دانشوروں کی ایک میٹنگ میں شریک
ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ چند سیدھے سادے امور تھے جن تک نیک نیتی سے پہنچنا درکار
ہوتا تو کسی دیہات کا چوپال بھی بہ آسانی پہنچ جاتا، مگر ان نامور دانشوروں نے اپنے مطلب
کے نتائج تک پہنچنے کی خاطر نہایت صناعی سے جھوٹ بول بول کر موٹی سی بات کو اس قدر
الجھا دیا کہ میں بڑی پریشانی سے سوچنے لگا، اس پرابلم کا تو کوئی حل ممکن ہی نہیں —'نہیں'
ممکن کیوں نہیں؟ ایک دانشور نے اپنی مدبرانہ مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے مجھے ٹوکا —
سنیئے! —— مگر اسی اثنا میں میٹنگ کے ایک اور رکن نے سر جھٹک کر اپنے
آپ کو دانشوروں کے طلسمانہ داؤ پیچ سے آزاد کیا اور بڑے سپاٹ لہجے میں سچ
بول دیا۔ اُس کا بیان سنتے ہی سبھی دانشور اُس پر کچھ اس طرح کھلکھلا کر ہنس پڑے کہ
اور لوگ تو درکنار، وہ رکن خود آپ بھی اپنے آپ کو کوئی مسخرہ سمجھنے لگا۔

اپنے جھوٹ بولنے اور سننے کی عادت کے باعث اچانک کبھی سچی بات سن کر ہمیں
یونہی لگتا ہے جیسے کوئی بڑا جھوٹ بولا گیا ہو، یا کسی مسخرے نے کوئی لطیفہ سنایا ہو، یا پھر
سچ بولنے والا واقعی پاگل ہوگیا ہو۔ خدا بے چارے کے بچوں پر ترس کھائے۔ باپ کے جیتے
جی یتیم ہو کر رہ گئے ہیں —— میری ایک اور واردات سنئے۔ کائیاں جیوتشیوں کی
باتوں میں آ کر ایک دفعہ میں نے نہ صرف سچ بولنے کا فیصلہ کر لیا بلکہ واقعی ہمیشہ سچ
بولنے لگا۔ نتیجہ؟ ایک ایک کر کے سب دوست اور رشتہ دار مجھ سے کنارہ کش ہو گئے
یہ تو ہوا مگر پھر یہ بھی ہونے لگا کہ مجھے اپنا آپ بھی کوئی غیر معلوم ہوتا، میں ایک نفسیاتی
ملبہ سا ہو کر رہ گیا اور اپنی باتیں اپنے آپ سے بھی چھپانے لگا۔ کیا معلوم، کب میں اپنا
بھانڈا بھی پھوڑ دوں؟ —— اب اس طرح کوئی کیونکر جی سکتا ہے کہ اپنے آپ
کو اپنے آپ سے بھی چھپاتا پھرے؟ بالآخر میں آپ ہی دوڑا دوڑا اپنے شہر کے پاگل خانے

میں آپہنچا اور میرے پیچھے پیچھے میری بیوی — مجھے بچاؤ! — بچاؤ! —

پاگل خانے کے مہتمم نے ہماری طرف مسکراتے ہوئے دیکھا اور مجھ سے پوچھا، کس سے؟

مجھ سے!

مہتمم میرا جواب غیر متوقع پاکر چڑ گیا، جاؤ بھائی، یہ پاگل خانہ ہے، کوئی سنیاس آشرم نہیں۔

سچ بولنے کے باعث مجھے پاگل خانے میں پناہ نہ ملی تو مجھے سچ بھی جھوٹ معلوم ہونے لگا اور یہی وہ مقام ہے جہاں آدمی پر حقائق منکشف ہونے لگتے ہیں، یعنی وہ حقائق کے غیر حقیقی پن سے متعارف ہونے لگتا ہے۔

ہوشمندوں کا المیہ شاید یہی ہے کہ اُن پر حقائق کا غیر حقیقی پن وا نہیں ہوتا، اور ہو بھی جائے تو وہ اس کی تاب نہ لاکر خودکشی کر لیتے ہیں یا پھر پاگل ہو جاتے ہیں، مگر اپنے پاگل پن میں جب اُن کو ظاہری غیر حقیقی پن کے درون خانوں میں پہنچنا ہوتا ہے تو وہ یہاں ابرِ رحمت میں نہا دھو کے، نئے نویلے ہو کر بھی باہر نکلتے ہیں اور کُل جہان کو ایک نیا درس دینے کی دُھن میں اتنے سرشار ہوتے ہیں کہ مقامی لوگ اُنھیں نہایت خطرناک پاگل سمجھ کر ان کے سامنے زہر کے پیالے رکھ دیتے ہیں جنھیں وہ مست فقیر میٹھا پانی سمجھ کر بے تامل ہاتھوں میں لے لیتے ہیں اور یوں اپنی پیاس بجھا کر ملکِ عدم کی جانب ہو لیتے ہیں۔ اماوس کی راتوں میں جب چاند بھی اپنی کسی خیانت کے خیال سے منہ چھپائے ہوتا ہے تو یہی غیر ہوش مند درویش آکاش کی دور تر تاریکیوں میں جھلملا رہے ہوتے ہیں کہ کائنات کا بسا بسا منظر اوجھل نہ ہو جائے۔ یہ جیالے عمر بھر اپنے وجود کی چار دیواری میں پھڑپھڑاتے رہتے ہیں اور زہر کے پیالے پی کر کائناتی ربط میں رچ بس جاتے ہیں تاکہ ہم ہوشمند لوگ انھیں اپنے سانسوں سے اندر اتار اتار کر وسیع تر ہوتے رہیں۔ وسیع تر ہو ہو کے پھیلنا سیکھ جائیں اور پھیلتا پھیلتا کے ان کی لامحدودیت میں شریک ہو جائیں۔

ہوشمندی کے کڑے پہروں میں گھرا آدمی اپنی مٹی اور نام کو بھی اپنی ذات پر محمول کرنے لگتا ہے اور اپنی فطری خُوؤں کو مصنوعی عادتوں میں گھلاتے ہوئے نجی سودوزیاں

کا پابند ہو کر رہ جاتا ہے۔ مغرب نے تو اِس قسم کی ہوشمندی پر اصرار کر کے برتر زندگی کا موقع کھویا ہی تھا، ہم بھی ان کے تتبع میں اُن طبع زاد قدروں کا خون کرنے پر تُل گئے جن کی بدولت ذات کا کائنات پر پھیلتے چلے جانا اور کائنات کا ذات میں سمٹ آنا بعید از قیاس نہ تھا۔

ہماری نئی تربیت نے ہمیں اپنے پیروں پر کھڑا تو کر دیا ہے مگر اس ایستادگی میں کچھ یوں جکڑ دیا ہے کہ اک ذرا جھک کر سہارا لینا نہیں ہو پاتا۔ بس کھڑے کھڑے سوؤ اور سوتے میں بھی چوکس رہو، ورنہ کوئی گلا کاٹ جائے گا — خبردار! — ہوشیار! — ہم بڑے ہوشیار ہو گئے ہیں۔ آنکھیں ترس جاتی ہیں کہ کوئی تو ایسا ملے جو اتنا ہوشیار، اتنا عیار نہ ہو، ہم اُس پر ایک دم بھروسہ کر لیں اور اُسے بے تحفظ، بے خوف اور بے تامل گلے لگا لیں اور ہمارے پھٹتے ہوئے سینوں میں قرار آ جائے۔ ارے، کوئی تو احمق ہو، کوئی دیوانہ، کوئی محبت کرنے والا۔ مُفت میں کون محبت کرے گا بابا؟ پہلے دام نکالو۔

ہماری بے مکانی دیکھتے جاؤ

مجتبیٰ حسین

پرسوں میں نے کرایہ کے مکانوں میں رہنے کی سنچری اور اپنی زندگی کی نصف سنچری ایک ساتھ مکمل کرلی تو سوچا کہ کیوں نہ اس مبارک و مسعود موقع کو سیلیبریٹ کیا جائے۔ یہ اعزاز کسے ملتا ہے کہ سواں مکان شروع اور زندگی کا پچاسواں سال ختم ہو۔ یہ حسن اتفاق نہیں، عشق اتفاق ہے۔ میں خوش خوش گھر پہنچا تو بیوی کو افسردہ و رنجیدہ پایا۔ میں نے کہا: "بہت اداس دکھائی دیتی ہو۔ کیا نیا مکان تمہیں پسند نہیں آیا؟"

بولی: "تمہاری رفاقت میں آج تک میں نے ان گنت مکان بدلے کبھی کسی مکان کے بارے میں شکایت کی؟"

میں نے کہا: "سچ تو یہ ہے کہ مجھے تم سے ہی یہ شکایت ہے کہ اتنے مکان بدلنے کے باوجود تم نے میرا ساتھ اور ہاتھ نہیں چھوڑا۔"

بولی: "اگر میں مکانوں کے بدلنے میں ہنسی خوشی تمہارا ساتھ نہ دیتی تو تم مکان بدلنے کی بجائے بیویاں بدلتے اور اس کوشش میں ایک نہ ایک دن کہیں گھر داماد لگ جاتے۔"

میں نے کہا: "بات کیا ہے؟ تم نہ صرف اداس نظر آتی ہو بلکہ لڑائی کے موڈ میں ہو۔"

بولی: "ایک بُری خبر ہے، خدا کرے کہ جھوٹی ہو۔ ابھی تمہارے بھتیجے نے آکر یہ اطلاع دی ہے کہ پچیس سال پہلے تم جس ہاؤسنگ سوسائٹی کے ممبر بنے تھے۔ اس نے بالآخر مکان بنالیے ہیں اور یہ کہ تمہیں اب اپنا مکان ملنے ہی والا ہے۔"

اس اطلاع کو سن کر میں بے ہوش ہوتے ہوتے بچا۔ پیروں تلے سے مکان سمیت زمین نکلنے لگی۔ میں نے سوچا، ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا۔ یہ سب جھوٹ ہے۔ میں اور اپنا ذاتی مکان! زندگی کے پچاس برس بیت چکے ہیں، اب میں اپنا مکان لے کر کیا کروں گا۔ یہ تو وہی بات ہوئی کہ ستر برس کے ایک بزرگ نے ایک موسیقار سے پوچھا۔

"میاں طنبورے اور تانپورے میں کیا فرق ہوتا ہے؟" موسیقار نے جواباً دریافت کیا!

"بزرگوار! اب آپ کی عمر کیا ہے؟"

بزرگ بولے: "ستر برس کا ہوچکا ہوں۔" موسیقار نے کہا: "قبلہ جب آپ نے اپنی زندگی کے ستر برس طنبورے اور تانپورے کا فرق جانے بغیر گذار دیئے تو دو چار برس اور صبر کیجیے، اس کے بعد آپ کو ان دونوں کا فرق جاننے کی ضرورت ہی پیش نہ آئے گی۔" میرا بھی اب یہی حال ہے چند برس اور اس دنیا میں گذار لوں تو مجھے کرایہ کے مکان اور ذاتی مکان کے فرق کو جاننے کی ضرورت ہی پیش نہ آئے گی۔

میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ بیوی نے کہا: "کس سوچ میں پڑ گئے، بتاؤ اب کیا ہوگا؟"

میں نے بیوی پر قابو پانے کی خاطر اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے کہا: "ہونا کیا ہے اگر ذاتی مکان ملتا ہے تو اس میں چلے جاتے ہیں۔ لوگ تو ذاتی مکان کے لیے ترستے ہیں۔ یہ اداس ہونے کی نہیں خوشی کی بات ہے۔"

بولی: "مگر میرے لیے یہ خوشی کی بات نہیں ہے۔ کرایہ کے مکان میں ازدواجی زندگی کا جو لطف ہے وہ ذاتی مکان میں کہاں۔ میں نے تو تم سے شادی ہی اس لیے کی تھی کہ تمہارا اپنا کوئی ذاتی مکان نہیں ہے۔ کیونکہ میں جانتی ہوں کہ جس دن تمہیں اپنا مکان مل جائے گا۔

تم اپنی ساری توجہ مجھے بنانے سنوارنے کی بجائے مکان کو بنانے سجانے میں صرف کر دو گی میں اپنے اور تمہارے بیچ کسی مکان کو حائل ہوتے نہیں دیکھنا چاہتی۔ پھر ہماری خوشگوار ازدواجی زندگی کا راز یہی ہے کہ تمہارا زیادہ وقت مکانوں کے مالکوں سے لڑنے یا انہیں خوش کرنے میں گذرتا ہے مجھ سے لڑنے کی تمہیں مہلت ہی نہیں ملتی۔ جس دن مالک مکان ہم دونوں کے بیچ سے نکل جائے گا۔ ہم ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہو جائیں گے۔ یہ ایک ایسی جنگی حکمت عملی ہے جس کے باعث ہمارے گھر میں دائمی اور پائیدار امن قائم ہے۔ میں گھریلو اور عالمی امن کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دے سکتی ہوں چاہے مجھے ذاتی مکان سے ہاتھ ہی کیوں نہ دھونا پڑے۔"

زندگی میں پہلی بار میں اپنی بیوی کی فہم و فراست کا قائل ہو گیا۔ میں نے کہا: "میں تمہارے جذبات کی قدر کرتا ہوں۔ سچ تو یہ ہے کہ میں خود بھی اب کرایہ کے مکانوں میں رہنے کا عادی ہو چکا ہوں جس آدمی نے فی برس دو مکانوں کے حساب سے اپنی جائے رہائش تبدیل کی ہو۔ اس کی خانہ بدوشی کو کم از کم تمہیں تو تسلیم کر لینا چاہیے۔ اپنی تو ساری زندگی اس طرح گذری کہ ایک پاؤں ایک مکان میں اور دوسرا پاؤں دوسرے مکان میں۔ سچ تو یہ ہے کہ میں مکانوں کو بدلتے بدلتے مکاں سے لامکاں تک پھیل گیا ہوں۔ میں مکان میں ہوں بھی اور نہیں بھی۔ میں مکان کے اندر ہوں اور مکان میرے اندر ہے۔

کرائے کی مکانوں کی برکتوں سے جتنا میں واقف ہوں، شاید کوئی اور ہو، بلکہ آج میں جو کچھ ہوں وہ کرائے کے مکانوں میں رہنے کی وجہ سے ہوں تمہیں یاد ہوگا کہ شادی کے بعد ہم نے ایک مکان کرایہ پر لیا تھا۔ مالک مکان نے تین چار مہینوں تک ہمیں ہنی مون منانے کی اجازت دے دی۔ پانچویں مہینے سے اس نے کرایہ کی ادائیگی کا مطالبہ شروع کر دیا۔ میں اس سے منہ چھپاتا رہا ایک دن آمنا سامنا ہوا تو اس نے پوچھا: "آخر تم کرایہ کیوں ادا نہیں کرتے؟"

میں نے کہا: "اس لیے کہ بے روزگار ہوں۔ کہیں نوکری لگے تو کرایہ بھی ادا کروں۔"

تمہیں شاید نہیں معلوم کہ مالکِ مکان کئی دنوں تک میری ملازمت کی خاطر جوتیاں چٹخاتا پھرا۔ جگہ جگہ میری درخواستیں دیں۔ بالآخر اس نے مجھے نوکری سے لگا دیا۔ تنخواہ سے سارا کرایہ وصول کیا

اور اپنے گھر سے نکال باہر کیا۔ اس کے بعد میں نے ایک بڑا مکان کرائے پر لے لیا۔ میں نے سوچا کہ جب کرایہ ادا کرنا ہی نہیں ہے تو کیوں نہ بڑا مکان کرائے پر لیا جائے۔ یوں بھی کہنے کو میری نوکری لگ چکی تھی مگر جب میں اپنی قلیل تنخواہ میں سے مکان کا کرایہ پابندی سے ادا کرنے کے قابل نہیں رہنے لگا تو دوسرے مالکِ مکان نے اپنے اثر و رسوخ کو استعمال کر کے دفتر میں میری پروموشن کروا دی۔ یہ سب مکانوں کے مالکوں کی دین ہے۔ یہ ان ہی کا احسان ہے کہ آج میں خوشحال زندگی گذار رہا ہوں۔"

بیوی نے بات کو کاٹ کر کہا۔ "تمہیں یاد ہو گا۔ ایک مالک مکان کو یہ شکایت تھی کہ لکڑی کے چولہے پر پکوان کرنے کی وجہ سے اس کا رسوئی گھر خراب ہو رہا تھا۔ آخر کو اسی نے تنگ آ کر اور ہم پر ترس کھا کر گیس کے چولہے کا کنکشن دلوا دیا تھا۔ اگر ہمارا ذاتی مکان ہوتا تو ہمارے پاس گیس کا کنکشن کہاں سے آتا؟"

میں نے کہا: "بیگم تم خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہو۔ صبر کرو۔ مجھے یقین ہے کہ ہمیں اپنا ذاتی مکان ملنے کی اطلاع جھوٹی ہے۔ ہاؤسنگ سوسائٹی پر پورا بھروسہ رکھو کیونکہ یہاں نہ صرف دیر ہوتی ہے بلکہ اندھیر بھی ہوتی ہے۔"

وہ میرے لیے چائے بنانے کی خاطر چلی گئی تو میں پھر سے سوچ میں ڈوب گیا۔ اب اگر واقعی ہمیں ذاتی مکان مل گیا تو کیا ہو گا۔ مجھے رہ رہ کر وہ سارے مکان یاد آنے لگے جن میں اپنا سر چھپانے کے علاوہ بہت کچھ چھپایا تھا۔ جیسے اپنی غربت، عزت، شرافت وغیرہ وغیرہ اور وہ سارے مکان مالک بھی یاد آنے لگے جن پر اپنا سب کچھ ظاہر کر دیا تھا۔ جیسے اپنی غربت، بے روزگاری، مفلوک الحالی اور آوارہ گردی وغیرہ وغیرہ۔ جس بات کا علم مکان کو نہیں ہوتا تھا اسے مالک مکان جان لیتا تھا اور اسی بنیاد پر ہم نے یہ مفروضہ بنا رکھا تھا کہ کرائے کا مکان چاہے کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو وہ اپنے مالک سے بڑا ہوتا ہے۔ ہم تو صرف مکان کی مکانیت کا کرایہ ادا کرتے تھے۔ اس کے ظرف کا کرایہ کہاں ادا کرتے تھے۔ کن کن باتوں کو یاد کریں۔ برسات کے موسم میں جب ایک مکان کی چھت غالب کے مکان کی چھت سے بھی زیادہ ٹپکنے لگی تو میں ایک اور مکان کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ ایک محلے میں نواڑی سے پوچھا۔ "کیوں بھئی! کیا تمہارے

علاقے میں کوئی مکان خالی ہے؟"

پنواڑی نے کہا: "حضور ایک مکان خالی تھا۔ مگر آپ نے یہاں آنے میں ذرا دیر کردی۔"

میں نے پوچھا: "تو کیا وہ مکان کرایہ پر اٹھ گیا؟"

وہ بولا "جی نہیں! شاید بارش کے زور سے ابھی ابھی گرا ہے۔ آپ کچھ دیر پہلے آجاتے تو مکان آپ ہی کا تھا۔"

اور یوں کھلے ہوئے غنچوں کو مرجھانے کا ایک اور موقع ہاتھ سے نکل گیا۔ گھر واپس ہوا تو بیوی نے پوچھا: "کوئی مکان ملا؟" میں نے کہا: "مکان تو نہیں ملا۔ البتہ ایک دوست کے ہاں دو پرانے واٹر پروف مل گئے۔ وہ اُن کا کرایہ بھی نہیں لے گا۔ ایک تم پہنو، دوسرا میں پہنتا ہوں، پھر دیکھو ساون کا مزہ کیسے آتا ہے۔"

ہمارا ایک مکان پڑوسیوں کے مکانوں اور ان کے مکینوں میں کچھ اتنا دخیل تھا اور وہاں فرد کی انفرادیت کچھ اتنی غیر محفوظ تھی کہ نماز پڑھنے کے بعد سلام پھیرنے سے پہلے یہ اعلان کرنا پڑتا تھا کہ "صاحبو! ہم سلام پھیر رہے ہیں، اپنی بیبیوں سے پردہ کرالو۔" بعض اوقات تو ہمیں دایاں سلام پھیرنے کے بعد بایاں سلام پھیرنے میں دس منٹ لگ جاتے تھے کیونکہ اس وقت پڑوسن کی بیٹی کی چوٹی گوندھی جارہی ہوتی تھی۔

ہمارا ایک مکان چوتھی منزل پر تھا۔ پہلی منزل میں مالکِ مکان سردار بہابیر سنگھ رہتے تھے اور دوسری منزل میں پرمود کمار چٹرجی اور تیسری منزل میں مسٹر تھامس رہتے تھے۔ چوتھی منزل ہماری تھی۔ مکان کیا تھا اچھا خاصا ملک تھا۔ اس مکان میں ہم خوش بھی بہت تھے بس ایک شکایت یہ تھی کہ مہینے میں چار پانچ تہوار مشترکہ طور پر منانے پڑتے تھے بلکہ تہواروں کے سوا اس گھر میں کچھ بھی نہیں منایا۔ تہوار تو ہمیں اچھے لگتے تھے لیکن ہماری جیب ان تہواروں کا بوجھ اٹھا نہیں سکتی تھی۔ قومی یکجہتی کو فروغ دینے کے لیے جتنی خوش حالی درکار ہوتی ہے، وہ ہمارے پاس نہیں تھی۔ اسی لیے وہاں سے بادلِ ناخواستہ نکل آئے۔

مکان یاد آنے لگے تو مکان کے مالک بھی یاد آتے چلے گئے۔ ایک مالک مکان اتفاق سے ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو ہمارے گھر کے سامنے سے گذرتے تھے۔ نہ صرف اتفاق سے گذرتے تھے بلکہ اتفاق سے کال بیل

بھی بجادیتے تھے۔ میں اتفاق سے گھر پر ہوتا تو کہتے "بھئی اتفاق سے ادھر سے گذر رہا تھا، سوچا آپ سے مل لوں۔ یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ آج پہلی تاریخ ہے۔" ایک مہینے میں اکتیس تاریخ کو اتفاق سے ان کے گھر پہنچا۔ مجھے دیکھ کر بہت سٹپٹا گئے۔ بولے "آج آپ کے اتفاق سے ادھر چلے آنے سے کچھ نااتفاقی کی بو آرہی ہے۔"

میں نے کہا: "اتفاق سے مجھے اس مہینے تنخواہ نہیں مل رہی ہے۔ اتفاق سے ادھر سے گذر رہا تھا: سوچا آپ کو آگاہ کردوں کہ آپ کل اتفاق سے میرے گھر نہ آئیں۔" اور یہ بھی ایک اتفاق ہے کہ چند دنوں بعد مجھے اس گھر کو خالی کرنا پڑا۔

ایک اور مالکِ مکان بھی بہت یاد آئے۔ خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ پہلی تاریخ کو مکان کا کرایہ تو وصول نہیں کرتے تھے۔ البتہ آدھی رات کو اپنا بے بحر شعر سنا کر داد ضرور وصول کرلیا کرتے تھے۔ میں نے مہینوں نہیں مکان کا کرایہ ادا نہیں کیا۔ البتہ شعر کی داد کے معاملے میں وہ ادھار کے قائل نہیں تھے کھڑے کھڑے داد وصول کرلیتے تھے۔ بلکہ مستقبل میں سرزد ہونے والے شعروں کی پیشگی داد تک پگڑی سمیت وصول کرلیتے تھے۔ مکان چونکہ ان کا چھوٹا تھا۔ اس لیے چھوٹی بحر میں شعر کہتے تھے۔ شاعری بھی اپنے مکان کی طرح کرتے تھے۔ جس میں کمرے کم اور بیت الخلاء زیادہ ہوتے تھے۔ بات بات پر شاعری میں اپنا کلیجہ، پھیپھڑا وغیرہ نکال کر رکھ دیتے تھے۔ میں تو زندگی بھر ان کے مکان کو خالی نہ کرتا مگر قدرت کو اُردو شاعری کا فائدہ اور میرا نقصان مقصود تھا۔ ایک دن وہ اللہ کو پیارے ہوگئے۔ یہ ان کے مرنے کے دن نہیں تھے جوں جوں مکان کا کرایہ بڑھتا جارہا تھا۔ ان کی شاعری میں مجھے نئے نئے گوشے بشمول گوشۂ عافیت کے نظر آنے لگے تھے اور میں ان کی شاعری میں امکانات اور مکانات دونوں کو ڈھونڈنے لگا تھا۔

جب مکانوں اور مکان مالکوں کی یاد نے زور مارا تو میں نے سوچا کہ یادوں کی اس دہلیز کو پھلانگ کر میں اپنے ذاتی مکان کی دہلیز پر کیوں کر قدم رکھوں گا۔ اسی اثنا میں میری بیوی چائے لے کر آگئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ بولی "مجھے آج اپنا ساٹھواں مکان بہت یاد آرہا ہے۔ ہادی وہیں پیدا ہوا تھا اور انہترواں مکان بھی، کیوں کہ تخیہ وہیں پیدا ہوئی تھی۔"

میں نے اسے روکتے ہوئے رندھی رندھی آواز میں کہا: "بیگم! اب کچھ یاد نہ دلاؤ۔ یادوں کا ایک ایسا ٹھاٹھیں مارتا سمندر میرے اندر موجزن ہے کہ اگر ہمارا ذاتی مکان بھی اس کی زد میں آجائے تو اس کے بام و در پاش پاش ہو جائیں گے۔ اس کی اینٹ سے اینٹ اگر خود سے نہ بجی تو بجادی جائے گی۔"

میں یہ کہہ ہی رہا تھا کہ میرا بھتیجا بھاگا بھاگا آیا۔ اس نے کہا: "انکل معاف کیجئے۔ میں ایک بری خبر لے کر آیا ہوں۔"

میں نے کہا: "مجھے اس بری خبر کی اطلاع مل چکی ہے۔"

بھتیجے نے کہا: "نہیں! وہ تو خوش خبری تھی۔ آپ کے ذاتی مکان کے ملنے کی۔"

میں نے پوچھا: "تو پھر بری خبر کیا ہے؟"

بھتیجے نے کہا: "مجھے ابھی ابھی اطلاع ملی ہے کہ ہاؤسنگ سوسائٹی نے جس بلاک میں آپ کا فلیٹ تعمیر کیا تھا۔ وہ سارا بلاک ملاوٹی سمنٹ کے استعمال کے باعث گر گیا ہے۔ اب کیا ہوگا؟"

اس بری اطلاع کو سن کر ہم دونوں کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ ہم خوشی کے مارے ہنسنے لگے تو میرے بھتیجے نے کہا۔

"انکل آپ کی طبیعت خراب معلوم ہوتی ہے۔ کسی ڈاکٹر کو بلاؤں؟" میں نے کہا "ڈاکٹر کو نہیں وقت کو بلاؤ، وقت ہی سب سے بڑا ڈاکٹر ہے جب تم بھی پچاس برس کے ہو جاؤ گے اور کرایے کے سو دیں مکان میں جاؤ گے تو تمہیں بھی اچانک یہ عرفان ہوگا کہ 'بے مکانی' مکان سے بہتر ہوتی ہے۔"

قصہ داڑھ کے درد کا

مجتبیٰ حسین

اور ایک دن اچانک ہماری داڑھ میں یوں درد شروع ہو گیا جیسے آسمان پر یکایک قوس قزح نکل آتی ہے اور قوس قزح کا نکل آنا تھا کہ ساتوں طبق روشن ہو گئے۔ یوں تو ہم انواع و اقسام کے "دردوں" سے گزر چکے تھے۔ پیٹ کا درد، سر کا درد، کمر کا درد، دل کا درد، قوم کا درد اور اولاد کے درد سے کر خواجہ میر درد تک ہم سبھی دردوں سے آشنا تھے، لیکن داڑھ کا درد ہمارے لیے بالکل نیا تھا۔ اردو شاعری میں جگہ جگہ ایسے مصرعے پڑھتے آئے تھے کہ

ع آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

یا

ع درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

لیکن ہمیں ان مصرعوں کی صداقت پر کبھی یقین نہیں آیا تھا۔ کیوں کہ ہم نے آج تک کبھی درد کو حد سے گزرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ مگر صاحب داڑھ کا درد ہی ہمیں وہ واحد درد نظر آیا جو حد سے گزر جانے کی بڑی زبردست صلاحیت رکھتا ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر سیدھے جبڑے

کی داڑھ میں درد ہو رہا ہو تو وہ صرف داڑھ تک محدود نہیں رہے گا بلکہ حد سے گزر کر آپ کے گال کو آپ کے جبڑے سے کم از کم پانچ چھ انچ دور کر دے گا اور جبڑے اور داڑھ کے درمیان ایک غیر جانبدار علاقہ پیدا کر دے گا۔ آپ کو یوں محسوس ہو گا جیسے آپ کا گال آپ کے جسم سے کافی فاصلے پر واقع ہے۔ آپ سڑک پر چلنے لگیں تو یوں محسوس ہو گا جیسے آپ کا گال آپ سے آگے چل رہا ہو اور آپ صرف اسے پکڑنے کے لیے بھاگے جا رہے ہوں کبھی کبھی تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے جو گال آپ کے ساتھ ساتھ چل رہا ہے وہ آپ کا نہیں کسی اور کا ہے۔ جبڑے اور گال کے درمیان یہ جو ہجر کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے وہ بڑی کربناک ہوتی ہے اور یہی داڑھ کے درد کا نصب العین بھی ہوتا ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو داڑھ کے درد میں مزہ ہی کیا باقی رہ جائے۔

جب داڑھ کا درد اپنی حدوں کو پھلانگ کر کائنات کی وسعتوں میں پھیلنے کی کوشش کرنے لگتا ہے تو آدمی اس درد کی وسعت کے آگے ایک ادنیٰ سا ذرہ معلوم ہونے لگتا ہے۔ جب پہلے پہل ہمارے سیدھے جبڑے والی داڑھ کا درد حد سے سوا ہو گیا اور ہم سیدھی جانب زیادہ جھکاؤ محسوس کرنے لگے تو اس عدم توازن کے احساس نے ہم میں بڑی بے چینی پیدا کر دی۔ آئینہ میں صورت دیکھی تو پتہ چلا کہ آئینہ میں ہماری جگہ ایک بھوت کھڑا ہے۔ ہم گھبرا کر فوراً دانتوں کے ایک ڈاکٹر کے پاس بھاگے۔ وہ ہمیں پہلے سے جانتے تھے لیکن داڑھ کے درد کے ساتھ انھوں نے ہمیں پہچاننے سے انکار کر دیا۔ ہم نے اس بات کی شکایت کی تو بولے "بھائی صاحب! داڑھ کے درد کے بعد آدمی کی پہچان بڑی مشکل ہو جاتی ہے۔ مجھے تو اپنے سارے ہی مریض ہم شکل نظر آتے ہیں۔ کس کس کو کہاں تک پہچانوں؟ یوں بھی آپ کے سامنے اگر بہت ساری ڈبل روٹیاں ایک ساتھ رکھ دی جائیں تو آپ ان ڈبل روٹیوں کو کیسے پہچانیں گے کہ یہ ڈبل روٹی زید ہے اور وہ ڈبل روٹی بکر ہے۔ داڑھ کے درد کی خوبی یہی ہوتی ہے کہ آدمی کے چہرے کو دیکھئے تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے آدمی کا چہرہ ڈبل روٹی بنانے کی مشین میں سے ڈھل کر نکلا ہے۔"

ڈاکٹر صاحب کی اس طویل اور دلچسپ گفتگو کے بعد جب ہم نے اپنی آمد کی غرض و غایت بتانی چاہی تو وہ بولے: "غرض و غایت بتلانے کی ضرورت نہیں ہے کیوں کہ آپ کا گال خود اس

غرض و غایت کی غمازی کر رہا ہے۔" یہ کہہ کر انھوں نے ہمارا منہ کھولنا چاہا تو یوں لگا جیسے منہ پر تالا لگ گیا ہے۔ بڑی مشکل سے انھوں نے ایک ایسا زاویہ بنایا کہ ہماری داڑھ انہیں نظر آ گئی جو ہمارے سارے وجود کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھی ڈاکٹر صاحب نے ہمارا منہ غڑاپ سے بند کرتے ہوئے کہا "اس وقت تو میں اس داڑھ کو نہیں نکال سکتا۔ چند روز اور اس داڑھ کے ساتھ نباہ کیجیے۔"

ہم نے کہا "ڈاکٹر صاحب! مجھے اس داڑھ کے ساتھ نباہ کرنے میں کوئی عذر نہیں ہے۔ لیکن یہ جو میری گردن پر ڈیڑھ چہرہ ابھر آیا ہے کم از کم اسے تو ٹھیک کر دیجیے۔ یہ عدم توازن مجھ سے اور بالخصوص میری بیوی سے بالکل نہ دیکھا جائے گا۔"

وہ بولے "بھیا! ڈیڑھ چہرے میں توازن کا تناسب پیدا کرنے کا ایک ہی علاج ہے۔"

ہم نے پوچھا "وہ کیا؟"

بولے "کسی طرح آپ کے بائیں جبڑے والی داڑھ میں بھی درد کو داخل کرنا ہو گا۔ پھر یہ درد بھی پھیل کر آپ کے بائیں جبڑے کی حدوں کو پھلانگتا ہوا کائنات کی وسعتوں میں پھیل جائے گا اور اس کے بعد آپ کے دونوں جبڑے۔ جیومیٹری کے اصولوں کے مطابق مساوی ہو جائیں گے کہیے تو آپ کے بائیں جبڑے کی داڑھ میں درد کا افتتاح فرما دوں؟"

ہم نے کہا "ڈاکٹر صاحب چاہے کتنی ہی تکلیف کیوں نہ ہو میں چاہتا ہوں کہ آپ میری داڑھ کو نکال پھینکیں۔ میں یوں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر ذلت کی موت مرنا نہیں چاہتا۔ ٹیپو سلطان نے کیا خوب کہا تھا کہ شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سال کی زندگی سے بہتر ہوتی ہے۔"

ڈاکٹر صاحب بولے "قبلہ! خبردار! آپ کی داڑھ کا درد اب فلسفہ بکنے لگا ہے۔ یہ بڑا خطرناک اسٹیج ہے اپنے آپ پر قابو پایئے ورنہ تاریخ میں ٹیپو سلطان کا تو کچھ بھی نہیں بگڑے گا لیکن آپ کا رہا سہا جغرافیہ بھی برباد ہو جائے گا۔ پھر یہ بھی سوچئے کہ اگر میں ہر مریض کی داڑھ فوراً نکال دیا کروں تو میرا کاروبار کیسے چلے گا۔ ایک داڑھ پر مجھے کم از کم سو روپے تو ملنے ہی چاہئیں۔ آپ اپنی داڑھ کا پہلے سو روپے کی حد تک علاج کروالیے، اس کے بعد میں بلا چوں و چرا آپ کی داڑھ نکال دوں گا۔" یہ باتیں کہتے ہوئے اچانک ڈاکٹر صاحب کی مصنوعی بتیسی ان کے منہ سے باہر نکل آئی اور وہ اپنے پوپلے منہ سے بولے: "اب آپ میری فیس مشورہ دیجیے۔ اور چلتے بنیے۔"

ہم نے کہا: "حضور! آپ نے مشورہ ہی کون سا دیا ہے جو میں آپ کو اس کی فیس ادا کروں؟"

وہ بولے "میں نے تو تمہیں ایک زریں مشورہ دیا ہے کہ داڑھ کے درد کو فلسفے سے دور رکھو ورنہ آدمی باقی نہ رہوگے فلسفی ہو جاؤ گے"۔

ہم غصے کے مارے ڈاکٹر صاحب کے کلینک سے باہر نکل آئے چند قدم ہی چل پائے تھے کہ داڑھ مذکور میں اچانک بجلی سی کوند گئی۔ برق کی ایک رو تھی جو داڑھ سے نکل کر سارے بدن میں لہرا گئی ایک بجلی تھی جو آنکھوں کو چکا چوند کر گئی۔ یوں لگا جیسے ہماری داڑھ میں اچانک ایک ہرن نے کلیلیں بھرنا شروع کر دیا ہو، جیسے کسی نے ہماری داڑھ میں توپ داغ دی ہو یا ایک زریں چلتے چلتے ہماری داڑھ میں پٹری سے اتر گئی ہو۔ جیسے ہماری داڑھ میں اچانک فوجی انقلاب آیا ہو۔ کیفیات کا اتنا ہجوم تھا کہ ہمارے لیے یہ پتہ چلانا مشکل تھا کہ ہماری داڑھ میں کیا ہو رہا ہے اور کیا نہیں؟ یوں لگتا تھا جیسے ہم سراپا داڑھ بن گئے ہیں۔

ہم درد کے اس اچانک حملے سے سنبھلنے کے لیے ایک الکٹرک پول کا سہارا لے کر کھڑے ہو گئے اور ہماری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ یوں لگا جیسے ساری کائنات ایک بہت بڑی داڑھ ہے۔ داڑھ ہی کائنات ہے۔ داڑھ کے سوا اس دنیا میں کچھ بھی نہیں۔ ہر شے داڑھ سے شروع ہوتی ہے اور داڑھ پر ختم ہو جاتی ہے۔ عدم سے پہلے بھی داڑھ تھی اور ہستی سے پرے بھی داڑھ ہے! ازل داڑھ اور ابد داڑھ۔ یکلخت ہمیں یوں محسوس ہوا جیسے سورج ہمارے منھ میں آ گیا ہو، اور ہم اسے چبا چبا کر کھا رہے ہوں۔ جی چاہتا تھا کہ سورج کو چبا کر اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے جائیں پھر سورج کے ان ٹکڑوں کو لوگوں میں بانٹ دیں کہ بھئی اپنے اپنے گھروں میں اُجالا کرو۔ ہر شخص کا اپنا سورج الگ ہونا چاہیے۔ ہر شخص کی صبح الگ ہونی چاہیے۔ اتنی بڑی کائنات کو ایک سورج کے تابع کر دینا مناسب نہیں ہے۔ آؤ کہ ہم سب مل کر سورج کو تقسیم کریں اور اس کے ٹکڑوں کو اپنی اپنی جیبوں میں رکھ لیں تا کہ سند رہے اور وقت ضرورت کام آئے۔

داڑھ کے درد کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ یہ درد بالاقساط ہوتا ہے یعنی درد کی ایک لہر جاتی ہے اور دوسری آتی ہے۔ جب درد کی پہلی لہر جا چکی تو ہم پر یہ عظیم انکشاف ہوا کہ درد کی ہر لہر کے

ساتھ ہم میں "جدید شاعر" بننے کی زبردست صلاحیتیں پیدا ہو رہی ہیں۔ ایسے پیغمبرانہ انکشافات صرف داڑھ کے درد میں ہی ممکن ہیں اچانک ہم پر یہ راز کھلا کہ "جدید شاعری" اصل میں داڑھ کے درد کی شاعری ہے جس میں آدمی کا سارا کرب سمٹ آتا ہے اور وہ سورج کو چبا کر کھا جانے کی منزل میں پہنچ جاتا ہے۔ ہم اب تک حیران تھے کہ ہمارے اکثر جدید شاعر ایسے تکلیف دہ اور کرب انگیز خیالات کو آخر کس طرح اتنی آسانی اور روانی سے اپنی شاعری میں پیش کر دیتے ہیں۔ اب داڑھ کے درد سے سابقہ پڑا تو احساس ہوا کہ یہ تو بڑی آسان سی بات ہے۔ جدید شاعر بننا ہو تو پہلے اپنی داڑھ میں درد پیدا کیجیے اور دیکھیے کہ کس طرح۔

ع آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں

آپ یقین کریں کہ درد کی پہلی لہر کے ساتھ ہی ہم نے شاعر بن جانے کی ٹھان لی تھی اور سوچا تھا کہ دوسری لہر میں ڈوب کر ایک شاہکار نظم نکال لائیں گے لیکن درد کی پہلی لہر اور دوسری لہر کے درمیان جو وقفہ ہوتا ہے وہ آدمی کو پھر خیال کی رفعتوں سے پستیوں میں لے آتا ہے۔ ہم نے سوچا کہ جب ہمارے پاس کوئی تخلص ہی نہیں ہے تو پھر نظم کہنے سے کیا فائدہ۔

خیر صاحب، ہم اسی طرح درد کی لہروں سے گزرتے ہوئے اپنے گھر پہنچ گئے۔ نہ جانے کیا بات تھی کہ اس دن گھر کا نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ جو بچہ ہمیں دیکھتے ہی لپٹ جایا کرتا تھا وہ ہمیں دیکھ کر الٹے پاؤں بھاگ گیا۔ وہ بیوی جو ہمارے گھر میں قدم رکھتے ہی کوئی نہ کوئی مسئلہ ہمارے سامنے رکھ دیتی تھی وہ ہمیں دیکھ کر چپ چاپ رسوئی گھر میں چلی گئی۔ ہم گھر کی اس بدلی بدلی فضا کو بھانپ نہ سکے۔ جب بڑی دیر تک کسی نے ہمارا حال نہ پوچھا تو ہم نے غصے سے کہا۔ "آخر اس گھر میں سب کو سانپ کیوں سونگھ گیا ہے؟ آخر معاملہ کیا ہے؟"

ہمارے اس سوال کو سن کر بیوی نے کہا: "مجھے آپ سے ہمیشہ یہی شکایت رہی کہ دفتر میں اپنے عہدیدار کی گالیاں سن کر آتے ہیں اور غصہ ہم لوگوں پر نکالتے ہیں۔ میں تو آپ کے گھر میں داخل ہوتے ہی سمجھ گئی تھی کہ آج آپ کا موڈ اچھا نہیں ہے۔ جبھی تو آپ گال پھلائے اور منہ بسورے گھر میں داخل ہو رہے ہیں۔ اب کوئی آپ کا حال پوچھے تو کیسے؟ آپ تو ایسی حالت میں کاٹ کھانے کو دوڑتے ہیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ آج آپ کے عہدیدار نے کچھ زیادہ ہی ڈانٹ پلائی

ہے۔ ذرا دیکھئے تو آپ کا گال کتنا پھول گیا ہے۔ اتنی ڈانٹ تو آپ نے پہلے کبھی نہیں کھائی تھی۔"

ہم نے درد سے کراہتے ہوئے کہا: "اری نیک بخت، تجھے ہمیشہ الٹی حجت کرنے کی عادت پڑی ہوئی ہے۔ میں داڑھ کے درد کی وجہ سے مرا جا رہا ہوں اور تجھے اس میں میرے عہدہ دار کی ڈانٹ نظر آ رہی ہے۔"

ہمارے اس انکشاف کو سنتے ہی سارے افرادِ خاندان کی باچھیں کھل اٹھیں۔ بچے دوڑ کر ہم سے لپٹ گئے اور بولے "اگر سچ مچ آپ کی داڑھ میں درد ہے تو ہمیں اس بات کی بڑی خوشی ہے ورنہ ہم تو یہ سمجھتے تھے کہ آج بھی آپ دفتر سے ڈانٹ سن کر آئے ہیں اور اب تھوڑی ہی دیر میں ہماری پٹائی ہونے والی ہے۔"

داڑھ کے درد کے بعد آدمی خواہ مخواہ ہی مغرور نظر آنے لگتا ہے۔ بیدھے جبڑے والی داڑھ کے درد کے زمانے میں ہی ہمارے آدھے دوست صرف اس لیے ہم سے کنارہ کش ہو گئے تھے کہ ہم صورتاً انہیں مغرور نظر آنے لگے تھے۔ جگہ جگہ ہمارے غرور کے چرچے ہونے لگے تھے کہ صاحب ادھر جب سے دفتر میں اسے ترقی ملی ہے بس ہمیشہ منھ پھلائے رہتا ہے کسی سے سیدھے منھ بات نہیں کرتا بلکہ یوں کہئے کہ شیل گرام کی زبان میں بات کرتا ہے۔ بیدھے جبڑے میں اتنا غرور آگیا ہے کہ یہ ہمیشہ دو تین انچ پھولا رہتا ہے۔

اب محض اتفاق تھا کہ ہماری ترقی اور داڑھ کا درد دونوں ایک ساتھ شروع ہوئے تھے ورنہ کہاں غرور اور کہاں ہم! بعد میں جب بائیں جبڑے والی داڑھ میں بھی درد شروع ہو گیا تو ہمارے بقیہ آدھے دوستوں نے بھی ہم سے کنارہ کشی اختیار کرلی۔ نہ داڑھیں رہیں اور نہ ہی دوست اب کسے کسے سمجھاتے پھریں کہ بھائی صاحب سارا قصور داڑھ کے درد کا ہے ہم تو ازل سے معصوم آدمی ٹھہرے۔ زندگی میں ایک ہی بار ہم نے غرور کا مظاہرہ کیا تھا جب ہم اپنی شادی کے موقع پر گھوڑی پر سوار ہو کر اپنی سابقہ دلہن یعنی موجودہ بیوی کے گھر گئے تھے اور اس غرور کا جو نتیجہ برآمد ہوا ہے وہ ہمارے چھ بچوں کی صورت میں دنیا پر ظاہر ہے۔ اس غرور کا کفر اس طرح ٹوٹا ہے کہ ہمیں خود غرور کے معنی معلوم کرنے کے لیے "ڈکشنری" دیکھنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ مگر کیا کریں کہ اس داڑھ کے درد کی وجہ سے ہم دنیا والوں میں ایک مغرور آدمی کی حیثیت سے

کافی شہرت رکھتے ہیں۔

ہمارے ساتھ ایک اور ستم بھی ہوا تھا یعنی نہ صرف ہم داڑھ کے درد میں مبتلا تھے بلکہ قدرت نے ہمارے عہدہ دار کو بھی اسی نعمت غیر مترقبہ سے نوازا تھا۔ اور آپ تو جانتے ہیں کہ داڑھ کا درد رکھنے والے دو اشخاص کسی بات پر متفق نہیں ہوتے کیونکہ داڑھ کے درد کے بعد آدمی "داخلیت پسندی" کا شکار ہو جاتا ہے۔ اور اپنی ذات کی تنہائی میں بند ہو کر اپنی بساط کے مطابق داڑھ کے درد کو قبول کرتا ہے۔ نتیجہ میں "ترسیل کا المیہ" پیدا ہو جاتا ہے۔ اکثر یوں ہوتا ہے کہ ہم کوئی تجویز لکھ کر اس کے پاس بھیج دیتے اور وہ اسے مسترد کر دیتا۔ وہ کوئی آرڈر لکھ کر ہمارے پاس بھیجتے اور ہم اس میں نئی پیچیدگیاں پیدا کر دیتے۔ "ترسیل کا المیہ" اس نوبت کو پہنچ گیا تھا، جہاں ہم دونوں میں دفتری آداب کے خلاف "تو تو میں میں" کا آغاز ہو گیا تھا۔ یہ غلط فہمی اور بھی بڑھتی مگر ایک دن جو ہم عہدہ دار کے کمرے میں اچانک چلے گئے تو دیکھا کہ وہ اپنا گال پکڑے بیٹھا ہے۔ ہم نے پوچھا۔ "کیا آپ کی داڑھ میں کچھ ہو رہا ہے؟"

وہ بولا: "ہاں بہت درد ہے۔"

اس پر ہم نے اپنا گال پکڑتے ہوئے کہا: "ادھر بھی وہی حال ہے۔"

تب ہم نے اسے سمجھایا کہ اصل میں ہم دونوں کے اختلافات کی اصل وجہ ہم دونوں کی داڑھیں ہیں۔ ہم دونوں کی داڑھوں میں جب ایک ساتھ درد ہوتا ہے تو اس کا لازمی انجام اختلاف رائے کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ یہ آسان بات ہمارے عہدے دار کی سمجھ میں آگئی۔ یوں بھی اس وقت تک اس کی عقل داڑھ گرنے کی منزل میں پہنچ گئی تھی۔

بعد میں ہم دونوں نے متفقہ طور پر ایک معاہدہ کیا۔ جب ہم کسی فائل میں کوئی تجویز پیش کرتے تو اس تجویز کے نیچے دستخط کرنے کے بعد چھوٹے حروف میں "داڑھ کا درد" بھی لکھ دیتے۔ وہ فائل دیکھ کر سمجھ جاتا کہ یہ تجویز داڑھ کے درد کے دوران میں لکھی گئی ہے۔ اگر وہ اس تجویز کو مسترد کرتا تو وہ بھی دستخط کرنے کے بعد نیچے چھوٹے حروف میں "داڑھ کا درد" لکھ دیتا۔ کچھ دن بعد اس نے یہ طریقہ بھی بنایا تھا کہ جب بھی کوئی فائل اس کے سامنے پیش ہوتی تو وہ اس پر لکھ دیتا۔ داڑھ کے درد کے بعد پیش کی جائے۔ اس طرح دفتر میں دو اقسام کی فائلیں بن گئی تھیں۔

یعنی داڑھ کے درد سے پہلے کی فائلیں اور داڑھ کے درد کے بعد کی فائلیں۔

فائلوں کی بات تو چھوڑیے، ہم نے اپنی پوری زندگی کو اسی طرح دو حصّوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ ”ایک زندگی وہ جو داڑھ کے درد سے پہلے تھی اور دوسری زندگی وہ جو داڑھ کے درد کے بعد پیدا ہوئی ہے“۔ اب تو ہماری ساری داڑھیں اکھڑ چکی ہیں گویا ہم بھی اب دانتوں کے ڈاکٹر بن گئے ہیں۔ بلکہ یوں کہیے کہ اب تو ہماری مصنوعی بتیسی کے دانتوں کے اکھڑنے کی بھی باری آگئی ہے۔ مصنوعی بتیسی کے دانت نہ ٹوٹیں گے تو اور کیا ہوگا۔ کیونکہ جب ہم اپنی مصنوعی بتیسی نکال کر سو جاتے ہیں تو بچے اس بتیسی کو کھلونے کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔

گھنٹوں یہ اپنے ڈیڈی کے دانتوں سے کھیلتے رہتے ہیں۔ ہم پولی شکایت کرتے ہیں تو بیوی کہتی ہے ”ایسی بھی کیا جلدی ہے، کھانا تو دس بجے کھاتے ہو۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ اگر بچے آپ کی مصنوعی بتیسی سے کھیل لیتے ہیں تو ایسی کونسی آفت آجاتی ہے۔ کبھی تمہیں اتنی توفیق تو نہیں ہوتی کہ بچوں کے لیے کھلونے ہی لے آؤ۔ اب بچوں نے تمہاری بتیسی میں سے اپنے لیے ایک کھلونا ایجاد کر لیا ہے تو اس میں ناراض ہونے کی کیا بات ہے۔ یوں بھی تم گھر میں ہمیشہ منھ پھلائے رہتے ہو۔ حسرت رہ گئی کہ بچے تمہارے ہونٹوں پر ایسی مسکراہٹ دیکھیں جو دانتوں کا دیدار کرا دے۔ اب اگر بچے تمہاری مسکراہٹ کے بغیر دانت دیکھ کر خوش ہو لیتے ہیں تو انہیں خوش ہو لینے دو کہ یہ ایک تبسم بھی کسے ملتا ہے“۔

اور ادھر جب سے ہمارے بچپن کے دوست مانگے رام جی ہمارے پڑوسی بن کر آئے ہیں، ہماری مصنوعی بتیسی بےگھر ہوگئی ہے۔ مانگے رام جی کو جب بھی کچھ کھانے کی ضرورت پیش آتی ہے تو پکار کر کہتے ہیں ”بھیا تمہاری بتیسی اگر خالی ہو تو تھوڑی دیر کے لیے بھیج دینا، میں مونگ پھلی کھا کر اور سماج کے خلاف ذرا دانت پیس کر تمہاری بتیسی واپس کر دوں گا“۔ مانگے رام جی ہمارے ہم پیالہ و ہم نوالہ تو تھے ہی ہم دانت بھی ہو گئے ہیں۔

مگر صاحب کبھی کبھی ہمیں اس زندگی کی یاد آتی ہے جو داڑھ کے درد سے پہلے تھی۔ کیسی ہنس مکھ اور ترو تازہ زندگی تھی۔ ہمارے گال کتنے سڈول تھے۔ ہمارا چہرہ کتنا متناسب تھا۔ نہ جانے ہمارا وہ چہرہ کہاں کھو گیا۔ اب تو صرف چہرہ کی تہمت اپنی گردن پر اٹھائے پھرتے ہیں۔ ع

خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

•••

دیوتاؤں کی کشمکش

معین اعجاز

اور پھر یوں ہوا کہ خدا کو دیوتاؤں پر بھروسہ نہ رہا۔ بڑے دیوتاؤں کی بیوروکریسی نے ایسا ماحول بنا رکھا تھا کہ روئے زمین پر وقوع پذیر ہونے والے حادثات اور واقعات کی پوری تفصیل دفترِ یزداں تک نہیں پہنچ پاتی تھی۔ اس صورتِ حال سے ایماندار قسم کے جونیئر دیوتا بہت بددل اور مایوس ہوئے۔ اور جب ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تو ان کے منتخب نمائندوں کا ایک ڈیلیگیشن خدا سے ملا۔ خدا نے ان کی باتیں ہمدردی اور غور سے سنیں۔ پھر جواب دیا ”اے وفادار جونیئر دیوتاؤں! ہم تمہارے جذبات کی قدر کرتے ہیں۔ اگر تمہاری ایمانداری یونہی برقرار رہی تو بہت جلد تم لوگوں کا پروموشن ہوگا اور بہت سے نااہل سینیئر دیوتا ریٹائر کر دیے جائیں گے۔ جاؤ اور ایک سلیکشن کمیٹی بناؤ۔ اس کمیٹی کا کام یہ ہوگا کہ وہ دنیا کے مختلف ممالک سے امیدوار بلوالے ان میں سے کچھ اچھے امیدوار منتخب کرے گی اور اس طرح اولادِ آدم پر مشتمل ایک ادارہ قائم کیا جائے گا جو روئے زمین پر ہمارے مفادات کی نگرانی کرے گا یعنی یہ انسان ہمیں دنیا کی صحیح صورتِ حال سے باخبر رکھیں گے“۔ یہ سن کر جونیئر دیوتاؤں کے چہرے چمک اٹھے اور انھوں نے

ایک فلک شگاف نعرہ بلند کیا:

پھر آناً فاناً سلیکشن کمیٹی بن گئی۔ دنیا سے مختلف رنگ و نسل کے لوگ آئے اور انٹرویو میں شریک ہوئے۔ اتفاق سے ہم ہندوستان کے اکلوتے امیدوار تھے۔ انٹرویو کا ماحول خاصا جانا پہچانا تھا۔ یعنی تمام کام انگریزی میں ہو رہے تھے۔ ہم نے اطمینان کا سانس لیا کہ اب تک اپنے ملک میں بھی ہم سب کچھ اپنے سابق آقاؤں کی زبان میں ہی کرتے رہے ہیں۔

جب ہماری باری آئی تو ہم نے اسمارٹ بننے کی کوشش کی اور مسکراتے ہوئے انٹرویو ہال میں داخل ہوئے۔ ہماری یہ مسکراہٹ دراصل 'ادب برائے ادب' کا ایک نمونہ تھی۔ پہلے ہم سے نام اور مذہب پوچھا گیا۔ پھر قومیت! جب ہم نے بتایا کہ ہم ہندوستانی ہیں، تو سلیکشن کمیٹی کے تمام دیوتا ایک ساتھ چونک پڑے۔ کچھ نے ایک دوسرے کے کان کے قریب سرگوشی کی۔ ہماری کس مپرسی قابل دید تھی۔ چچا غالب کا یہ مصرعہ بار بار ذہن میں آ رہا تھا ؎

یاالٰہی یہ ماجرا کیا ہے!

آخر ایک دیوتا نے مہر سکوت توڑتے ہوئے کہا: "اگر آپ ہندوستانی ہیں تو آپ نے یہاں آنے کی زحمت کیوں فرمائی؟"

"کیوں؟ کیا ہم ہندوستانی انسان نہیں ہیں؟ کیا ہمیں اشرف المخلوقات سے الگ کوئی مخلوق سمجھا جاتا ہے؟" ہم نے قدرے برہمی سے کہا کیونکہ دیوتا کا سوال تنک آمیز تھا۔

"جی نہیں، یہ بات نہیں" ایک دوسرے دیوتا نے کہا۔

"تو آپ حضرات چونکے کیوں؟" ہم نے سوال کیا۔ ہمارے اس سوال پر کمیٹی کے چیئر دیوتا نے کہا: "کیا یہ غلط ہے کہ آپ کا ملک ایک سیکولر ملک ہے؟"

"جی ہاں ہم ایک سیکولر ملک کے شہری ہیں۔ کوئی اعتراض ہے آپ کو؟" ہم نے ذرا کبیدہ ہو کر جواب دیا۔

یعنی آپ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ دستوری طور پر آپ کا ملک کوئی مذہبی ملک نہیں ہے؟"

"جی ہاں بجا فرمایا آپ نے ہمارا دستور مذہب کے معاملے میں ناوابستگی کا قائل ہے۔"

"ویری گڈ! تو پھر دستور کی قسم کھانے والے انسان پر کیوں کر بھروسہ کیا جا سکتا ہے

کہ وہ خدا کے مفادات کی نگرانی کر سکے گا؟" چیئر دیوتا نے یہ سوال کرتے ہوئے ہماری طرف فاتحانہ نظروں سے دیکھا۔ شاید وہ اس غلط فہمی کا شکار تھا کہ اس نے ہمیں لاجواب کر دیا لیکن ہم اتنی آسانی سے ہار ماننے والے نہ تھے ؏

یا اپنا گریباں چاک یا دامنِ یزداں چاک

ہم نے اس کے جواب میں اچھی خاصی تقریر شروع کر دی۔

"جناب! ایک مشہور مغربی مصنف کا قول ہے کہ نام میں کیا رکھا ہے' لہٰذا آپ ہمارے کام دیکھیے۔ جن ممالک میں دستوری طور پر مذہبی حکومتیں قائم ہیں وہاں ممکن ہے عوام پر مذہب کا گہرا اثر ہو لیکن ہماری سرزمین پر تو مذہب کی جڑیں اتنی گہرائی تک پھیلی ہوئی ہیں کہ انسان تو انسان زبانوں کا بھی مذہب ہوتا ہے۔ زبان کی بات بھی چھوڑیئے ہمارے یہاں تعلیمی ادارے اسپتال اور کھیل کے میدان بھی ہندو مسلمان ہوتے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ ادیبوں کا بھی مذہب ہوتا ہے۔ مذہبی بنیاد پر ادیبوں اور شاعروں کی انجمنیں بھی قائم ہو چکی ہیں ہم چیلنج کے ساتھ کہتے ہیں کہ ساری خدائی مذہبی وابستگی کی ایسی نادر مثال نہیں پیش کر سکتی آپ ریکارڈ اٹھا کر دیکھ سکتے ہیں کہ مذہب کے نام پر جتنے فرقہ وارانہ فسادات ہمارے ملک میں ہوتے ہیں اتنے کسی اور ملک میں نہیں ہوتے۔ ہماری قوم کے صبر و شکر اور خدا پرستی کا یہ عالم ہے کہ روٹی کپڑے اور مکان کے بغیر بھی گذارہ کر لیتی ہے۔ لیکن مذہب کا نام آتے ہی لوگ مارنے مرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔"

ہم نے محسوس کیا کہ ہماری اس ایکس ٹمپو تقریر سے کمیٹی کے دیوتا کافی متاثر ہوئے انٹرویو ہال میں کچھ دیر تک مکمل خاموشی چھائی رہی پھر ایک دیوتا نے کہا: "کیا یہ غلط ہے کہ آپ کے ملک میں سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی نے پرانی قدروں کے لیے مشکلات پیدا کر دی ہیں؟"

"جی نہیں! ہمارے ملک میں سائنس کی تیز رفتار ترقی بھی انتہائی بے ضرر اور غیر جانبدار رہی ہے یہ صحیح ہے کہ سائنس دانوں کی تعداد کے اعتبار سے ہندوستان دنیا کا تیسرا بڑا ملک ہے۔ دنیا کا دوسرا ٹسٹ ٹیوب بے بی ہمارے ملک کے ڈاکٹروں کے طفیل عالم وجود میں آیا۔ آریہ بھٹ' بھاسکر' روہنی اور ایپل کے تجربوں سے ساری دنیا واقف ہو چکی ہے۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود ہمارا بڑے سے بڑا سیکولر اور سوشلسٹ لیڈر اپنے سیاسی مستقبل کا حل معلوم کرنے کے لیے

جیوتشیوں، تانترکوں، اور ماہر روحانیت کا سہارا لیتا ہے عبادت گاہوں کا تقدس اب بھی برقرار ہے کہ وہاں اچھوتوں کو آسانی سے داخلہ نہیں ملتا۔ بعض طبقوں میں مذہبی پیشواؤں کی رضا کے بغیر نہ لڑکے لڑکیوں کی شادی ہوتی ہے اور نہ مُردوں کو دفن کرنے کا انتظام حیرت ہے کہ جس ملک میں یہ ساری باتیں موجود ہوں وہاں کے شہری کو آپ مشکوک سمجھ رہے ہیں......

ہماری تقریر کا سلسلہ ابھی جاری ہی تھا کہ چیئر دیوتا نے گھنٹی بجائی اور ہم سے مخاطب ہوکر بولا: مسٹر انڈین! آپ بہت اچھے مقرر ہیں۔ آپ کی ذہانت بھی قابل داد ہے۔ لیکن کچھ ضابطے اور قانون بھی ہوتے ہیں جنھیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور اس ضابطے کی رو سے آپ کو مسترد کیا جاتا ہے۔ شکریہ!"

ہم نے محسوس کیا کہ دیوتا کشمکش کا شکار ہو گئے ہیں۔ اور کسی اوپر کے دباؤ کے تحت ہمیں منتخب کرنے میں انھیں دشواری پیش آرہی ہے۔!

مذمت بطور پیشہ

معین اعجاز

پیشہ ورانہ مہارت کے اس دور میں ہر چیز کا ایک کاروباری اور پیشہ ورانہ پہلو بھی ہوتا ہوتا ہے۔ ہیر وکٹنگ اور حسن کاری سے لے کر علوم و فنون کے میدان تک۔ کوئی شعبہ حیات ایسا نہیں جہاں پیشہ ورانہ مہارات کی اہمیت اور افادیت سے انکار کیا جا سکے۔ اداکاری، آرٹ، تنقید، تقریر اور نعرہ بازی کے علاوہ مشاعرے اور سیمینار وغیرہ منعقد کرانے کا کام بھی اس قسم کی مہارت کا تقاضا کرتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہر شعبہ میں وہی لوگ کامیاب اور کامران ہوتے ہیں جو قدم قدم پر پیشہ ورانہ نقطہ نظر کو سامنے رکھتے ہیں۔

اب تو مدح سرائی اور مذمت کرنے کا فن بھی ایک پیشہ بن چکا ہے۔ اس پیشے سے تعلق رکھنے والے افراد بڑے اطمینان سے اپنی دال روٹی کا بندوبست کر لیتے ہیں کچھ لوگ تو ایسے بھی ہیں جنھوں نے شروع شروع میں یہ پیشہ بطور پارٹ ٹائم جاب اختیار کیا لیکن بعد ازاں یہی ان کی ترقیوں اور کامرانیوں کا بہت بڑا سہارا ثابت ہوا۔

یوں تو مدح سرائی اور مذمت کا کاروبار کرنے والے اگلے زمانے میں بھی ہوا کرتے تھے۔

بلکہ بادشاہوں اور نوابوں کے درباروں میں تو ایسے لوگ باقاعدہ بحال بھی کیے جاتے تھے لیکن زمانے کی نیرنگیوں کے ساتھ ساتھ اس فن کی تکنیک بھی بدل چکی ہے۔ اس جدید تکنیک میں پروپگنڈہ مشینری کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ آج کل جس انداز سے کسی کی تعریف و توصیف کی جاتی ہے۔ اس کا تصور اگلے زمانوں کے قصیدہ گو شعرا تک نہیں کر سکتے تھے۔ اسی طرح مذمت کرنے کا فن بھی بڑے عروج پر ہے۔

مدح سرائی اور مذمت کا پیشہ اختیار کرنے والے ہر جگہ اور ہر شعبے میں پائے جاتے ہیں۔ چاہے وہ سیاست کا دشت ہو یا ادب کا میدان، دفتر ہو یا یونیورسٹی ہر جگہ کچھ نہ کچھ ایسے لوگ ضرور ملتے ہیں جن کے ذمہ کسی کی تعریف یا مذمت کا کام ہوتا ہے۔ سب سے اچھا اور ماہر مداح وہ ہوتا ہے جو اپنے ممدوح میں ایسی ایسی خوبیاں تلاش کر لیتا ہے جن کے بارے میں خود ممدوح یا اس کے خاندان کے کسی فرد کو بھی کوئی علم نہیں ہوتا۔ اسی طرح کسی کی مذمت کرنے والے افراد مذموم اور معتوب میں ایسے ایسے عیوب کی نشان دہی کرتے ہیں کہ اس کے بدترین دشمن پر بھی بعض اوقات سکتہ طاری ہو جاتا ہے۔ سیاسی پارٹیوں اور تنظیموں کے علاوہ ادیبوں شاعروں اور نقادوں کے گرد بھی ایسے لوگ گدھ کی طرح منڈلاتے رہتے ہیں۔

ایک بار ایک نوزائدہ نقاد کو ایسے کچھ پیشہ ور مداحوں کی ضرورت پڑ گئی۔ نقاد مذکور نہ بگڑے ہوئے شاعر تھے اور نہ مرثیہ گو بلکہ انھوں نے تنقید کے خارزار میں براہ راست قدم رکھا تھا لیکن اب تک ان کی تنقیدیں زبانی جملوں تک محدود تھیں۔ بیچارے چائے خانوں اور کافی ہاؤسوں میں بیٹھ کر بڑی پابندی سے تمام شاعروں، ادیبوں اور نقادوں میں کیڑے نکالا کرتے تھے۔ ان کی زبانِ مبارک سے کسی ایسے اہلِ قلم کے لیے بھی کلمۂ خیر نہیں نکلا تھا جنھیں ادبی دنیا محترم اور معتبر گردانتی ہے۔ ہر بڑے فن کار کو چائے پی پی کر کوسنا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ جو بھی شاعر یا ادیب نشانہ بنتا اس کے ذکر کے ساتھ ساتھ وہ اس کے گھر کی خواتین کا ذکر بھی بلا امتیازِ عمر اور رشتہ کیا کرتے تھے۔ لیکن ان کی تمام تر خدمات کے باوجود موصوف کسی کی توجہ کا مرکز نہیں بن پائے تھے۔ پھر کچھ یوں ہوا کہ چند پیشہ ور مداحوں کو بھنک مل گئی اور انھوں نے ان کی خدمت میں حاضری دی۔ جب انھیں

اس بات کا علم ہوا کہ یہ حضرت بڑے کام کے آدمی ہیں اور ان کے ذمہ اتنا بڑا محکمہ ہے کہ وہ کچھ لوگوں کو ملازمت بھی دلوا سکتے ہیں تو انھوں نے ان کے گرد اپنی فن کاری اور پیشے کا حصار قائم کر دیا۔ ان کی ہر ہر بات پر "سبحان اللہ" کا نعرہ بلند کرتے اور ان کی بصیرت اور بلند نگاہی کی قسمیں کھاتے۔ اُدھر ان کی زبان سے کسی کے خلاف کوئی جملہ نکلنے والا ہوتا، اِدھر مداح داد و تحسین کا روح پرور سماں پیدا کر دیتے۔ ان مداحوں نے شہر بھر میں ان کی حمایت میں باقاعدہ مہم چلائی۔ اور انھیں ملک کا سب سے بڑا دانشور اور ناقد ثابت کرنے کے لیے پروپیگنڈہ مشینری کا بھرپور استعمال کیا۔ اخباروں میں ان کی شان میں خطوط شایع کرائے گئے۔ کچھ لوگوں نے انھیں مضامین شایع کرانے کا بھی مشورہ دیا۔ بلکہ ان کے لیے مضامین اور مواد بھی مہیا کیا۔ رسالے والوں کی خاطر مدارات میں انھوں نے کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا۔ لہٰذا جوابی خلوص کے طور پر مدیرانِ کرام بھی ان کے 'مضامین' نوٹ کے ساتھ شائع کرنے لگے۔ اس درمیان دو مداحوں نے ان کی کوششوں اور سفارشوں سے نہ صرف یہ کہ اچھی ملازمت حاصل کر لی بلکہ اپنے کچھ عزیزوں کو بھی چھوٹے موٹے کام اور پراجیکٹ دلوا دیے۔ کام دلوانے کی ان کی اس "اضافی" خوبی نے ان کی شخصیت میں چار چاند کے بجائے آٹھ چاند لگا دیے اور ان کے گرد اہلِ علم کا جمِ غفیر بڑھتا گیا۔

لیکن پیشہ بہر حال پیشہ ہوتا ہے۔ جن چالاک مداحوں نے ان کے طفیل عہدہ حاصل کیا تھا، وہ خود بھی اپنی شخصیت سے بے خبر نہیں تھے۔ لہٰذا جب انھوں نے دیکھا کہ ان کی مداحی خود ان کی شخصیت کو مجروح کر سکتی ہے تو انھوں نے چولا بدل لیا۔ اور اب ان سے زیادہ اثر و رسوخ رکھنے والی شخصیتوں کے گرد گھومنے لگے۔ یوں بھی اب ان کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔ ایک صاحب نے تو ایک جگہ یہاں تک کہہ دیا کہ "موصوف کیا بیچتے ہیں؟ یہ جو تھوڑا بہت مقام انھیں ملا ہے وہ میری کوششوں اور کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ بھلا انھیں ادبی دنیا میں کون جانتا تھا؟" قصہ مختصر جو لوگ کل تک ان کی صلاحیت اور دانش وری کا دم بھرتے تھے اب اچانک ان کی مذمت پر اتر آئے۔

مدح سرائی اور مذمت کا پیشہ خاصا نفع بخش ہے۔ آپ اپنے کسی معقول قسم کے ممدوح

کی تعریف اور اس کے دشمن کی تذلیل و تحقیر کر کے اپنے مستقبل کو آسانی سے سنوار سکتے ہیں۔ پس ممدوح کی نفسیات اور اس کے عزائم کا ذرا گہرائی سے مطالعہ کیجیے، انشاء اللہ کامیابی آپ کے قدم چومے گی۔ پیشہ ور مدّاح مختلف شہروں کے چائے خانوں میں نظر آتے ہیں جو مناسب حق محنت پر تعریف اور مذمت کا کام کرتے ہیں۔ اگر خدا نے کسی کو منصب اور عہدے سے سرفراز کیا ہے تو وہ اپنی ضرورت کے مطابق اُن کی خدمات حاصل کر سکتا ہے۔

ضمیمہ

ضمیمہ

ایک سمپوزیم

انشائیہ

شرکاء :۔ عبدالماجد دریا بادی، نیاز فتحپوری، اختر علی تلہری، سلامت اللہ خاں
ڈاکٹر محمد حسن، قمر رئیس اور احمد جمال پاشا۔

احمد جمال پاشا :۔ سب سے پہلے میں سب کے محترم عبدالماجد صاحب سے درخواست کروں گا
کہ وہ صنف انشائیہ کی امتیازی خصوصیات پر کچھ روشنی ڈالیں۔

عبدالماجد صاحب :۔ انشائیہ کی امتیازی خصوصیت، حسن انشا۔ یہ اس کے نام ہی سے ظاہر ہے۔
انشائیہ وہ ہے جس میں بجائے مغز و مضمون کے اصل توجہ حسن عبارت پر ہو۔

قمر رئیس : شاید انشائیہ کی مختصر ترین تعریف یہی ہو سکتی ہے لیکن کچھ وضاحت کے لیے یہ بھی فرمائیے
کہ آزاد، سر سید، حالی اور شبلی میں کون زیادہ کامیاب اور بہتر انشائیہ نگار ہے؟

عبدالماجد صاحب :۔ ان چاروں میں انشائیہ نگار صرف آزاد تھے۔ باقی تینوں بھی اپنی اپنی جگہ
پر اچھے لکھنے والے اور ماہر فن ادیب تھے لیکن انشا پردازی ان میں سے کسی کی مقصود اصلی نہ تھی۔

احمد جمال پاشا :۔ زحمت تو ہوگی ذرا یہ بھی بتا دیجیے کہ مہدی افادی کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

عبدالماجد صاحب :۔ وقت کے ماحول اور معیار کے لحاظ سے اچھے انشا پرداز تھے۔ عمر کم پائی۔
کچھ اور زندہ رہ جاتے تو کہیں بہتر نکلتے۔

قمر رئیس :۔ بات انشائیے سے انشا پردازی تک پہنچ رہی ہے، اگرچہ اس گفتگو کو میرا خیال ہے
کہ انشائیہ یا اسی تک ہی محدود رہنا چاہیے، اس لیے میں انگریزی ادب کے استاد اور اپنے
محترم سلامت صاحب سے استدعا کروں گا کہ وہ اس صنف ادب کے بارے میں اپنے
خیالات کا اظہار فرمائیں۔

سلامت صاحب :۔ معلوماتی یا تنقیدی مقالات کو لوگ اکثر ESSAY کہتے ہیں۔ انگریزی
کے مشہور رسالے ESSAY IN CRITICIZM کے نام نے بھی اسی غلط فہمی سے ترکیب
پایا ہے۔ پچھلے دس سال میں تو سائنس کے فنی TECHNICAL مضامین کو بھی ESSAY ہی کہا
جانے لگا ہے جو میرے خیال میں صحیح نہیں ہے۔ ایسے یا اسی قسم کے معلوماتی مضامین کو ہم
THESIS ARTICLE MONOGRAPH مقالہ، خطبہ، لکچر یا اور جو کچھ چاہیں کہہ سکتے
ہیں لیکن ان کو ESSAY کہنا موں تین MONTAIGNE کی روح کو صدمہ پہنچانا ہے۔

موں تین نے ۱۵۶۹ء میں اپنے والد کے انتقال کے بعد اپنے بارے میں لکھنا شروع
کیا اور ۱۵۸۰ء میں ان کے مضامین کا مجموعہ کتاب کی شکل میں ESSAY کے نام سے
شائع ہوا۔ اس نام کا انتخاب انکساری میں کیا گیا تھا جس کا مقصد یہ تھا کہ ان کی کتاب میں
کوئی منطقی بیان یا بحث نہیں ہے بلکہ خود ان کی زندگی کے ESSAI یا ذاتی تجربے ہیں۔
مروجہ انگریزی لفظ اسی فرانسیسی لفظ سے ماخوذ ہے اور موں تین اس صنف کے موجد مانے
جاتے ہیں۔ انھوں نے ESSAY کا جو معیار قائم کیا تھا اور اسے جو شکل اور ہیئت دی تھی۔
اس سے اب تک کسی نے انحراف نہیں کیا ہے اور نہ میرے خیال میں اس کی ضرورت ہی ہے
کیوں کہ ESSAY کا مقصد معلومات میں اضافہ کرنا یا تنقید کرنا نہیں ہے بلکہ اس کا مقصد
ذاتی تجربے، خیالات، یا کیفیتِ مزاج کا اظہار ہے۔ اس اظہار کے لیے انشا پرداز واقعات،
حکایات یا خود نوشت سوانح عمری کی مدد لیتا ہے۔ اور اکثر بڑی سادگی سے اعتراف بھی کرتا رہتا
ہے۔ انہی خیالات، اعترافات اور واقعات سے انشا پرداز کی شخصیت مرتب ہوتی ہے جو

ایسے کی جان ہے کیوں کہ شخصیت کا اظہار دراصل اس کی بصیرت اور دانائی کے اظہار کا دوسرا نام ہے۔

مونٹین تین شخصیت کے اظہار کو ایسے کا بہت اہم جز سمجھتے تھے اور ایسے کو خود کی لفظی تصویر (SELF-PORTRAIT) کے مترادف خیال کرتے تھے۔ اس بارے میں انھوں نے لکھا ہے:

MY BOOK IS DEVOTED TO THE PARTICULAR PURPOSE OF MY FRIENDS AND RELATIONS, THAT WHEN THEY HAVE LOST ME (WHICH THEY MUST DO BEFORE LONG). THEY MAY FIND IN IT SOME CHARATERSTIC TOUCHES OF MY TEMPERAMENTS AND MOOD MY WISH IS TO BE SEEN SIMPLY IN MY OWN FASHION, NATURE AND ORDINARY, UNSTUDIED AND WITH OUT ASTIFICE, FASE IT IS MYSELF THAT I AM PAINTING.

لیکن یہ بات مونٹین پر ہی موقوف نہیں ہے۔ انگریزی کے مشہور ناول نگار جوزف کونریڈ نے اپنی کتاب NOTES ON LIFE & LETTERS کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ ان کے ایسے ان کی شخصیت کو دیکھنے اور پرکھنے میں معاون ہوں گے اور ان کی کتاب

WITH DO SOMETHING TO HELP TOWARDS A LETTER VISION OF THE MAN, IF IT GIVES NO MORE THAN A PORTRAIT VIEW OF HIS BOOK, A LITTLE DUSTY, A LITTLE
AND RECEDING FROM THE WORLD .... AND THIS WAS THE CHANCE TO AFFORD ONE MORE VIEW OF IT EVEN TO MY OWN EYES.

ان باتوں سے ممکن ہے کہ آپ ایسے سے بدظن ہو جائیں کیوں کہ آج کل تو ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کا یہ قول نقادوں کا اوڑھنا بچھونا ہو گیا ہے کہ شاعری شخصیت کا اظہار نہیں بلکہ اس سے فرار ہے۔ میرے خیال میں یہ قول صحیح نہیں ہے اور کئی غلط مفروضوں پر مبنی ہے اور خاص کر خود ELIOT کی ادبی تخلیقات کی روشنی میں تو یہ بالکل غلط ہے۔ ان کی تمام اہم نظمیں ان کی شخصیت میں گرفتار ہیں اور کم از کم ASHWEDNESDY اور FOUR QUESTION کی PROTAGONIST یا ہیرو وہ خود ہیں۔ بہرحال بات یہ ہو رہی تھی کہ اگر آپ ادب میں شخصیت کے اظہار کو معیوب سمجھنے لگے ہیں یا اسے فنی خامی سمجھتے ہیں تو ممکن ہے کہ آپ ایسے کو اس لیے اہمیت نہ دیں کہ اس میں انشاپرداز کی شخصیت کا اظہار اس کا لازمی جز ہے۔ اور اگر آپ ایسا سمجھنے لگے ہیں تو یہ آپ کی محرومی ہے کیوں کہ انسانی شخصیت سے زیادہ رنگارنگ اور دلچسپ ادب میں بہت کم چیزیں ہوتی ہیں۔

ایسے کی باقاعدہ تعریف لکھنا ذرا مشکل ہے۔ فی زمانہ تو کوئی بات بھی اپنی پرانی جگہ پر قائم نہیں رہ گئی ہے۔ مثال کے طور پر آج کل افسانہ، ناول یا نظم تک کی ہم کوئی باقاعدہ ایسی تعریف نہیں کر سکتے جو ہر افسانے یا ناول یا نظم پر احاطہ کر سکے۔ ایسے کی تعریف تو خاص طور سے اس لیے مشکل ہے کہ اس کا کوئی موضوع نہیں ہے اور اکثر ایک موضوع محض بہانہ ہوتا ہے جس کی آڑ لے کر انشاپرداز دنیا زمانہ کے معاملات پر خیال آرائی کرتا ہے ؎

ذکر جب چھڑ گیا قیامت کا
بات پہنچی تری جوانی تک

میرا خیال ہے کہ یہ شعر ایسے کے مزاج کی بڑی صحیح ترجمانی کرتا ہے۔ بہرحال MAURICE HEWLETT نے جو کچھ اس بارے میں لکھا ہے میں اسے نقل کیے دیتا ہوں۔ یہ دوسری بات ہے کہ آپ اس سے متفق نہ ہوں۔

IF ONE HAD TO DEFINE AN ESSAY IT WOULD BE AS THE WRITTEN AFTER DINNER MONOTOQUE OF A WELL READ, WELL SATISFIED MAN OF ATLEAST FIVE AND PARTY YEARS DON'T MATTER. THE SPIRIT OF

YEARS MATTERS VERY MUCH YOU MUST BE MATURE ENOUGH TO PARTICIPATE AND WISE ENOUGH TO DO IT TACTFULLY

قمر رئیس :آپ کی اس گفتگو سے انشائیے کے بہت سے پہلو روشن ہو گئے لیکن کیا آپ یہ بتلانے کی تکلیف کریں گے کہ انگریزی ادب میں آپ کے خیال میں اس صنف کا بہترین نمائندہ کون ہے؟

سلامت صاحب :۔ اس صنف کا بہترین نمائندہ عام طور سے لوگ CHERLES LAMB کو سمجھتے ہیں۔ ان کے انشائیے DREAM CHILDREN کا شمار CLASSICS میں ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے بہت سے انشائیوں کو عالمگیر شہرت حاصل ہے اور اب بھی وہ بڑے ذوق وشوق سے پڑھے جاتے ہیں۔ میں خود ان کی تحریروں کا بے حد گرویدہ ہوں لیکن کسی ایک شخص کو اس صنف کا نمائندہ مان لینا بڑی سطحی بات معلوم ہوتی ہے۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ LAMB انیسویں صدی کے ایک ممتاز انشا پرداز تھے جس طرح BECON سترھویں اور GOLDSMITH اٹھارھویں صدی کے تھے۔ لیکن ان کے علاوہ اور بہت سے لوگ ہیں جنہیں کمتر سمجھنا بڑی غلطی ہوگی۔ مثال کے طور پر TYLOR یا ADDISON کو ہی لے لیجئے۔ بیسویں صدی کے انشا پردازوں میں جو نام اس وقت ذہن میں آتے ہیں وہ یہ ہیں۔

J.B. PRESTLFY, G.K. CHESTERTON,

H. BELLOCK BERTRAND RUSSELL, E.M. FORSTER, A.G. GARDENER

ROSEST LYMA MAURICE HEWLETT

ان تمام حضرات کے ایسے کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں اور ایسے سے دلچسپی رکھنے والے لوگوں کو ان کا مطالعہ کرنا چاہئے خصوصاً وہ لوگ جو اردو میں ایسے لکھنا چاہتے ہیں وہ ان لوگوں سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔

احمد جمال پاشا: میں علامہ اختر علی صاحب سے التماس کروں گا کہ وہ اس موضوع پر روشنی

ڈالیں۔ براہ کرم یہ بھی بتائیے کہ آپ انشائیے کو مقالات اور تنقیدی مضامین میں کس عنواں سے ممیز کریں گے؟

اختر علی صاحب :۔ انشائیہ اپنے محدود معنی میں اُس صنفِ ادب کو کہتے ہیں جو مکاتیب کی شکل میں ظہور پذیر ہوا لیکن یہاں اس کا وسیع مفہوم مراد ہے جس میں ادب کی وہ تمام اصناف داخل ہیں جن میں تخیل کا تخلیقی حُسن نمایاں ہو اس مفہوم کے لحاظ سے انشائیے تنقیدی مضامین سے یقیناً ممتاز ہے۔ تنقیدی مضامین کی بنیاد کسی شے کے حُسن و قبح کے پرکھنے پر ہوتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں حقیقت پسندی و حق نمائی تنقیدی مضامین کے پیش نظر رہتی ہے اور ظاہر ہے کہ کسی چیز کے حسن و قبح کا پرکھنا یا کسی چیز کی اچھائی اور برائی کا جاننا اس وقت ممکن نہیں جب تک کہ ذہن منطقیانہ انداز نظر میں منجھ نہ چکا ہو۔ فلسفیانہ حقائق کے مشاہدے کی نگاہ نہ پیدا کر لی ہو اور خصوصیات و امتیازات کے تحلیل و تجزیے کا ملکہ حاصل نہ کر لیا ہو۔ لیکن انشائیے کے لیے ان چیزوں کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کی حدیں اور تخلیقی ادب کی حدیں ایک ہیں۔ انشائیہ تخیل کی عمل فرمائیوں کا نتیجہ ہے اگر کوئی ذہن تخیل کا سرمایہ دار نہیں ہے تو اس سے کبھی کوئی "انشائیہ" جسے واقعی انشائیہ کہا جا سکے وجود میں نہیں آسکتا۔ اگر تنقیدی مضامین میں تخیل کی عشوہ کاریوں سے ہی کام رکھا جاتا ہے اور منطق و استدلال سے بے نیازی برتی جاتی ہے تو وہ مضامین حقیقتاً تنقیدی مضامین نہیں کہے جا سکتے۔ ایسے مضامین سطحی باتوں کے حامل ہوتے ہیں ان میں کوئی تنقیدی گہرائی نہیں ہوتی

اصل تو یہ ہے کہ تنقیدی مضامین اپنی خصوصیت کی وجہ سے فلسفے ہی کے قسم کی چیز قرار پا سکتے ہیں اس کے برخلاف انشائیے کو شعر کی منطقی تعریف کی بنیاد پر شعر کے حدود میں داخل کیا جا سکتا ہے۔

تنقیدی مضامین اور انشائیے کا یہی بنیادی فرق ہے جو مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتا ہے اسی وجہ سے ادب کی ان دونوں صنفوں کا لہجہ بھی ایک دوسرے سے مختلف رہتا ہے۔ تنقیدی مضامین کا لہجہ پُر وقار اور زیادہ سنجیدہ ہوتا ہے لیکن انشائیے کی یہ صورت نہیں ہوتی

علمی و فنی اصطلاحات سے گرانباری تنقیدی مضامین کے لیے باعثِ امتیاز ہوتی ہے لیکن انشائیے کے لیے ان اصطلاحات سے وابستگی اس کے حسن کے زوال کا پیش خیمہ بنتی ہے، تنقیدی مضامین کا لہجہ متین اور بھاری بھرکم ہوتا ہے لیکن انشائیے کے لہجے میں شیرینی کا وجود ضروری ہے۔ اُسے سبک ہونا چاہیئے۔ رواں ہونا چاہیے۔

مختصر لفظوں میں تنقیدی مضامین کے پیشِ نظر اشیائے زیر بحث کی نفس الامری حقیقتوں کا بقدر امکان انکشاف ہوتا ہے۔ لیکن انشائیے کا رُخ اس سمت نہیں ہوتا۔ اس کا مقصد تو یہ ہوتا ہے کہ وہ بعض واقعات یا مناظر کی تصویریں اچھے دل کش عنوان سے کھینچ دے یا انسانی نفوس میں طنز و مزاح یا تخیل کے راستے سے بعض اشخاص یا بعض اعمال سے نفرت جاگزیں کر دے یا ان کی طرف رغبت پیدا کر دے۔ میرے مذکورہ بالا خیالات "ہونا چاہیے" کے مرکز کے اردگرد گھوم رہے ہیں لیکن جہاں تک "ہوتا ہے" کی دنیا کا تعلق ہے اس میں ایک دوسرے کی حدوں میں دخل اندازی ہوتی رہتی ہے اور یہیں سے ان کے مفاہیم میں اشتباہ راہ پالیتا ہے۔

قمر رئیس:۔ یہ بھی فرمایئے کہ ایک صنف ادب کی حیثیت سے تاریخ ادب میں انشائیے کا کیا مقام ہے؟

اختر علی صاحب:۔ انشا کا ایک صنف ادب کی حیثیت سے ادبی تاریخ میں بہت بلند مقام ہے۔ اس سے روح کو انبساط حاصل ہوتا ہے۔ نفس کو کیف ملتا ہے اور پھر اس سے دوسرے فائدے بھی حاصل ہو سکتے ہیں۔ انشا کے لیے یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ کسی بڑے طولانی مضمون کا لباس ہی پہن کر سامنے آئے۔

انشائیے کی امتیازی خصوصیات پر ایک جملہ بھی مشتمل ہو سکتا ہے اور ذوق و فکر کے طرب و نشاط کا سامان بن کر مفید ہو سکتا ہے۔ ہر ادبی زبان میں اس قسم کے جواہر پارے ملیں گے۔ مثال کے طور پر ایک واقعہ کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

امیر نوح ابن منصور کے دربار میں اسکافی بڑے مرتبہ پر فائز تھا۔ نوح ابن منصور کا ایک مخالف "ماکان" نامی شخص تھا۔ اس نے نوح ابن منصور سے بغاوت کر کے بہت سے میدانی اور

پہاڑی علاقوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ منصور نے جب یہ دیکھا کہ "ماکان" کی بغاوت کی حدیں زیادہ پھیلتی چلی جا رہی ہیں تو اس نے "ماکان" کی سرکوبی کی ٹھان لی اور اپنے سپہ سالار تاش کو اس کام کے لیے نامزد کیا۔ اس کے مقابلہ میں جب "ماکان" مارا گیا تو اس خبر کو پہنچانے کے لیے ایک کبوتر بطور قاصد کے چنا گیا اور ایک جملہ میں اس پورے واقعہ کو سمونے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اسکافی کی انشائیہ نگاری اس وقت کام آئی۔ اس نے کاغذ کے ایک چھوٹے پرزے پر یہ جملہ لکھ دیا "اما ماکان فصار کاسمہ" یعنی "ماکان" اپنے نام کی طرح ہو گیا۔ دوسرے لفظوں میں مار ڈالا گیا۔

"ماکان" اس کا نام تھا لیکن عربی کے لحاظ سے "ما" نافیہ ہے۔ "کان" ماضی کا صیغہ جس کے معنی یہ ہوئے وہ نہیں تھا۔ اس لطیف و بلیغ پیرائے میں اس واقعہ کا ذکر کرنا انشائی اعجاز کا حیرت خیز کارنامہ ہے۔

احمد جمال پاشا:۔ کیا "نیرنگ خیال" کے مضامین کو انشائیہ کہا جا سکتا ہے۔ اُردو میں اس صنف کی روایات پر کچھ اظہار خیال فرمایئے۔

اختر علی صاحب:۔ مولانا محمد حسین آزاد کی تصنیف "نیرنگ خیال" کے مضامین "انشائیہ" کے تحت قطعی طور سے آتے ہیں۔ نیرنگ خیال کے مضامین کا انداز نگارش تمثیلی ہے۔ اسے بڑے پیمانے کی سلسلہ در سلسلہ تشبیہات کے تصورات کی زنجیر سمجھئے۔ تخیل کا یقیناً یہ ایک بڑا شاہکار ہے۔ اس میں بڑے بڑے اخلاقی مفاہیم جاندار پیکروں کی شکل میں چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ ان میں کہیں منطق نہیں ہے۔ کہیں استدلال نہیں ہے۔ کوئی علمی اصطلاح ان میں موجود نہیں ہے البتہ تخیل کا تموج ان کے ہر جملہ میں رنگ بھرتا چلا جا رہا ہے۔ اس سے جملہ مضامین کی فضا میں شادابی اور شگفتگی بھرپور طریقہ سے موجود ہو گئی ہے۔ انھیں پڑھ کر مسرت کا احساس ہوتا ہے۔ لذت محسوس ہوتی ہے ظاہر ہے قوت تخیل کے اس لطیف تصرف کے ایسے حسین نتیجے کو انشائیے کے دامن سے وابستہ نہیں کیا جائے گا تو کس صنف سے وابستہ کیا جائے گا۔ اسے بہرحال تنقیدی مضامین کے تحت تو درج کیا ہی نہیں جا سکتا

اُردو میں انشائیہ اگرچہ دوسری ترقی یافتہ زبانوں کی طرح ابھی نقطہ ارتقا پر نہیں پہنچ سکا ہے تاہم اب تک اس سلسلہ میں جو کچھ ہو سکا ہے وہ کم نہیں ہے۔